UNIVERSAL LIBRARY

OU_226578

UNIVERSAL LIBRARY

OUP—557—13-7-71—3,000.

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۲۹۷۵۱ ع ل

Accession No. U 2244

Author عبدالرشید نعمانی

Title لغات القرآن جلد ۳

This book should be returned on or before the date last marked below.

سلسلہ ندوۃ المصنفین

(۲۸)

مکمل

لغات القرآن

مع فہرست الفاظ

جلد سوم

تالیف

مولانا محمد عبد الرشید صاحب نعمانی

رفیق ندوۃ المصنفین

باہتمام مینیجر ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی

آزاد پریس کوچہ چیلان دہلی

سلسلۂ مطبوعات سنہ ۱۹۴۶ء

۱۴ ۷۹۶۳
۶ ۷
۱

بار اوّل ایک ہزار

طباعت اپریل سنہ ۴۸ء

قیمت غیر مجلد چار ۴ روپے۔ قیمت مجلد پانچ ۵ روپے

N
14. 2967
98 L

مطبوعہ آور پریس دہلی

65
CHECKED 1963

فہرست

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
		فصل الواؤ	۱۹
باب الدال المہملہ	۷	فصل الہاء	۲۱
فصل الالف	۷	فصل الیاء المثناۃ	۲۱
فصل الباء الموحدۃ	۱۱		
فصل الحاء المہملہ	۱۱	باب الذال المعجمہ	۲۳
فصل الخاء المعجمہ	۱۱	فصل الالف	۲۳
فصل الراء المہملہ	۱۳	فصل الباء الموحدۃ	۳۴
فصل السین المہملہ	۱۳	فصل الراء المہملہ	۳۴
فصل العین المہملہ	۱۴	فصل القاف	۳۶
فصل الفاء	۱۶	فصل الکاف	۳۶
فصل الکاف	۱۶	فصل اللام	۳۹
فصل اللام	۱۷	فصل المیم	۳۹
فصل المیم	۱۸	فصل النون المعجمہ	۳۹
فصل النون	۱۹	فصل الواو	۴۰

عنوان	صفحہ
فصل الهاء	۴۱
فصل الياء المثناة	۴۲
باب الراء المهملہ	۴۳
فصل الالف	۴۴
فصل الباء الموحدة	۵۱
فصل التاء المثناة	۶۲
فصل الجيم المعجمه	۶۲
فصل الحاء المهمله	۶۷
فصل الخاء المعجمه	۷۳
فصل الدال المهمله	۷۳
فصل الزاء المعجمه	۷۵
فصل السين المهمله	۷۶
فصل الشين المعجمه	۹۰
فصل الصاد المهمله	۹۱
فصل الضاد المعجمه	۹۲
فصل الطاء المهمله	۹۳
فصل العين المهمله	۹۳
فصل الغين المعجمه	۹۴
فصل الفاء	۹۵

عنوان	صفحہ
فصل القاف	۱۰۰
فصل الكاف	۱۰۶
فصل الميم	۱۰۷
فصل الواو	۱۰۸
فصل الهاء	۱۲۷
فصل الياء المثناة	۱۳۲
باب الزاء المعجمه	۱۳۹
فصل الالف	۱۳۹
فصل الباء الموحدة	۱۴۰
فصل الجيم الموحدة	۱۴۲
فصل الحاء المهمله	۱۴۳
فصل الخاء المعجمه	۱۴۳
فصل الدال المهمله	۱۴۴
فصل الراء المهمله ؎	۱۴۴
فصل العين المهمله	۱۴۵
فصل الفاء	۱۴۷
فصل القاف	۱۴۷
فصل الكاف	۱۴۷
فصل اللام	۱۵۰

؎ کتاب میں صفحہ ۱۴۴ پر بجائے "الراء المهمله" کے غلطی سے "الزاء المعجمه" طبع ہوگیا ہے۔

عنوان	صفحہ
فصل المیم	۱۵۲
فصل النون	۱۵۲
فصل الواؤ	۱۵۵
فصل الهاء	۱۵۷
فصل الیاء المثناة	۱۵۷
باب السین المهمله	۱۶۵
فصل الالف	۱۶۶
فصل الباء الموحده	۱۸۸
فصل التاء المثناة	۱۹۵
فصل الجیم المعجمه	۱۹۵
فصل الحاء المهمله	۲۰۳
فصل الخاء المعجمه	۲۱۰
فصل الدال المهمله	۲۱۲
فصل الراء المهمله	۲۱۵
فصل الطاء المهمله	۲۲۰
فصل العین المهمله	۲۲۰
فصل الفاء	۲۲۳
فصل القاف	۲۲۷
فصل الکاف	۲۳۲

عنوان	صفحہ
فصل اللام	۲۳۷
فصل المیم	۲۴۶
فصل النون	۲۵۳
فصل الواؤ	۲۵۸
فصل الهاء	۲۶۴
فصل الیاء المثناة	۲۷۴
باب الشین المعجمه	۲۸۱
فصل الالف	۲۸۱
فصل الباء الموحده	۲۸۵
فصل التاء المثناة	۲۸۵
فصل الجیم المعجمه	۲۸۵
فصل الحاء المهمله	۲۸۶
فصل الدال المهمله	۲۸۶
فصل الراء المهمله	۲۸۷
فصل الطاء المهمله	۲۹۷
فصل العین المهمله	۲۹۸
فصل الغین المعجمه	۳۰۶
فصل الفاء	۳۰۷
فصل القاف	۳۱۳

اس سے ایک جانور نکلے گا جو لوگوں سے باتیں کرے گا کہ اب قیامت نزدیک ہے اور نشان لگا کر سچے ایمانداروں اور چھپے منکروں کو ایک دوسرے سے ممتاز کر دے گا یہ مضمون احادیث صحیحہ میں وارد ہے پ۲/۴ پ۷/۱۰ پ۱۲/۱و۵ پ۱۴/۱۲و۱۴ پ۱۸/۱۲ پ۲۰/۲ پ۲۱/۲و۱۰ پ۲۲/۸و۱۷ پ۲۵/۴و۱۷

دَاحِضَةٌ باطل، گرنے والی، ڈھینے والی، دَحْضٌ سے جس کے معنی پھسلنے، ٹھوکر کھانے اور ڈگمگانے کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث پ۲۵/۴

دَاخِرُوْنَ ذلیل ہونے والے، عاجزی کرنیوالے دَخُوْرٌ سے جس کے معنی ذلیل و خوار ہونے کے ہیں۔ اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت رفع دَاخِرٌ واحد پ۱۴/۱۲ پ۲۴/۵

دَاخِرِيْنَ ذلیل، خوار دَاخِرٌ کی جمع بحالت نصب و جر، پ۲۰/۲ پ۲۴/۱۱

دَاخِلُوْنَ داخل ہونے والے، دُخُوْلٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت رفع دَاخِلٌ واحد (ملاحظہ ہو دُخُوْلٌ) پ۶/۸

دَاخِلِيْنَ داخل ہونے والے، دُخُوْلٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت نصب و جر پ۲۸/۲۰

دَارٌ گھر، دِيَارٌ جمع یہ لفظ مؤنث ہے اور کبھی مذکر ہو کر بھی استعمال ہوتا ہے گھر، شہر، دنیا سب کے لیے دَار کا استعمال ہوتا ہے پ۱/۱۱ پ۷/۱۰ پ۸/۱۴و۱۴ پ۹/۱۰و۱۱ پ۱۱/۸ پ۱۳/۶و۹و۱۲و۱۳و۱۷ پ۱۴/۱۰ پ۲۰/۷و۱۱و۱۴ پ۲۱/۴و۲۰ پ۲۲/۱۶ پ۲۳/۱۳ پ۲۴/۱۰و۱۱و۱۸ پ۲۸/۴

دَارِكُمْ تمہارا گھر، دَارِ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، پ۱۲/۶

دَارِهٖ اس کا گھر، دَارِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ۲۰/۱۱

دَارِهِمْ ان کا گھر دَارِ مضاف هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ پ۸/۱۷ پ۹/۱ پ۱۳/۱۰ پ۲۰/۱۶

دَاعِ بلانے والا، پکارنے والا، دعا کرنے والا دُعَاءٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر بحالت رفع و جر (ملاحظہ ہو دُعَاءٌ) پ۲/۷ پ۲۷/۸

دَاعِيَ بلانے والا، پکارنے والا، دُعَاءٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر بحالت نصب پ۱۶/۱ پ۲۶/۴

دَاعِيًا پ۲۲/۴

دَافِعٌ دفع کرنے والا، ٹالنے والا، ہٹانے والا دَفْعٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو دَفْعٌ) پ۲۷/۴ پ۲۹/۷

دَافِقٍ اچھلنے والا، دَفْقٌ سے جس کے معنی

اچھل کر بہنے کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ واحد
مذکر غائب، پ۳۰ ن۱۱

دَامَتْ وہ ٹھیری رہی (نَصَرَ ضَرَبَ) دَوَامٌ
جس کے معنی ٹھہرے رہنے اور ایک حالت
پر برقرار رہنے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد
مؤنث غائب مَادَامَتْ (جب تک رہے)
افعالِ ناقصہ میں سے ہے پ۱۲ ۹

دَامُوْا وہ ٹھیرے رہے، دَوَامٌ سے ماضی کا
صیغہ جمع مذکر غائب مَادَامُوْا (جب تک وہ
رہیں) افعالِ ناقصہ میں سے ہے پ۶ ۸

دَانٍ جھکنے والا، نزدیک، دُنُوٌّ سے جس کے
معنی قریب ہونے کے ہیں خواہ قربِ ذاتی
ہو یا قربِ حکمی، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر پ۲۷ ۱۲

دَانِيَةٌ، نزدیک، جھکنے والی، لٹکنے والی،
دُنُوٌّ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث۔
پ۲۹ ۱۸ ع ۱۹۵ ۲

دَاوٗد، داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام مشہور اور
جلیل القدر رسول ہیں جن پر "زبور" نازل ہوئی
تھی داؤد عجمی نام ہے اور علمیت و عجمہ کی بنا پر
غیر منصرف ہے، آپ ذریتِ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ
والسلام سے ہیں اور آپ کا شمار انبیاء بنی اسرائیل
میں ہے، حق تعالیٰ نے آپ کو دونوں نعمتوں سے
سرفراز فرمایا تھا کہ نبی و رسول بھی تھے اور بادشاہ
صاحب تاج و سریر بھی، اسی لئے قرآن مجید
میں آپ کو خلیفہ کہا گیا ہے اور یہ وہ لقب ہے
کہ تمام انبیاء و مرسلین میں بجز آپ کے اور
حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اور کسی
کو قرآن نے اس لقب سے یاد نہیں کیا، صحیح بخاری
میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے
کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا داؤد علیہ السلام
پر قرأت اس قدر آسان کردی گئی تھی کہ آپ اپنی
سواریوں کو زین کسنے کا حکم دیتے اور سواریوں
کے کسے جانے سے پہلے پڑھ کر فارغ ہو چکے تھے
اور اپنے ہاتھ کے کسب سے کھاتے تھے[1] قرأت
سے مراد اس حدیث میں زبور کی تلاوت ہے اتنی
جلدی زبور کا تمام کرنا حضرت داؤد علیہ السلام کا
معجزہ تھا اور باوجودیکہ بادشاہ تھے مگر اپنے کسب و
محنت سے کھاتے تھے نیز صحیح بخاری میں حضرت
عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہایت پیارا روزہ اللہ
کے نزدیک داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے کہ ایک
دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن نہ رکھتے تھے

[1] صحیح البخاری کتاب الانبیاء باب قول اللہ وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا۔

اور نہایت پیاری نماز اللہ کے نزدیک حضرت داؤد علیہ السلام کی نماز ہے کہ آدھی رات تک تو وہ سوتے تھے اور تہائی رات تہجد کی نماز پڑھتے تھے اور جب چھٹا حصہ رات کا باقی رہتا تھا تو پھر سو رہتے تھے[1] اور صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوموسیٰ تجھ کو داؤد علیہ السلام کی بانسریوں میں سے ایک بانسری دی گئی ہے[2] حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نہایت خوش آواز تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات سفر میں ان کو قرآن پڑھتے سنا۔ دوسرے روز یہ حدیث بیان فرمائی یعنی تیری آواز ایسی دلکش ہے گویا تیرا گلا بانسری ہے اور تیری آواز میں لحن داؤدی کا اثر ہے

واضح رہے کہ توراۃ اور اسرائیلی روایات میں حضرت داؤد علیہ السلام اور اوریا کی بیوی کا جو افسانہ مذکور ہے اور جس کو غلطی سے بعض غیر محتاط مفسرین نے بھی سورۂ ص کی تفسیر میں حضرت داؤد علیہ السلام کے ذکر میں نقل کر ڈالا ہے، محض کذب و افترا ہے علامہ داؤدی نے صاف طور پر تصریح کی ہے۔

ليس في قصة داود واوريا خبر يثبت[3]	داؤد اور اوریا کے قصہ میں کوئی روایت ثابت نہیں

اور قاضی عیاض فرماتے ہیں

اما قصة داود عليه السلام فلا يجب ان يلتفت الى ما سطره الاخباريون عن اهل الكتاب الذين بدلوا وغيروا ونقله بعض المفسرين ولم ينص الله على شيء من ذلك ولا ورد في حديث صحيح[4]	لیکن داؤد علیہ السلام کا قصہ سو ضروری نہیں کہ جو کچھ اخباریوں نے اہل کتاب سے جنہوں نے تبدیل اور تحریف کر ڈالی ہے تحریر کیا ہے اور بعض مفسرین نے اس کو نقل کر ڈالا ہے۔ اس کی طرف التفات کیا جائے حالانکہ نہ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں کچھ بتایا ہے اور نہ صحیح حدیث میں کچھ آیا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی پیغمبرانہ سیرت اور فضائل و خصائص کا مفصل تذکرہ قرآن مجید میں

[1] صحیح البخاری کتاب الانبیاء، باب احب الصلوٰۃ الی اللہ صلاۃ داؤد۔ [2] مشکوٰۃ باب جامع المناقب
[3] و [4] الشفا فی تعریف حقوق المصطفیٰ ص ۲۸۸ طبع صدیقی بریلی ۱۲۸۴ھ

جابجا اپنے اپنے موقع پر تفصیل سے مذکور ہے

پ۲/۱۴، پ۶/۳ و ۱۵، پ۷/۱۶، پ۱۵/۶، پ۱۷/۹، پ۱۹/۱۷، پ۲۲/۸، پ۲۳/۱۱ و ۱۲

دَائِبَیْنِ. پھرنے والے، ایک دستور پر چلنے والے، دَأْبٌ اور دَأَبٌ سے اسم فاعل کا صیغہ تثنیہ مذکر (ملاحظہ ہو دَأْبٌ) ۔ ۔ ۔ پ۱۳/۱۷

دَائِرَۃٌ. گردش، مصیبت، دَوْرٌ سے جس کے معنی پھرنے کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ واحد مونث دائرہ، خط محیط کو کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے اس کا استعمال گردش مصیبت اور چکر کے متعلق ہوتا ہے، پ۶/۱۲، پ۱۱/۱

دَائِمٌ ہمیشہ، جاوید، دَوَامٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو دَامَتْ) پ۱۳/۱۱

دَائِمُوْنَ. قائم ہمیشہ رہنے والے. دَائِم کی جمع، دَوَامٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، پ۲۹

فصل الباء الموحدة

دُبُرٌ. پشت، پیٹھ، پیچھا، پاخانہ کا مقام اَدْبَارٌ جمع. پ۱۲، پ۲۷

دُبُرَہٗ اس کی پیٹھ، اس کی پشت، دُبُرٌ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ۹/۱۶

فصل الحاء المهملة

دُحُوْرًا. بھگانا، ہانکنا، دھتکارنا، دور کرنا دَحَرَ یَدْحَرُ کا مصدر ہے. پ۲۳/۵

دَحٰھَا. اس کو ہموار کیا، اس کو بچھایا (نقص) دَحٰی دَحْوٌ سے جس کے معنی بچھانے اور ہموار کرنے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ھَا ضمیر واحد مونث غائب، پ۳۰

فصل الخاء المعجمة

دُخَانٌ. دھواں، اَدْخِنَۃٌ جمع، آیہ شریفہ فَارْتَقِبْ یَوْمَ تَاْتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیْنٍ (سو تو راہ دیکھ اس دن کی کہ آسمان کھلم کھلا دھواں لائے گا) میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ یہ دھواں عہد نبوی میں ظاہر ہو چکا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر صحابہ سے مروی ہے کہ ابھی وہ دھواں ظاہر نہیں ہوا بلکہ قیامت کے قریب ظاہر ہوگا[1] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فتح الباری ج ۸۔ ص ۔ ۴۴ تفسیر "حم الدخان"

قول اول کو اختیار فرمایا ہے چنانچہ فتح الرحمٰن
میں رقمطراز ہیں

مترجم گوید این وعدہ متحقق شد خدای تعالیٰ
در قریش قحط انداخت تا آنکہ شدت جوع یا از کثرت
الجزء جو دودے محسوس می شد و ایشاں بخدای تعالیٰ
رجوع کردند خدای تعالیٰ قحط را دور فرمود باز برکفر
اصرار کردند خدای تعالیٰ روز بدر از ایشاں انتقام
کشید کہ ہفتاد کس را از رؤسائے ایشاں کشت و ہفتاد
کس را اسیر ساخت واللہ اعلم (ص ۹۵۰ طبع فاروقی دہلی)

اور ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر صاحب
نے دوسرے قول کو لیا ہے چنانچہ موضح القرآن
میں فرماتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دھوئیں کا
مذکور ہے کہ اس وقت سمجھنا کام نہیں آتا۔ قیامت
میں یہ دھواں گھیر یگا نیک آدمی کو زکام سا ہوگا اور
بد کو سر میں چڑھیگا بیہوش ہوکر گر پڑے گا۔

۲۵/۱۴ ۲۴/۱۴

دَخَلَ وہ اندر آیا، وہ داخل ہوا، دُخُولٌ سے
ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو اُدْخُلْ)
۲/۱۲ ۱۲/۱۵ ۱۵/۱۴ ۳/۵ ۲۹/۱۰

دَخَلًا۔ بہانہ، دغا، فساد، دراندازی۔ دَخِلَ
یَدْخَلُ کا مصدر ہے، اصل میں اس ملاوٹ
کو جو فساد کے لئے ہو دَخَل کہتے ہیں، اسی لئے
قتادہ نے اس کی تفسیر خیانت سے کی ہے،
جیساکہ ابن ابی حاتمؒ نے ان سے روایت کیا ہے[1]
اور امام بخاریؒ فرماتے ہیں کل شئی لم یصح فہو
داخل[2] (جو چیز درست نہ ہو وہ دخل ہے) ۹۴/۱۴

دَخَلَتْ۔ وہ داخل ہوئی، دُخُولٌ سے
ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، ۹/۱۱

دَخَلْتَ۔ تو داخل ہوا، دُخُولٌ سے ماضی کا صیغہ
واحد مذکر حاضر، ۳۹/۱۸

دُخِلَتْ۔ وہ داخل کی گئی، وہ آگھسی دُخُولٌ
سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب ۱۴/۲۱

دَخَلْتُمْ۔ تم داخل ہوئے، تم نے صحبت کی،
دُخُولٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر دُخُولٌ
سے کبھی جماع کا کنایہ بھی ہوتا ہے، ۲۳/۴ ۲۳/۵

دَخَلْتُمُوْہُ۔ تم اس میں گھس پڑے۔ تم اس میں
داخل ہوگئے۔ اس میں واو اشباع کا ہے اور ہ
ضمیر واحد مذکر غائب ہے، ۶/۲۳

دَخَلُوْا۔ وہ داخل ہوئے۔ وہ چلے آئے،

[1] فتح الباری ج ۸ ص ۲۹۲ [2] صحیح بخاری تفسیر سورۂ نحل

دُخُوْلٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب ہے پ ۶/۱۴
پ ۱۳/۵و۴و۳و۲ پ ۱۴/۴ پ ۱۹/۱۸ پ ۲۳/۱۱ پ ۲۶/۱۹

دَخَلُوْهُ - وہ اس میں داخل ہوئے، وہ اس میں گھسے، اس میں ہُ ضمیر واحد مذکر غائب ہے۔ پ ۱۵/۱

دَخَلَهٗ - وہ اس میں داخل ہوا، وہ اس کے اندر آیا، دَخَلَ دُخُوْلٌ سے۔ ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، پ ۴/۱

فصل الراء المهملة

دِرَاسَتِهِمْ - ان کا پڑھنا، پڑھانا، ان کی تلاوت دِرَاسَةٌ دَرَسَ یَدْرُسُ کا مصدر ہے۔ جس کے معنی پڑھنے پڑھانے کے ہیں مضاف ہے ھِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۸

دَرَاهِمَ - پاؤنیاں - دِرْهَمٌ کی جمع - شاہ عبدالقادر صاحبؒ فرماتے ہیں درہم قریب ہے پاؤلی کے۔ پ ۱۳/۱۲

دَرَجٰتٌ - درجے، دَرَجَةٌ کی جمع، پ ۳/۱ پ ۸
پ ۵/۱۰ پ ۷/۱۴ پ ۸/۲و۷ پ ۹/۱۵ پ ۳/۱۳ پ ۵/۲ پ ۱۶/۱۲ پ ۲۴/۷
پ ۱۵/۲ پ ۲۶/۲ پ ۲۸/۲

دَرَجَةٌ - درجہ، مرتبہ، بلندی کے اعتبار سے جو مرتبہ ہوتا ہے اس کو درجہ بولتے ہیں پ ۲/۱۲ پ ۵/۲ پ ۱/۶ پ ۲۷/۱۴

دَرَسْتَ - تونے پڑھا، دَرْسٌ اور دِرَاسَةٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، پ ۸/۱۹

دَرَسُوْا - انھوں نے پڑھا۔ دَرْسٌ اور دِرَاسَةٌ سے۔ ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ ۹/۱۱

دَرْكٌ - طبقہ، درجہ، اصل میں دَرَكٌ مثل درجہ کے ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اونچے طبقہ کے لئے دَرَجَةٌ اور نیچے طبقہ کے لئے دَرْكٌ بولا جاتا ہے، نیز سمندر کے انتہائی قعر کو بھی دَرْكٌ کہتے ہیں، دَرَكَاتٌ جمع، پ ۵/۱۸

دَرَكًا - پالینا، آپکڑنا، دَرَكٌ کا استعمال دو معنی میں ہوتا ہے ایک تو اس رسی کے لئے جس کے ساتھ دوسری رسی اس غرض سے ملادی جاتی ہے کہ وہ پانی تک پہنچ جائے، دوسرے انسان کو جو کچھ خرابی کا نتیجہ پہنچے اس کو دَرَكٌ کہتے ہیں یہاں دوسرے معنی مراد ہیں، پ ۱۶/۱۲

دُرِّیٌّ - درخشندہ، چمکتا ہوا، اس میں ی نسبت کی ہے، دُرٌّ کی طرف منسوب ہے، جس کے معنی موتی کے ہیں یعنی موتی کی طرح چمکدار پ ۱۸/۱۱

فصل السين المهملة

دُسُرٌ - کیلیں، میخیں، دِسَارٌ کی جمع، پ ۲۷/۸

دَسّٰهَا۔ اس کو خاک میں ملایا، اس کو گاڑ دیا
دَسّٰی تَدْسِیَۃً سے جس کے معنی چھپانے اور
گمنام کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب
ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب۔ پ۳۰ ع۱۶

فصل العین المھملۃ

دَعْ۔ تو چھوڑ دے، وَدْعٌ سے جس کے معنی چھوڑنے
کے ہیں، امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر، پ۲۲ ع۳
دَعًّا۔ دھکیلنا، دھکے دینا۔ دَعَّ یَدُعُّ کا مصدر
ہے، پ۲۷ ع۳
دُعَآءٍ۔ پکار، دعا، بلانا، پکارنا، مانگنا، سوال کرنا
دَعَا یَدْعُوْا کا مصدر ہے۔ دعا اور ندا ہم معنی
ہیں۔ مگر ندا کبھی بغیر نام لئے بھی یا اور ایا کے
ساتھ ہوتی ہے اور دعا میں نام لیا جاتا ہے جیسے
یا فلاں، اور کبھی دعا کا استعمال ندا کی جگہ اور
ندا کا استعمال دعا کی جگہ بھی ہوتا ہے، ارشاد ہے
کَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً
وَّنِدَآءً (جیسے مثال ایک شخص کی کہ چلاتا ہے
ایک چیز کو جو سنتی نہیں مگر پکارنا اور چلانا) اور
کبھی دعا کا استعمال تسمیہ یعنی نام رکھنے اور نام
لینے کے معنی میں بھی ہوتا ہے جیسے لَا تَجْعَلُوْا
دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ
بَعْضًا (مت ٹھیراؤ رسول کا نام لینا آپس
میں جس طرح کہ ایک دوسرے کا نام لیتے ہو)
لوگ یا محمدؐ یا محمدؐ کہتے تھے۔ اس آیت میں آپ
کی تعظیم کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، اَدْعِیَۃٌ
جمع، پ۲ ع۵، پ۳ ع۱۲، پ۸ ع۸، پ۱۳ ع۸ و۱۸، پ۱۶ ع۶، پ۱۷ ع۴، پ۱۸ ع۵، پ۲۰ ع۲، پ۲۱ ع۸
پ۲۴ ع۱، پ۲۵ ع۳
دَعَا۔ اس نے پکارا، اس نے دعا کی، اس نے
مانگا، اس نے بلایا، دُعَآءٌ سے ماضی کا صیغہ
واحد مذکر غائب، پ۳ ع۱۲، پ۲۳ ع۱۵، پ۲۴ ع۱۹، پ۲۵ ع۱۴، پ۲۶ ع۸
دَعَاکُمْ۔ اس نے تم کو پکارا، اس نے تم کو بلایا
اس میں کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر ہے، پ۹ ع۱۷، پ۲۱ ع۶
دَعَانِ۔ اس نے مجھ کو پکارا، اس نے مجھ سے
دعا کی، اس میں نون وقایہ ہے اور ی ضمیر
واحد متکلم محذوف ہے، پ۲
دَعَانَا۔ اس نے ہم کو پکارا، اس نے ہم سے
دعا کی، اس میں نَا ضمیر جمع متکلم ہے، پ۱۱ ع۷، پ۲۴ ع۲
دَعَاهُ۔ اس نے اس کو پکارا، اس نے اس سے
دعا کی، اس میں هٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، پ۲۰
دُعَآئِكَ۔ تجھ سے دعا کرنا، تجھ کو پکارنا، تیری
دعا، تیری پکار، دُعَآءٌ مضاف كَ ضمیر

واحد مذکر حاضر مضاف الیہ، پ۱۴

دُعَاؤُکُمْ۔ دُعَاءُکُمْ۔ تمہاری التجا، تمہاری پکار، تمہارا پکارنا، دُعَآء مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، پ۱۹ پ۲۲

دُعَآءَ ہٗ اس کا دعا کرنا، اس کا مانگنا، دُعَآءَ مضاف، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ پ۱۵

دُعَائِہِمْ۔ ان کا دعا کرنا، ان کی پکار، دُعَآءِ مضاف ھِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، پ۲۶

دُعَآءِیْ۔ میری پکار، میرا بلانا، دُعَآءِ مضاف یْ ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، پ۲۹

دَعَوْا۔ انھوں نے پکارا، انھوں نے دعویٰ کیا، دُعَآءٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب۔ دَعَوْا اصل میں دَعَوُوْا تھا، واؤ متحرک ماقبل اس کا مفتوح اس لئے واؤ کو الف سے بدلا، اب الف اور واؤ دو ساکن جمع ہوئے اس لئے الف حذف ہوگیا اور دَعَوْا رہ گیا، پ۵ پ۶ پ۱۸ پ۲۰ پ۲۱

دَعَوَا۔ ان دونوں نے پکارا ان دونوں نے دعا کی، دُعَآءٌ سے ۔ ماضی کا صیغہ، تثنیہ مذکر غائب، پ۹

دَعَوُا۔ انھوں نے پکارا انھوں نے دعا کی دُعَآءٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب پ۸ پ۲۱

دُعُوْا۔ انھیں بلایا گیا۔ انھیں پکارا گیا۔ وہ بلائے گئے، وہ پکارے گئے، دُعَآءٌ سے، ماضی مجہول کا صیغہ، جمع مذکر غائب پ۳ پ۱۸

دَعَوْتُ۔ میں نے بلایا میں نے دعوت دی دُعَآءٌ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم پ۲۹

دَعْوَتَکَ۔ تیری پکار، یا بلاوا، تیرا پکارنا، دَعْوَۃٌ مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ (ملاحظہ ہو دَعْوَۃٌ) پ۴

دَعَوْتُکُمْ۔ میں نے تم کو بلایا، میں نے تم کو پکارا دَعَوْتُ صیغہ ماضی، اس میں کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر ہے۔ پ۱۳

دَعْوَتُکُمَا۔ تم دونوں کی دعا، دَعْوَۃٌ مضاف کُمَا ضمیر تثنیہ مذکر حاضر مضاف الیہ، پ۱۱

دَعَوْتُمُوْھُمْ۔ تم نے ان کو پکارا، تم نے ان کو دعوت دی، دَعَوْتُمْ دُعَآءٌ سے، ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، واؤ اشباع کا اور ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، پ۹

دَعَوْتُھُمْ۔ میں نے ان کو بلایا، میں نے ان کو

روشن اختر

پکارا دَعَوْتُ صیغہ ماضی هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب پ۲۹

دَعْوَةٌ دعا، پکار، پکارنا، بلاوا، دَعَا یَدْعُوْا مصدر ہے، جس طرح قَعْدَةٌ اور جَلْسَةٌ بیٹھک کے لئے آتے ہیں اسی طرح یہ بھی اصل میں حالتِ دعا کو بتاتا ہے پ۲ پ۱۳ پ۲۴

دَعَوْهُمْ انھوں نے اُن کو بلایا، انھوں نے اُن کو پکارا، دَعَوْا دُعَاءٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب

دَعْوٰهُمْ ان کی دعا، ان کا پکارنا، دَعْوٰی دَعَا یَدْعُوْا کا مصدر اور مضاف ہے هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، مضاف الیہ پ۸ پ۱۱ پ۲

دُعِیَ وہ پکارا گیا، دُعَاءٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب پ۲۴

دُعِیْتُمْ تم بلائے گئے، تم پکارے گئے دُعَاءٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر حاضر پ۲۲

فصل الفاء

دِفْءٌ جاڑے کی پوشاک، گرمی کا اسباب، جڑاول اِدْفَاءٌ جمع پ۱۴

دَفْعٌ دور کرنا، دفع کرنا، ہٹانا، دَفَعَ یَدْفَعُ کا مصدر ہے جب اس کا تعدیہ بذریعہ الیٰ ہوتا ہے تو اس کے معنی دینے اور حوالہ کرنے کے آتے ہیں جیسے فَادْفَعُوْا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (پس ان کو ان کے مال حوالہ کرو) اور جب عَنْ کے ذریعہ ہوتا ہے تو اس کے معنی دفع کرنے ہٹانے اور حمایت کرنے کے آتے ہیں جیسے وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ (اور اگر دفع نہ کروادے اللہ لوگوں کو ایک کو ایک سے) پ۲ پ۱۷

دَفَعْتُمْ تم نے حوالے کیا، تم نے دیدیا دَفْعٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر یہاں اس کا تعدیہ الیٰ کے ذریعہ ہوا ہے، پ۴

فصل الکاف

دَکًّا ریزہ ریزہ کرنا، ڈھاکر برابر کرنا، کوٹ کر ہموار کرنا دَکَّ یَدُکُّ کا مصدر ہے اصل میں دَکٌّ نرم اور ہموار زمین کو کہتے ہیں اور چونکہ نرم اور ہموار زمین ریزہ ریزہ ہوتی ہے اس لئے اسی مناسبت سے اس کے مصدر کے معنی مقرر ہوئے پ۹ پ۳۰

دَکَّاءَ ہموار، برابر، دَکَّاوَاتٌ جمع، پ۱۶

دُکَّتْ وہ توڑی گئی، وہ ریزہ ریزہ کی گئی۔ دَکٌّ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب ۳۰/۱۴

دُکَّتَا وہ دونوں توڑی گئی، وہ دونوں ریزہ ریزہ کی گئی، دَکٌّ سے ماضی مجہول کا صیغہ تثنیہ مؤنث غائب ۲۹/۵

دَکًّا توڑنا، ریزہ ریزہ کرنا، ڈھاکر ہموار کرنا، دَکَّ یَدُکُّ کا مصدر ہے، ۲۹/۵

فصل اللام

دُلُوْكِ سورج کا ڈھلنا، سورج کا غروب ہونا، امام بغوی لکھتے ہیں

"دلوك کے بارے میں اختلاف ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا" دلوک" کے معنی غروب کے ہیں، ابراہیم نخعی مقاتل بن حیان ضحاک اور سدی کا بھی یہی قول ہے اور عبد اللہ بن عباس، ابن عمر اور جابر رضی اللہ عنہم زوالِ آفتاب کے معنی بتاتے ہیں اور یہی عطا، قتادہ، مجاہد اور اکثر تابعین کا قول ہے اور لفظ کے معنی دونوں کو جامع ہیں کیونکہ اصل میں دُلُوْك مائل ہونے یعنی جھکنے کو کہتے ہیں اور آفتاب زوال کے وقت بھی جھکتا ہے اور غروب کے وقت بھی اور زوال پر اس کو محمل کرنا دونوں قولوں میں زیادہ اولیٰ ہے کیونکہ اس کے قائلین زیادہ ہیں، نیز جب ہم اس کو زوال پر محمول کریں گے تو آیت نماز کے تمام اوقات کی جامع ہوگی، پس "دُلُوْكِ الشَّمْسِ" ظہر اور عصر کو شامل ہے اور "اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ" مغرب و عشاء کو متناول ہے اور "قرآن الفجر" نماز صبح ہے"[۱] ۱۵/۹

دَلْوَهٗ اس کا ڈول، دَلْو معنی ڈول، مضاف ہے ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۱۲/۱۲

دَلّٰهُمْ اس نے ان کو جتایا، اس نے ان کو خبردار کیا، (نَصَرَ) دَلَّ دَلَالَةً سے جس کے معنی راہ بتانے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ہُمْ ضمیر جمع مذکر غائب۔ ۲۲/۸

دَلِيْلًا نشانی، رہنما، راہ بتلانے والا، دَلَالَةٌ سے بروزن فَعِيْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ بمعنی فاعل ہے، اَدِلَّةٌ جمع۔ ۱۹/۳

دَلّٰهُمَا ان دونوں کو ڈھلا لیا، ان دونوں کو نیچے ڈال دیا۔ ان دونوں کو کھینچ لیا، دَلّٰی تَدْلِيَةً سے جس کے معنی کسی کو حیلہ سے کام میں لگا دینے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب تَدْلِيَةً

[۱] معالم التنزیل ج ۳ ص ۱۸۱ طبع مصر برحاشیہ خازن۔

اِدلاءُ الدلو سے لیا گیا ہے جس کے معنے ڈول ڈالنے کے ہیں اور اسی مناسبت سے نیچے ڈال دینے اور کھینچ لینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، پ ۵

فصل المیم

دَمٌ لہو، خون، اصل میں دَمْیٌ تھا اور بعض دَمْوٌ بتاتے ہیں، لام کلمہ محذوف ہے، اور کبھی اس کو میم سے بدل کر میم کا میم میں ادغام کر دیتے ہیں، جیسے دَمٌّ پ ۲/۵، پ ۶/۵، پ ۹/۹، پ ۱۲/۱۲، پ ۱۴/۱۵ و ۲۱

دَمًا پ ۵

دِمَاءٌ لہو، خون، دَمٌ کی جمع، پ ۱

دِمَاءَكُمْ تمہارے لہو، تمہارے خون، دِمَاءَ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، پ ۱

دِمَاؤُهَا اس کے خون، ان کے لہو، دِمَاءٌ مضاف، هَا ضمیر واحد مؤنث غائب، مضاف الیہ، هَا کی ضمیر جمع کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے، پ ۱۷/۱۲

دُمْتُ میں ٹھیرا رہا، دَوَامٌ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم، مَادُمْتُ (جبتک میں رہا) افعالِ ناقصہ میں سے ہے، (ملاحظہ ہو دَامَتْ) پ ۷/۶، پ ۱۶/۵

دُمْتَ تو ٹھیرا رہا، دَوَامٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، مَادُمْتَ (جب تک تو رہا) افعالِ ناقصہ میں سے ہے، پ ۳/۱۴

دُمْتُمْ تم ٹھیرے رہے، دَوَامٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، مَادُمْتُمْ (جب تک تم رہے) افعالِ ناقصہ میں ہے، پ ۷/۲

دَمْدَمَ اس نے اُلٹ مارا، اس نے تباہی لاڈالی، اس نے ہلاکت ڈالدی، اس نے غصہ کیا، دَمْدَمَةٌ سے جس کے معنے ہلاک کرنے اور غصہ ہونے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ ۳۰/۱۴

دَمَّرَ اس نے اُکھیڑ مارا، اس نے ہلاکت ڈالدی، تَدْمِيْرٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، (ملاحظہ ہو تَدْمِيْرًا) پ ۲۶/۵

دَمَّرْنَا ہم نے خراب کردیا، ہم نے ہلاک کردیا، ہم نے اُکھیڑ مارا، تَدْمِيْرٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، پ ۹/۲، پ ۱۹/۱۳، پ ۲۳/۸

دَمَّرْنٰهَا ہم نے اس کو اکھیڑ مارا، ہم نے اس کو تباہ کرکے چھوڑ دیا، اس میں هَا ضمیر واحد

مؤنث غائب ہے، پ ۱۵/۴

دَمَّرْنٰهُمْ ہم نے ان کو اکھیڑ مارا، ہم نے ان کو ہلاک کر دیا، اس میں ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، پ ۱۹/۲ و ۱۹

دَمْعِ اشک، آنسو، دُمُوْعٌ اور اَدْمُعٌ جمع ہے، پ ۷/۱، پ ۱۰/۱۸

فصل النون

دَنٰی وہ نزدیک ہوا، وہ قریب ہوا (نصر) دُنُوٌّ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو دَانِ) پ ۲۷/۵

دُنْیَا عالم دنیا، بہت نزدیک، بہت ذلیل، دَانِیَۃٌ اور دَنِیَّۃٌ کا اسم تفضیل ہے اول صورت میں اس کے معنے بہت قریب اور بہت نزدیک کے اور دوسری صورت میں بہت ذلیل اور بہت حقیر کے ہیں، اس کی جمع دُنٰی ہے، جیسے کُبْرٰی کی جمع کُبَرٌ اور صُغْرٰی کی جمع صُغَرٌ ہے، جب دنیا کا استعمال اُخرٰۃ کے مقابلہ میں ہوتا ہے تو اس کے معنے اول اور پہلے کے آتے ہیں، اور جب قصوٰی کے مقابل ہوتا ہے تو زیادہ قریب کے آتے ہیں، پ ۱/۱۰ و ۱۳ و ۱۲، پ ۲/۹ و ۱۰ و ۱۱، پ ۳/۱۰ و ۱۱ و ۱۳ و ۱۴، پ ۴/۳ و ۶ و ۷ و ۱۰، پ ۵/۷ و ۸ و ۱۰ و ۱۳ و ۱۶، پ ۶/۹ و ۱۰، پ ۷/۹ و ۱۰ و ۱۴، پ ۸/۳ و ۱۱ و ۱۴، پ ۹/۹، پ ۱۰/۱ و ۵ و ۱۲ و ۱۳ و ۱۵ و ۱۶ و ۱۷، پ ۱۱/۶ و ۸ و ۱۲ و ۱۴ و ۱۵، پ ۱۲/۲ و ۵، پ ۱۳/۵ و ۹ و ۱۱ و ۱۳ و ۱۶، پ ۱۴/۱۰ و ۱۲ و ۲۰ و ۲۲، پ ۱۵/۱۶ و ۱۸، پ ۱۶/۴ و ۱۲ و ۱۶، پ ۱۷/۸ و ۹، پ ۱۸/۳ و ۸ و ۹ و ۱۰، پ ۲۰/۷ و ۹ و ۱۰ و ۱۱ و ۱۵، پ ۲۱/۳ و ۶ و ۱۱ و ۱۳ و ۲۰، پ ۲۲/۴ و ۱۳، پ ۲۳/۵ و ۱۶ و ۱۷، پ ۲۴/۱۰ و ۱۱ و ۱۶ و ۱۸، پ ۲۵/۴ و ۵ و ۹ و ۱۹ و ۲۰، پ ۲۶/۲ و ۸، پ ۲۷/۶ و ۱۹، پ ۲۸/۴، پ ۲۹/۱، پ ۳۰/۴ و ۱۲

فصل الواو

دَوَابِّ چلنے والے، جانور، چارپائے، کیڑے، دَابَّۃٌ کی جمع (ملاحظہ ہو دَابَّۃً) پ ۹/۱۷، پ ۱۰/۳، پ ۱۷/۹، پ ۲۲/۱۶

دَوَائِرَ گردشیں، مصائب، دَائِرَۃٌ کی جمع، (ملاحظہ ہو دَائِرَۃٌ) پ ۱۱/۲

دُوْلَۃً دست گرداں، جو چیز گردش کرتی رہے کبھی اس کے پاس اور کبھی اس کے پاس اس کا نام "دولت" ہے، پ ۲۸/۴

دُوْنِ ورے، سوائے، غیر، جو کسی سے نیچے ہو دُوْنَ کہلاتا ہے، بعض کا قول ہے کہ یہ دُنُوٌّ کا مقلوب ہے جس کے معنے نزدیک کے ہیں، امام سیوطی لکھتے ہیں،

"دُوْنَ ظرف ہو کر استعمال ہوتا ہے فوق کی نقیض ہے اور مذہب مشہور پر معرب نہیں ہوتا اور بعض کہتے ہیں کہ معرب ہوتا ہے، جیسے وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ دونوں طرح پڑھا گیا ہے پیش کے ساتھ بھی اور زیر کے .....

ساتھ بھی، اور اسم بھی واقع ہوتا ہے بمعنی غیر کے
جیسے اِتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً (اور لوگوں
نے پکڑے ہیں اس کے سوائے معبود) کہ دُوْنِهٖ
بمعنی غیر یعنی اس کے سوا ہے کے ہے، زمخشری
نے کہا ہے کہ غیرہ کے معنی کسی چیز کے ورے کے
ہیں اور حالت کا فرق بتانے کیلئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے،
جیسے زیدٌ دُوْنَ عمروٍ (زید عمرو سے نیچے ہے) یعنی شرافت
اور علم میں اس سے نیچے ہے، اور اس کے معنی میں وسعت
ہو کا ہے کہ اس کا استعمال حد سے بڑھنے کے لیے بھی کیا جاتا
ہے جیسے اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ (رفیق مسلمانوں
کو چھوڑ کر) یعنی مسلمانوں کی رفاقت سے کافروں
کی رفاقت کی طرف تجاوز نہ کرو۔" [۱]

پ ۱/۱۱۳و۱۲۳، پ ۲/۴، پ ۳/۱۱و۱۵و۱۹، پ ۵/۴و۱۵و۱۷و۱۸، پ ۶/۴و۱۴، پ ۷/۱۳و۱۶و۹
پ ۷/۴و۱۵و۱۹، پ ۸/۱۰و۱۱و۱۷، پ ۹/۱۱و۱۴، پ ۱۰/۸و۱۱، پ ۱۱/۳و۷و۹و۹
پ ۱۲/۱۲و۱۶، پ ۱۳/۲و۹و۱۰، پ ۱۴/۸و۱۶، پ ۱۵/۱۶، پ ۱۶/۶و۸، پ ۱۷/۵و۶و۹
پ ۱۷/۷و۹و۱۴و۱۷، پ ۱۸/۴و۱۷، پ ۱۹/۳و۹و۱۷و۱۸و۱۹، پ ۲۰/۱۱و۱۴و۱۶
پ ۲۱/۱۵و۱۸، پ ۲۲/۳و۹و۱۷، پ ۲۳/۴و۶و۷، پ ۲۴/۱و۲و۱۲و۱۳، پ ۲۵/۵و۶و۱۰و۱۱
پ ۲۵/۱۷، پ ۲۶/۱و۶و۱۲، پ ۲۷/۴و۷، پ ۲۸/۷و۱۱، پ ۲۹/۲و۱۰و۱۱

دُوْنِكَ تیرے سوا، تیرے بغیر، دُوْنِ مضاف، كَ ضمیر واحد
مذکر حاضر مضاف الیہ، پ ۱۴/۱۸، پ ۱۸/۷

دُوْنِكُمْ تمہارے سوائے، تمہارے غیر، دُوْنِ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، پ ۴/۳

دُوْنِنَا ہمارے سوائے، ہمارے غیر، دُوْنِ مضاف نا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، پ ۱۷/۷

دُوْنِهٖ اس کے سوائے، اس کے غیر، اس کے ورے، دُوْنِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ۔ پ ۵/۱۵، پ ۷/۱۲، پ ۸/۸، پ ۹/۱۴، پ ۱۲/۵و۱۵، پ ۱۳/۸
پ ۱۴/۱۱، پ ۱۵/۴و۶و۱۴و۱۹و۲۰، پ ۱۷/۲و۱۵، پ ۱۸/۱۶، پ ۲۰/۱۹، پ ۲۱/۲و۱۲و۱۴
پ ۲۲/۱۴، پ ۲۳/۱و۱۵و۱۶، پ ۲۴/۱و۲و۳و۷، پ ۲۵/۲و۱۳، پ ۲۶/۴، پ ۲۹/۱۲

دُوْنِهَا اس کے ورے، دُوْنِ مضاف هَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، پ ۱۶/۲

دُوْنِهِمْ ان کے سوائے، ان کے ورے، دُوْنِ مضاف، هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۱۰/۴، پ ۱۶/۵، پ ۲۰/۶، پ ۲۳/۱۱

دُوْنِهِمَا ان دونوں کے ورے، ان دو کے سوائے دُوْنِ مضاف، هِمَا ضمیر تثنیہ مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۱۶/۲، پ ۲۷/۱۳

دُوْنِيْ میرے سوا، میرے علاوہ، میرا غیر دُوْنِ مضاف، ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، پ ۱۵/۱و۱۹، پ ۱۶/۳

[۱] الاتقان ج ۱ ص ۱۶۲ و ۱۶۳ طبع مصر۔

فصل الهاء

دِهَاقًا بھرا ہوا، چھلکتا ہوا، دَھْقٌ سے جس کے معنی لبا لب پُر ہونے اور چھلکنے کے ہیں، اسم صفت ہے۔ ۳۰/۲

دِهَانِ تیل کی تلچھٹ، وہ تیل جس کی مالش کی جائے سرخ زمین، اَدْهِنَةٌ اور دُهُنٌ جمع اور بعض کا قول ہے کہ یہ دُهْنٌ کی جمع ہے جس کے معنی تیل کے ہیں، ۲۷/۲

دَهْرِ زمانہ اصل میں تو "دہر" عالم کے وجود میں آنے سے لے کر اس کے ختم ہونے تک کی مدت کا نام ہے اور پھر اس سے ہر بڑی مدت بھی مراد لے لی جاتی ہے۔ برخلاف زَمَانٌ کے کیونکہ وہ مدت قلیلہ اور مدت کثیرہ دونوں کے لیے آتا ہے۔ ۲۵/۱۹ ۲۹/۱۹

دُهْنِ تیل، چکنائی، اسم ہے۔ اَدْهَانٌ اور دِهَانٌ جمع۔ ۱۸/۱

فصل الیاء المثناة

دِيَارِ شہر، گھر، دَارٌ کی جمع۔ ۱۵/۱

دَيَّارًا بسنے والا، رہنے والا۔ دَارٌ سے یا دَوْرٌ سے جس کے معنی گھومنے کے ہیں فَيْعَالٌ کے وزن پر ہے فَعَّالٌ کے وزن پر نہیں ورنہ دَوَّارٌ ہوتا جیسے قَوَّالٌ اور جَوَّازٌ ہے ۲۹/۱۰

دِيَارِكُمْ تمہارے گھر، تمہارے شہر، تمہارے وطن، دِيَارِ مضاف، كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ۔ ۱/ب ۵/۵ ۲۸/۸

دِيَارِنَا ہمارے شہر، ہمارے گھر، ہمارے وطن، دِيَارِ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ ۲/۲

دِيَارِهِمْ ان کے گھر، ان کے وطن، دِيَارِ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ۔ ۲/۱۴ ۲/۱۱ ۱/۲ ۱/۶ ۱۳/۸،۶ ۱۴/۱۳ ۲۵/۱۹ ۲۸/۴

دِيْنِ جزا، اطاعت، شریعت، بدلہ دینا، اطاعت کرنا، حکم ماننا، دِيْنٌ بمعنی ملت ہی ہے۔ مگر اس کا استعمال اطاعت اور شریعت کی پابندی کے معنی میں ہوتا ہے دَانَ يَدِيْنُ کا مصدر ہے اَدْيَانٌ جمع ۱/۱۴ ۲/۸ ۲/۱۲،۳۲ ۳/۱۰،۱۲،۱۷ ۵/۴

۹/۱۹ ۱۰/۲،۶،۸،۹،۱۰،۱۱ ۱۱/۴،۵،۹،۱۶ ۱۲/۱۵ ۱۳/۳ ۱۴/۱۰،۱۲

۱۸/۱۷ ۱۸/۷ ۱۹/۹ ۲۱/۳،۶،۷،۸،۱۱،۱۷ ۲۳/۵،۱۴،۱۵ ۲۴/۱۵،۱۹

۲۴/۷،۱۳ ۲۵/۳،۴ ۲۵/۴ ۲۶/۱۲،۱۸ ۲۷/۱۵ ۲۸/۸،۹ ۲۹/۷،۱۴ ۳۰/۷،۹

۳۰/۲۴،۳۴،۳۲،۳۳،۳۴،۳۵

دِيْنًا ۳/۱۷ ۵/۱۵ ۶/۱۵ ۸/۷

دَیْنٌ دام، قرض، ادھار، قرض دینا، قرض لینا، دَانَ یَدِیْنُ کا مصدر ہے، دُیُوْنٌ جمع

پ ۳/۷ پ ۴/۱۳

دِیْنَارٌ دینار، اشرفی، ایک سونے کا سکہ جو عرب میں مستعمل تھا، دَنَانِیْرُ جمع، علامہ سیوطی نے "اتقان" میں لکھا ہے کہ "جوالیقی" وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ یہ فارسی ہے،[1] پ ۳/۱۶

دِیْنُکُمْ تمہارا دین، دِیْنُ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، پ ۲/۱۱ پ ۳/۱۶

پ ۴/۳ و ۵ و ۱۳ و ۱۴ پ ۸/۱۰ پ ۸/۲۴ پ ۱۴/۲۶ پ ۳۴/۳۰

دِیْنُہٗ اس کا دین، دِیْنِ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۲/۱۱ پ ۶/۱۲

دِیْنِہِمْ ان کا دین، دِیْنِ مضاف ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۳/۱۱ پ ۵/۱۸

پ ۷/۱۴ پ ۸/۳ و ۷ و ۱۲ پ ۱۰/۳ پ ۱۸/۹ و ۱۲ پ ۲۱/۷

دِیْنِیْ میرا دین، دِیْنِ مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، پ ۱۱/۱۶ پ ۲۳/۱۶

دِیَۃٌ خون بہا، دیت، اصل میں وَدَی یَدِیْ کا مصدر ہے، مقتول کے بدلہ میں جو خون بہا اتکیا جاتا ہے، اس کا نام دیۃ ہے، دِیَۃٌ اصل میں وَدْیٌ تھا، واو کو حذف کرکے آخر میں تا لائی گئی ہے، جیسا کہ عِدَّۃٌ میں ہوا ہے "دیت" میں سو اونٹ یا ایک ہزار دینار، یا دس ہزار درہم دینے پڑتے ہیں، حضرت شاہ عبد القادر صاحب موضح القرآن میں فرماتے ہیں

"خوں بہا مذہب حنفی میں مسلمان کے دو ہزار سات سو چالیس روپے ہیں تخمیناً اور دینے آتے ہیں قاتل کی برادری کو، تین برس میں بہ تفریق ادا کریں" پ ۵/۱۰

---

[1] اتقان ج ۱ ص ۱۴۹

باب الذال المعجمۃ

فصل الالف

ذَا یہ، جو، صاحب، (والا) پہلے معنے کے اعتبار سے اسم اشارہ ہے، قریب کے لئے استعمال ہوتا ہے اور جب اس پر ہا، تنبیہ داخل ہوتی ہے تو ھذا بولتے ہیں، مگر قرآن مجید میں بغیر ہا، تنبیہ کے صرف ذَا کا استعمال اسم اشارہ کے معنے میں نہیں ہوا ہے، دوسرے معنے کے اعتبار سے بمعنے اَلَّذِیْ ہے یا اس صورت میں ہوتا ہے کہ جب وہ بعد مَا استفہامیہ اور مَنْ استفہامیہ کے واقع ہو اور اشارہ کے لئے نہ ہو، اور تیسرے معنی کے اعتبار سے اسم ہے بمعنی صاحب کے، (ملاحظہ ہول الفاظ ذو، ماذا، من ذا اور ھذا) پ۲/۱۰و۱۱و۱۴ پ۳/۲ پ۴/۲ پ۵/۵ پ۶/۴و۵ پ۷/۴ پ۹/۴ پ۱۱/۹و۱۰و۱۵ پ۱۳/۳ پ۱۴/۹و۱۰ پ۱۵/۲ پ۱۶/۲ پ۱۸/۴ پ۱۹/۱۸ پ۲۰/۳و۱۰ پ۲۱/۷و۱۰و۱۳و۱۸ پ۲۲/۹و۱۵و۱۶ پ۲۳/۷و۱۱و۱۳ پ۲۶/۱و۹ پ۲۷/۱۸ پ۲۹/۳و۱۳و۱۵ پ۳۰/۱۵

ذَالْقَرْنَیْنِ ذوالقرنین، اس جلیل القدر صالح بادشاہ کا لقب ہے جس کا سورہ کہف میں مذکور ہے واضح رہے کہ قرآن مجید سیرت یا تاریخ کی کوئی کتاب نہیں ہے کہ وہ جس شخصیت کا ذکر کرے اسکے تمام حالات کا استقصا کرتا جائے، کیونکہ یہ چیز اس کے موضوع سے خارج ہے وہ جس شخص کا ذکر کرتا ہے اسکی زندگی کے اسی پہلو کو نمایاں کرتا ہے جو دوسروں کے لئے پند و موعظت اور عبرت و نصیحت کا سبق ہو، چنانچہ قریش نے جب یہود سے معلومات حاصل کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے "ذوالقرنین" کی نسبت سوال تو قرآن مجید نے اس کے جواب میں وہی انداز اختیار کیا جو صالحین کے تذکرہ میں اس کا عام انداز ہے اور وحی ربانی کے معجزانہ جواب کے سامنے سائلین کو مجال دم زدن نہ رہی، لیکن جاہلیت کبری کی اس نشاۃ

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ (کچھ نہیں پر جس بات کے سمجھنے پر قابو نہ پایا اسے جھٹلانے لگے) کا مکمل دور دورہ ہے۔ حال کے معترضینِ قرآن نے "ذوالقرنین" کی شخصیت کو سب سے زیادہ اپنے معاندانہ اعتراضات کا ہدف بنا لیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ "ذوالقرنین" کا کوئی تاریخی وجود نہیں، بلکہ ایک بے حقیقت افسانہ تھا جو عرب کے یہودیوں میں مشہور تھا، اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نعوذ باللہ خوش اعتقادی کی بنا پر حقیقت سمجھ کر اسے نقل کر ڈالا۔

بلاشبہ مفسرین کے اقوال اس کی شخصیت کے تعین میں سخت مضطرب ہیں، کوئی اس کو عرب بادشاہ سمجھ کر اذوائین میں سے قرار دیتا اور صعب نام بتاتا ہے۔ اور کوئی اسکندر مقدونی کو "ذوالقرنین" خیال کرتا ہے، سید احمد خاں نے ازالۃ الغین عن ذی القرنین میں اسے "چی وانگ ٹی" بانیِ دیوار چین بنانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان میں سے کوئی بات بھی قابلِ التفات نہیں ہے، لیکن بلا تحقیق کے معترضین کا اپنی علمی نارسائی کا اعتراف کرنے کی بجائے سرے سے اس کی شخصیت کا انکار کر بیٹھنا جہل مرکب کی کتنی شرمناک مثال ہے آج اکتشافات اثریہ نے جن سینکڑوں چھپی ہوئی حقیقتوں کو بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے، ان میں سے ایک "ذوالقرنین" کی بھی حقیقت ہے، مولانا ابوالکلام آزاد نے "ترجمان القرآن" میں اس بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ زمانہ حال کی نہایت قیمتی اسلامی تحقیقات میں سے ہے۔ ہم اسی کا اقتباس موصوف ہی کے الفاظ میں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"قرآن نے ذوالقرنین کی نسبت جو کچھ بیان کیا ہے اس پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے تو حسب ذیل امور سامنے آجاتے ہیں۔

اولاً جس شخصیت کی نسبت پوچھا گیا ہے وہ یہودیوں میں ذوالقرنین کے نام سے مشہور تھا یعنی ذوالقرنین کا لقب خود قرآن نے تجویز نہیں کیا ہے پوچھنے والوں کا مجوزہ ہے۔ کیونکہ فرمایا وَيَسْأَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ؛

ثانیاً اللہ نے اپنے فضل و کرم سے اسے حکمرانی عطا فرمائی تھی اور ہر طرح کا ساز و سامان جو ایک حکمراں کے لیے ہو سکتا تھا اس کے لیے فراہم ہو گیا تھا

ثانیاً اس کی بڑی مہمیں تین تھیں۔ پہلے مغربی ممالک فتح کیے پھر مشرقی۔ پھر ایک ایسے مقام تک فتح کرتا ہوا چلا گیا جہاں پہاڑی درّہ تھا، اور اس کی دوسری طرف سے یاجوج اور ماجوج آکر لوٹ مار مچایا کرتے تھے۔

رابعاً اس نے وہاں ایک نہایت محکم سدّ تعمیر کر دی اور یاجوج و ماجوج کی راہ بند ہو گئی۔

خامساً وہ ایک عادل حکمران تھا جب وہ مغرب کی طرف فتح کرتا ہوا دور تک چلا گیا تو ایک قوم ملی جس نے خیال کیا کہ دنیا کے تمام بادشاہوں کی طرح "ذوالقرنین" بھی ظلم و تشدد کرے گا۔ لیکن ذوالقرنین نے اعلان کیا کہ بے گناہوں کے لیے کوئی اندیشہ نہیں ہے جو لوگ نیک عملی کی راہ چلیں گے ان کے لیے ویسا ہی اجر بھی ہوگا۔ البتہ ڈرنا انہیں چاہیے جو جرم اور بدعملی کا ارتکاب کرتے ہیں۔

سادساً وہ خدا پرست اور راستباز انسان تھا اور آخرت کی زندگی پر یقین رکھتا تھا۔

سابعاً وہ نفس پرست بادشاہوں کی طرح طامع اور حریص نہ تھا، جب ایک قوم نے کہا یاجوج اور ماجوج ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں، آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک سدّ تعمیر کر دیں، ہم خراج دیں گے تو اس نے کہا مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہی میرے لیے بہتر ہے میں تمہارے خراج کا طامع نہیں، یعنی میں خراج کی طمع سے یہ کام نہیں کروں گا، اپنا فرض سمجھ کر انجام دوں گا۔

تاریخ قدیم کی جس شخصیت میں یہ تمام اوصاف پائے جائیں وہی ذوالقرنین ہو سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کون شخص تھا۔

سب سے پہلا حل طلب مسئلہ جو مفسرین کے سامنے آیا وہ اس کے لقب کا تھا۔ عربی میں بھی اور عبرانی میں بھی "قرن" کے معنی صاف سینگ کے ہیں، پس "ذوالقرنین" کا مطلب ہوا دو سینگوں والا لیکن چونکہ تاریخ میں کسی ایسے بادشاہ کا سراغ نہیں ملا جس کا ایسا لقب رہا ہو، اس لیے مجبوراً "قرن" کے معنی میں طرح طرح کے تکلفات کرنے پڑے۔ پھر چونکہ فتوحات کی وسعت اور مغرب و مشرق کی حکمرانی کے لحاظ سے سکندر مقدونی کی شخصیت سب سے زیادہ مشہور رہی ہے اس لیے متاخرین کی نظریں اسی کی طرف اٹھ گئیں۔ . . . . . . حالانکہ کسی اعتبار سے بھی قرآن کا "ذوالقرنین" سکندر مقدونی نہیں ہو سکتا، نہ تو وہ خدا پرست تھا، نہ عادل تھا، نہ

مفتوح قوموں کے لئے فیاض تھا اور نہ ہی اس نے کوئی سد بنائی،

بہر حال مفسرین "ذوالقرنین" کی شخصیت کا سراغ نہ لگا سکے، اگر "ذوالقرنین" کے مفہوم کا کوئی سراغ ملتا تھا تو وہ صرف دور کا ایک اشارہ تھا جو حضرت دانیال کی کتاب میں ملتا ہے یعنی ایک خواب جو انھوں نے بابل کی اسیری کے زمانے میں دیکھا تھا...... چنانچہ کتاب دانیال میں ہے۔

میں کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے کنارے ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ ہیں، دونوں سینگ اونچے تھے لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا اور بڑا دوسرے کے پیچھے تھا، میں نے دیکھا کہ پچھم، اتر اور دکھن کی طرف وہ سینگ مارتا ہے یہاں تک کہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا نہ رہ سکا اور وہ بہت بڑا ہو گیا میں یہ بات سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھوں پچھم کی طرف سے ایک بکرا آکے تمام روئے زمین پر پھر گیا اس بکرے کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک عجیب طرح کا سینگ تھا وہ دو سینگ والے مینڈھے کے پاس آیا اور اس پر غضب سے بھڑکا اور اس کے دونوں سینگ توڑ ڈالے اور مینڈھے کی قوت نہ تھی کہ اس کا مقابلہ کرے" (دانیال ۸:۱۰) پھر اس کے بعد ہے کہ جبریل نمایاں ہوا اور اس نے خواب کی یہ تعبیر بتلائی کہ دو سینگوں والا مینڈھا مادہ اور فارس کی پادشاہت ہے اور بال والا بکرا یونان کی جو بڑا سینگ اس کی آنکھوں کے درمیان دکھائی دیا ہے وہ اس کا پہلا بادشاہ ہوگا (۸ : ۱۵)

اس بیان سے معلوم ہوا کہ مادہ (میڈیا) اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دی گئی تھی اور چونکہ یہ دونوں مملکتیں مل کر ایک شہنشاہی بننے والی تھیں، اس لئے شہنشاہی مادہ و فارس کو دو سینگوں والے مینڈھے کی شکل میں ظاہر کیا گیا پھر اس مینڈھے کو جس نے شکست دی وہ یونان کے بکرے کا پہلا سینگ تھا یعنی سکندر مقدونی تھا، جس نے فارس پر حملہ کیا اور کیانی شہنشاہی کا خاتمہ ہو گیا،

اس خواب میں بنی اسرائیل کیلئے بشارت یہ تھی کہ انکی آزادی و خوشحالی کا نیا دور اسی دو سینگوں والی شہنشاہی کے ظہور سے وابستہ تھا یعنی شہنشاہ [illegible] بابل پر حملہ کرکے فتحمند ہونے والا تھا اور پھر اسی کے ذریعہ بیت المقدس کی از سر نو تعمیر اور یہودی قومیت

کی دوبارہ شیرازہ بندی ہونے والی تھی چنانچہ چند برسوں کے بعد سائرس[1] کا ظہور ہوا اس نے میڈیا اور پارس کی مملکتیں ملا کر ایک عظیم الشان شہنشاہی قایم کردی اور پھر بابل پے در پے حملے کرکے اسے مسخر کرلیا،

چونکہ اس خواب میں میڈیا اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دی گئی تھی اس لئے خیال ہوتا تھا کہ عجب نہیں فارس کے شہنشاہ کے لئے یہودیوں میں "ذوالقرنین" کا تخیل پیدا ہوگیا ہو یعنی دو سینگوں والی شہنشاہی اور وہ اسے اس لقب سے پکارتے ہوں تاہم یہ محض ایک قیاس تھا اس کی تائید میں کوئی تاریخی شہادت موجود نہ تھی۔

لیکن ۱۸۳۸ء کے ایک انکشاف نے جس کے نتائج بہت عرصہ کے بعد منظر عام پر آئے اس قیاس کو ایک تاریخی حقیقت ثابت کردیا اور معلوم ہوگیا کہ فی الحقیقت شہنشاہ سائرس کا لقب ذوالقرنین تھا، اور یہ محض یہودیوں کا کوئی مذہبی تخیل نہ تھا بلکہ خود سائرس کا یا باشندگان فارس کا مجوزہ اور پسندیدہ نام تھا،

اس انکشاف نے ظن و تخمین کے تمام پردے اٹھادیے یہ خود سائرس ایک سنگی تمثال ہے جو اصطخر کے کھنڈروں میں دستیاب ہوا اس میں سائرس کا جسم اس طرح دکھایا گیا ہے کہ اسکے دونوں طرف عقاب کی طرح پر نکلے ہوئے ہیں اور سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں اور خط میخی میں جو کتبہ کندہ تھا اس کا بڑا حصہ ٹوٹ کر ضائع ہوچکا ہے، مگر جس قدر باقی ہے وہ اسکے لئے کافی ہے کہ تمثال کی شخصیت واضح ہوجائے اس سے معلوم ہوگیا کہ مادہ اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دینے کا تخیل ایک مقبول اور عام تخیل تھا اور یقیناً سائرس کو ذوالقرنین کے لقب سے پکارا جاتا تھا، تمثال میں پروں کا ہونا اس کے ملکوتی صفات و فضائل کیطرف اشارہ ہے کیونکہ نہ صرف پارسیوں نہیں بلکہ تمام معاصر قوموں میں یہ اعتقاد عام طور پر پیدا ہوگیا تھا کہ وہ ایک غیر معمولی نوعیت کا انسان ہے ......

[1] یاد رکھنا چاہیئے کہ شاہان فارس کے ناموں نے مختلف زبانوں میں مختلف صورتیں اختیار کرلی ہیں اور اس کی وجہ سے مورخوں نے سخت غلطیاں کی ہیں سائرس کا اصلی نام گورویا گورش تھا جیسا کہ دارا کے کتبہ بے ستون سے معلوم ہوتا ہے، لیکن یونانی اسے سائرس کہنے لگے اور یہودیوں نے اس کا تلفظ خورس کی شکل میں کیا، چنانچہ یسعیاہ، ارمیاہ، اور دانیال کے صحائف میں جابجا یہ نام آیا ہے اور یہی گورش ہے جس نے عربی میں خسرو کی شکل اختیار کرلی چنانچہ عرب مورخ اسے کیخسرو کے نام سے پکارتے ہیں۔

.... اب غور کرو قرآن کی تصریحات نے جو جامہ طیار کیا ہے وہ کس طرح ٹھیک ٹھیک سائرس ہی کے جسم پر راست آتا ہے؟ ہم نے اس بحث کے آغاز میں تصریحاتِ قرآنی کا خلاصہ دیدیا ہے جو سات دفعات پر مشتمل ہیں ان پر پھر ایک نظر ڈال لو۔

سب سے پہلے اس بات پر غور کرو کہ ذوالقرنین کی نسبت سوال بالاتفاق یہودیوں کی جانب سے ہوا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی غیر یہودی بادشاہ کی شخصیت یہودیوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھی تو وہ صرف سائرس ہی کی تھی، نبیوں کی پیشین گوئیوں کا مصداق، دانیال نبی کے خواب کا ظہور، رحمتِ الٰہی کی واپسی کی بشارت، بنی اسرائیل کا نجات دہندہ، خدا کا فرستادہ چرواہا اور مسیح، یروشلم کی تعمیر ثانی کا وسیلہ، پس اس سے زیادہ قدرتی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسی کی نسبت ان کا سوال ہو .... علاوہ بریں سائرس کے تمثال کے انکشاف نے قطعی طور پر یہ بات آشکارا کر دی ہے کہ اس کے سر پر دو سینگوں کا تاج رکھا گیا تھا اور یہ فارس اور مادہ کی مملکتوں کے اجتماع اور اتحاد کی علامت تھی۔

اس کے بعد قرآن کی تصریحات سامنے لاؤ۔ سب سے پہلا وصف جو اس کا بیان کیا ہے یہ ہے کہ اِنَّا مَکَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ہم نے اسے زمین میں قدرت دی تھی اور ہر طرح کا ساز و سامان مہیا کر دیا، قرآن جب کبھی انسان کی کسی کامرانی و خوشحالی کو براہِ راست خدا کی طرف منسوب کر کے کہتا ہے جیسا کہ یہاں کہا ہے تو اس سے مقصود عموماً کوئی ایسی بات ہوتی ہے جو عام حالات کے خلاف محض اس کے فضل و کرم سے ظہور میں آئی ہو۔ .....

...... پس ضروری ہے کہ ذوالقرنین کو حکمرانی کا مقام ایسے ہی حالات میں ملا ہو جو بالکل غیر معمولی قسم کے ہوں اور انہیں محض توفیقِ الٰہی کی کرشمہ سازی سمجھا جا سکے کیونکہ اس نے تمکن فی الارض کو براہِ راست خدا کی طرف نسبت دی ہے۔

لیکن اس اعتبار سے سائرس کی زندگی ٹھیک ٹھیک اس آیت کی تصویر ہے۔ اس کی ابتدائی زندگی ایسے حالات میں بسر ہوئی جنہیں حیرت انگیز حوادث نے ایک افسانہ کی شکل دیدی ہے۔ قبل اس کے کہ پیدا ہو خود اس کا نانا اس کی موت کا خواہش مند ہو گیا تھا، ایک وفادار آدمی اس کی زندگی بچاتا ہے اور وہ شاہی خاندان سے بالکل الگ ہو کر

ایک گمنام گڈریے کی طرح پہاڑوں میں زندگی بسر کرتا ہے پھر ناگہاں نمایاں ہوتا ہے اور بغیر کسی جنگ مقابلہ کے میڈیا کا تخت اس کے لیے خالی ہو جاتا ہے یقیناً یہ صورتِ حال واقعات و حوادث کی عام رفتار نہیں ہے جو ہمیشہ پیش آتی ہو، نوادرِ ہستی کی ایک غیر معمولی عجائب آفرینی ہے اور صاف نظر آرہا ہے کہ قدرت کا مخفی ہاتھ کسی خاص مقصد سے ایک خاص ہستی طیار کر رہا ہے اور زمانہ کی عام رفتار تھم گئی ہے تاکہ اس کی راہ صاف ہو جائے۔

اس کے بعد اس کی تین مہموں کا ذکر آتا ہے

ایک مغرب الشمس کی طرف یعنی پچھم کی طرف،

ایک مطلع الشمس کی طرف یعنی پورب کی طرف

تیسری ایک ایسے مقام پر جہاں کوئی وحشی قوم آباد تھی اور یاجوج اور ماجوج وہاں آکر لوٹ مار مچایا کرتے تھے اب دیکھو یہ تمام تفصیلات کس طرح ٹھیک ٹھیک سائرس کی فتوحات پر منطبق ہوتی ہیں؟

سائرس نے ابھی فارس اور میڈیا کا تاج سر پر رکھا ہی تھا کہ ایشیائے کوچک کے بادشاہ کروسس نے حملہ کر دیا........ اب سائرس مجبور ہو گیا کہ بلا توقف اس حملہ کا مقابلہ کرے وہ میڈیا کے دار الحکومت ہگ متانہ سے جو اب ہمدان کے نام سے پکارا جاتا ہے نکلا اور اس تیزی کے ساتھ بڑھا کہ صرف دو جنگوں کے بعد جو پٹیریا اور سارڈیس کے قریب واقع ہوئی تھیں، لیڈیا کے تمام مملکت پر قابض ہو گیا........ اب تمام ایشیائے کوچک بحر شام سے بحر اسود تک اس کے زیر نگیں تھا، وہ برابر بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ مغربی ساحل پر پہنچ گیا..........

... یہ لشکر کشی جو اسے پیش آئی صریح مغرب کی لشکر کشی تھی کیونکہ وہ ایران سے مغرب کی طرف چلا اور خشکی کے مغربی کنارہ تک پہنچ گیا۔ یہ اس کے لیے مغرب الشمس کی آخری حد تھی۔

ایشیائے کوچک کا مغربی ساحل نقشہ میں نکالو تم دیکھو گے کہ تمام ساحل اس طرح کا واقع ہوا ہے کہ چھوٹے چھوٹے خلیج پیدا ہو گئے ہیں، اور سمرنا کے قریب اس طرح کے جزیرے نکل آئے ہیں جنہوں نے ساحل کو ایک جھیل یا حوض کی شکل دیدی ہے، لیڈیا کا دار الحکومت سارڈیس مغربی ساحل کے قریب تھا اور اس کا محل موجودہ سمرنا سے بہت زیادہ فاصلہ پر نہ تھا، پس جب سائرس، سارڈیس کی تسخیر کے بعد آگے بڑھا ہوگا تو یقیناً بحر ایجین کے اسی ساحلی مقام پر

پہنچا ہوگا، جو سمرنا کے قریب جوار میں واقع ہے یہاں
اس نے دیکھا ہوگا کہ سمندر نے ایک جھیل کی سی
شکل اختیار کر لی ہے، ساحل کی کیچڑ سے پانی گدلا
ہو رہا ہے اور شام کے وقت اسی میں سورج ڈوبتا
دکھائی دیتا ہے، اسی صورت حال کو قرآن نے ان
لفظوں میں بیان کیا ہے کہ وَجَدَھَا تَغْرُبُ فِی
عَیْنٍ حَمِئَۃٍ اسے ایسا دکھائی دیا کہ سورج ایک
گدلے حوض میں ڈوب رہا ہے،۔۔۔۔۔۔
۔۔۔ دوسری لشکر کشی مشرق کی طرف تھی چنانچہ
ہیروڈوٹس اور ستیساز دونوں اس کی مشرقی لشکر
کشی کا ذکر کرتے ہیں جو لیڈیا کی فتح کے بعد اور بابل
کی فتح سے پہلے پیش آئی تھی اور دونوں نے تصریح
کی ہے کہ "مشرق کے بعض وحشی اور صحرا نشین قبائل
کی سرکشی اس کا باعث ہوئی تھی، یہ ٹھیک ٹھیک
قرآن کے اس اشارہ کی تصدیق ہے کہ حتی اذا بلغ
مطلع الشمس وجدھا تطلع علی قوم لم نجعل لھم
من دونھا سترا جب وہ مشرق کی طرف پہنچا تو
اسے ایسی قوم ملی جو سورج کے لئے کوئی آڑ نہیں رکھتی
یعنی خانہ بدوش قبائل تھے،
یہ خانہ بدوش قبائل کون تھے؟ ان مورخین کی تصریح
کے مطابق بکٹریا یعنی بلخ کے علاقہ کے قبائل تھے
نقشہ پر اگر نظر ڈالو گے تو صاف نظر آ جائیگا کہ بکٹریا
ٹھیک ٹھیک ایران کے لئے مشرق اقصےٰ کا حکم
رکھتا ہے، کیونکہ اس کے آگے پہاڑ ہیں اور انھوں
نے راہ روک دی ہے، ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

تیسری لشکر کشی اس نے ایسے علاقے تک کی
جہاں یاجوج اور ماجوج کے حملے ہوا کرتے تھے یہ
یقیناً اس کی شمالی مہم تھی جس میں وہ بحر خزر (کاسپین)
کو دہنی طرف چھوڑتا ہوا کاکیشیا کے سلسلۂ کوہ تک
پہنچ گیا تھا، اور وہاں اسے ایک درہ ملا تھا جو دو
پہاڑی دیواروں کے درمیان تھا، اسی راہ سے یاجوج
اور ماجوج آکر اس طرف کے علاقہ میں تاخت و تاراج
کیا کرتے تھے اور یہیں اس نے سد تعمیر کی ۔۔۔۔

اس کے بعد ذوالقرنین کا جو وصف سامنے
آتا ہے وہ اس کی عدالت گستری اور خدمت انسانی
کی فیاضانہ سرگرمی ہے، اور یہ اوصاف سائرس
کی تاریخی سیرت کی اس درجہ آشکارا حقیقتیں ہیں کہ
مورخ کی نگاہ کسی دوسری طرف اٹھ ہی نہیں سکتی،
قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے مغرب میں جو قوم
ملی تھی اس کی نسبت حکم الٰہی ہوا تھا یا ذالقرنین
اما ان تعذب واما ان تتخذ فیھم
حسنا یعنی یہ قوم اب تیرے بس میں ہے جس

طرح چاہے تو ان کے ساتھ سلوک کر سکتا ہے
خواہ سزا دے خواہ انھیں اپنا دوست بنالے، یقیناً
یہ لیڈیا کی یونانی قوم تھی اس کے بادشاہ کروئسس
نے تمام عہد وپیمان اور باہمی رشتہ داریاں بھلا کر
بلا وجہ سائرس پر حملہ کر دیا تھا اور صرف خود ہی
حملہ آور نہیں ہوا تھا بلکہ وقت کی تمام طاقتور
حکومتوں کو بھی اس کے خلاف ابھار کر اپنے ساتھ
کر لیا تھا........ تمام یونانی مورخ
بالاتفاق شہادت دیتے ہیں، کہ سائرس نے
فتح کے بعد باشندگان لیڈیا کے ساتھ جو سلوک
کیا وہ صرف منصفانہ ہی نہ تھا وہ اس سے
بھی زیادہ تھا وہ فیاضانہ تھا وہ اگر اپنے دشمنوں
کے ساتھ سختی کرتا تو یہ انصاف ہوتا کیونکہ
زیادتی انھی کی تھی لیکن وہ صرف منصف
ہونے پر قانع نہیں ہوا اس نے رحم وبخشش
کا شیوہ اختیار کیا........ یہ تو صرف
اس کی مغربی فتحمندی کی سرگذشت تھی
اب دیکھنا چاہئیے کہ اس کے اعمال کی
عام رفتار کیسی رہی؟ اور قرآن کا بیان
کردہ وصف کہاں تک اس پر راست آتا
ہے؟...........

... بالاتفاق یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ سائرس
تاریخ قدیم کی سب سے بڑی شخصیت ہے
جس میں بیک وقت فتوحات کی وسعت،
فرمانروائی کی عظمت، اور اخلاق وانسانیت کی
فضیلت جمع ہوگئی تھی اور وہ جس عہد میں ظاہر
ہوا اس عہد میں اس کی شخصیت ہر اعتبار سے
انسانیت کا ایک پیام اور قوموں کی نجات
تھی............

اس سلسلہ میں آخری وصف جو ذوالقرنین
کا سامنے آتا ہے وہ اس کا ایمان باللہ ہے...
..... یہودیوں کے صحائف کی واضح شہادت
موجود ہے کہ خدا نے اسے اپنا فرستادہ اور "مسیح"
کہا، اور وہ نبیوں کا موعود ومنتظر تھا، ظاہر ہے
کہ ایسی ہستی خدا کی نافرمان نہیں ہو سکتی،

ہم نے اقتباس میں نہایت ہی اختصار سے
کام لیا ہے، مولانا کا یہ مقالہ جو ذوالقرنین
یاجوج وماجوج اور سد کی تحقیق میں سپرد قلم
ہوا ہے نہایت باریک خط کے اکتیس صفحات پر
پھیلا ہوا ہے، تفصیل کیلئے اسکا مطالعہ ازبس مفید ہے
واضح رہے کہ ہمارے زمانے میں بھی اور اس
سے پہلے بھی "ذوالقرنین" کی نبوت کا مسئلہ

زیر بحث رہ چکا ہے اور ہر فریق اپنے دعوے
کے ثبوت میں دلائل پیش کرتا ہے لیکن جس صورت
میں کہ حاکم حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی
روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا
یہ ارشاد نقل کر رہے ہیں کہ

لا ادری ذوالقرنین — مجھے نہیں معلوم ذوالقرنین
کان نبیا ام لا ۱؎ — نبی تھے یا نہیں۔

اس بحث کے فیصلہ کی جرأت کرنا کس قدر لایعنی
ہے۔ پ ۱۶/۲

ذَا الْکِفْلِ ذوالکفل علیہ السلام، قرآن مجید میں
آپ کا ذکر انبیاء علیہم السلام کے زمرہ میں دو
مقام پر آیا ہے۔ لیکن دونوں جگہ صرف نام لیا
گیا ہے، آپ کے حالات کا کوئی اجمالی یا تفصیلی
تذکرہ نہیں کیا گیا، اسی طرح جناب رسالت مآب
صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس سلسلہ میں کچھ مروی
نہیں ہے۔ قرآن نے آپ کے صابرین،
صالحین اور اخیار میں سے ہونے کی شہادت
اور رحمتِ الٰہی میں داخل کرنے کی بشارت
دی ہے، عالم انسانی کے لیے اس سے زیادہ
کسی کی سیرت میں اور کس چیز کے معلوم کرنے کی
ضرورت ہے، پ ۱۷/۶ پ ۲۳/۱۴

ذَا النُّوْنِ مچھلی والا، یہ حضرت یونس علیہ السلام
کا لقب ہے، چونکہ آپ کو مچھلی نگل گئی تھی اس لیے
"ذوالنون" کہلائے، (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو
ذو اور یونس) پ ۱۷/۶

ذَاتِ والی، صاحب، مؤنث ہے ذُوْ کا جو
بمعنی صاحب ہے ذَوَاتٌ جمع (ملاحظہ ہو ذُوْ)
پ ۴/۳و۷ پ ۶/۴ پ ۹/۱۵ پ ۱۰/۱ پ ۱۱/۱۷ پ ۱۵/۱۴و۱۶ پ ۱۷/۸ پ ۱۸/۳ پ ۲۰/۱
پ ۲۱/۱۲ پ ۲۲/۱۷ پ ۲۳/۱۵ پ ۲۵/۴ پ ۲۶/۱۸ پ ۲۷/۸و۱۱و۱۷ پ ۲۸/۱۵ پ ۲۹/۱
پ ۳۰/۱۰و۱۱و۱۴و۱۶

ذَارِیٰتِ بکھیرنے والیاں، پراگندہ کرنے والیاں،
ذَرْوٌ سے، اسم فاعل کا صیغہ جمع مونث، قرآن
مجید میں یہ ہواؤں کی صفت بیان کی گئی ہے۔
(ملاحظہ ہو ذَرُوْا) پ ۲۶/۱۸

ذَاقَا ان دونوں نے چکھا، (نَصَرَ) ذَوْقٌ
سے، جس کے معنی چکھنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ
تثنیہ مذکر غائب، پ ۸/۹

ذَاقَتْ اس نے چکھا، ذَوْقٌ سے ماضی کا صیغہ
واحد مؤنث غائب۔ پ ۲۸/۱۸

ذَاقُوْا انہوں نے چکھا، ذَوْقٌ سے ماضی کا صیغہ

۱؎ المستدرک علی الصحیحین ج ۲ ص ۵۰ طبع دائرۃ المعارف ۱۳۴۰ھ حاکم نے اس کو بخاری مسلم کی شرط پر صحیح کہا اور ذہبی نے تلخیص میں
اس کو تسلیم کر لیا ہے۔

جمع مذکر غائب، پ ۲۸/۵ ۱ و ۵ و ۵

ذٰكِرٰتِ۔ یاد کرنے والی عورتیں، ذَاکِرَۃٌ کی جمع، ذِکْرٌ سے، اسم فاعل کا صیغہ جمع مؤنث (ملاحظہ ہو ذکر) پ ۲۲/۲

ذَاكِرِيْنَ۔ یاد رکھنے والے، یاد کرنے والے ذَاکِرٌ کی جمع، ذِکْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت نصب و جر، پ ۱۲/۱ پ ۲۲/۲

ذٰلِكَ، یہ یہی، اسمائے اشارہ میں سے ہے، بعید کے لئے آتا ہے، اس میں ذَا اسم اشارہ ہے اور کَ حرف خطاب ہے اور اسی لئے مخاطب کے حالات کے اعتبار سے تذکیر، تانیث، تثنیہ اور جمع میں بدلتا رہتا ہے۔ پ ۱: ۱ و ۶۳ و ۷ و ۸ و ۹ و ۱۰

پ ۲: ۵ و ۶ و ۸ و ۱۲ و ۱۳ و ۱۴ و ۱۵ و ۱۶، پ ۳: ۶ و ۱۰ و ۱۱ و ۱۳ و ۱۴ و ۱۵ و ۱۶ و ۱۷

پ ۴: ۱ و ۳ و ۸ و ۱۰ و ۱۱ و ۱۲ و ۱۳، پ ۵: ۱ و ۲ و ۳ و ۴ و ۵ و ۱۵ و ۱۶ و ۱۸

پ ۶: ۱ و ۲ و ۳ و ۷ و ۹ و ۱۰ و ۱۲ و ۱۳ و ۱۵، پ ۷: ۱ و ۲ و ۳ و ۴ و ۶

پ ۷: ۸ و ۱۶ و ۱۸، پ ۸: ۳ و ۵ و ۷ و ۱۰، پ ۹: ۷ و ۱۱ و ۱۲ و ۱۶

پ ۱۰: ۱ و ۱۵ و ۱۶ و ۱۹، پ ۱۱: ۲ و ۳ و ۴ و ۶ و ۱۲

پ ۱۲: ۶ و ۹ و ۱۰ و ۱۲ و ۱۶ و ۱۷، پ ۱۳: ۲ و ۵ و ۷ و ۱۳ و ۱۵

پ ۱۴: ۵ و ۸ و ۹ و ۱۴ و ۱۵ و ۱۷ و ۲۰ و ۲۱، پ ۱۵: ۳ و ۶ و ۱۱ و ۱۲ و ۱۴ و ۱۹

پ ۱۵: ۱۶ و ۲۱، پ ۱۶: ۱ و ۳ و ۴ و ۶ و ۷ و ۱۰ و ۱۳ و ۱۶، پ ۱۷: ۲ و ۶ و ۸ و ۹

پ ۱۶: ۹ و ۱۰ و ۱۲ و ۱۶، پ ۱۸: ۱ و ۲ و ۴ و ۷ و ۱۰ و ۱۲ و ۱۳ و ۱۷

پ ۱۹: ۲ و ۴ و ۵ و ۸ و ۹ و ۱۰ و ۱۱ و ۱۲ و ۱۳ و ۱۴ و ۱۹، پ ۲۰: ۳ و ۹ و ۱۴

پ ۲۰: ۱۵ و ۱۶، پ ۲۱: ۱ و ۲ و ۶ و ۷ و ۸ و ۱۰ و ۱۲ و ۱۳ و ۱۴ و ۱۶ و ۱۷ و ۱۸ و ۱۹ و ۲۰

پ ۲۲: ۳ و ۵ و ۷ و ۸ و ۹ و ۱۳ و ۱۵ و ۱۶ و ۱۹، پ ۲۲: ۲ و ۶ و ۱۰ و ۱۱ و ۱۳ و ۱۶ و ۱۷

پ ۲۴: ۱۸ و ۱۹، پ ۲۵: ۱ و ۲ و ۳ و ۴ و ۵ و ۶ و ۸ و ۹ و ۱۲ و ۱۸ و ۱۹ و ۲۰

پ ۲۶: ۴ و ۵ و ۶ و ۷ و ۹ و ۱۰ و ۱۲ و ۱۵ و ۱۶ و ۱۸، پ ۲۷: ۳ و ۵ و ۸ و ۱۵ و ۱۹

پ ۲۸: ۱ و ۲ و ۳ و ۵ و ۷ و ۱۰ و ۱۱ و ۱۳ و ۱۴ و ۱۵ و ۱۷ و ۱۹

پ ۲۹: ۳ و ۴ و ۶ و ۷ و ۸ و ۱۱ و ۱۵ و ۱۸ و ۱۹، پ ۳۰: ۲ و ۳ و ۴ و ۸

پ ۳۰: ۱ و ۱۴ و ۲۳ و ۲۵ و ۳۲

ذٰلِكِ۔ یہ یہی، اسم اشارہ ہے، واحد مؤنث کے لئے استعمال ہوتا ہے، پ ۱۲/۱۳ پ ۲۶/۱۹

ذٰلِكُمْ۔ یہ یہی، اس میں کُمْ ضمیر جمع خطاب کے لئے ہے، پ ۱/۹ پ ۲/۱۴ پ ۳: ۷ و ۱۰ و ۱۷ پ ۴/۹ پ ۵/۱ پ ۶/۵

پ ۷: ۱۸ و ۱۹ پ ۸: ۴ و ۱۸ پ ۹: ۹ و ۱۹ پ ۱۰/۱۲ پ ۱۱: ۶ و ۹ پ ۱۳/۱۳ پ ۱۴: ۵ و ۲۷

پ ۱۸/۱۰ پ ۲۰/۱۲ پ ۲۱: ۷ و ۱۷ پ ۲۲: ۲ و ۱۷ پ ۲۳/۱۵ پ ۲۴: ۶ و ۱۲ و ۱۳ و ۱۷ پ ۲۵: ۲ و ۲۰

پ ۲۸: ۱ و ۸ و ۱۲ و ۱۷

ذٰلِكُمَا۔ یہ یہی، اس میں کُمَا ضمیر تثنیہ خطاب کے لئے ہے، پ ۱۲/۱۵

ذٰلِكُنَّ۔ یہ یہی، اس میں کُنَّ ضمیر جمع مؤنث خطاب کے لئے ہے، پ ۱۲/۱۴

ذٰنِكَ یہ دو، ذَانِ ذَا کا تثنیہ ہے، اسمائے اشارہ میں سے ہے اور کَ ضمیر خطاب ہے، پ ۲۰/۶

ذَاهِبٌ۔ جانے والا، ذَهَابٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو اِذْهَبْ) پ ۲۳

ذَآئِقُوْا۔ چکھنے والے، ذَآئِقٌ کی جمع، ذَوْقٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، اصل میں . . . ذَآئِقُوْنَ تھا، نون اضافت کے سبب گر پڑا، (ملاحظہ ہو ذَاقَا) پ ۲۳

ذَآئِقُوْنَ چکھنے والے، ذَوْقٌ سے، اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، پ ۲۳

ذَآئِقَةٌ۔ چکھنے والی، ذَوْقٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مونث، پ ۴ پ ۱۷ پ ۲۱

فصل الباء الموحدة

ذُبَابٌ۔ مکھی، اَذِبَّةٌ، ذِبَّانٌ، ذُبٌّ جمع پ ۱۷

ذُبَابًا۔ پ ۱۷

ذُبِحَ۔ وہ ذبح کیا گیا، ذَبْحٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو اَذْبَحُكَ) پ ۶

ذِبْحٍ۔ قربانی، جس چیز کو ذبح کیا جائے اس کا نام ذِبْحٌ ہے، پ ۲۳

ذَبَحُوْهَا۔ انھوں نے اس کو ذبح کیا، ذَبَحُوْا ذَبْحٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب هَا ضمیر واحد مونث غائب، پ ۱

فصل الراء المهملة

ذَرْ، تو چھوڑ دے (سَمِعَ، فَتَحَ) وَذْرٌ سے جس کے معنی چھوڑ دینے کے ہیں، امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر، اس کی ماضی نہیں آتی ہے، پ ۱۴

ذَرَأَ۔ اس نے پیدا کیا۔ اس نے پھیلایا، اس نے بکھیرا، ذَرْءٌ سے جس کے معنی پیدا کرنے اور ظاہر کرنے اور پھیلانے کے ہیں۔ ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ ۸ پ ۱۸

ذِرَاعًا۔ گز، بازو، ہاتھ، کہنی سے لیکر بیچ کی انگلی کے سرے تک جو ہاتھ کا حصہ ہے "ذراع" کہلاتا ہے اَذْرُعٌ اور ذُرْعَانٌ جمع، پ ۲۹

ذِرَاعَيْهِ۔ اس کے دونوں ہاتھ، اس کے دونوں بازو، ذِرَاعَيْ ذِرَاعٌ کا تثنیہ، مضاف ہے اور اضافت کے سبب نون تثنیہ حذف ہو گیا ہے ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ۔ پ ۱۵

ذَرَأَكُمْ۔ اس نے تم کو پیدا کیا، اس نے تم کو پھیلایا اس نے تم کو بکھیر دیا۔ اس میں کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر ہے (ملاحظہ ہو ذَرَأَ) پ ۱۸ پ ۲۹

ذَرَأْنَا۔ ہم نے پیدا کیا، ہم نے پھیلا دیا، ذَرْءٌ سے، ماضی کا صیغہ جمع متکلم، پ ۹

ذَرْعًا۔ طاقت، گنجائش، ہاتھ کی کشادگی ذَرَعَ
یَذْرَعُ کا مصدر ہے۔ خازن بغدادی لکھتے ہیں
"ازہری کا بیان ہے کہ ذرع طاقت کی جگہ پر استعمال
کیا جاتا ہے اور اس کی اصل یوں ہے کہ اونٹ اپنی
رفتار میں اگلے قدموں کو پچھلے قدموں کی وسعت
کے اعتبار سے بڑھاتا ہے اور جب اس پر طاقت سے
زیادہ بوجھ ڈال دیا جاتا ہے تو اس کی وجہ سے اس
کے اگلے قدم رک جاتے ہیں اور وہ کمزور ہو کر اپنی
گردن لمبی کر دیتا ہے، پس "ضیق ذرع" سے
گنجائش اور طاقت کا ختم ہو جانا مراد لیا گیا، اور
ضَاقَ بِھِمْ ذَرْعًا کے معنی ہوئے کہ معاملہ کی
خرابی سے رہائی کی کوئی صورت نہ ہو سکی، اور ازہری
کے علاوہ دوسرے علما کا بیان ہے کہ اس کے معنی
دل تنگی اور کڑھنے کے ہیں اور اس کی اصل کا پتہ نہیں
ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ذرع وسعت (گنجائش)
سے کنایہ ہے کیونکہ ذراع یدیں میں داخل ہے اور
عرب والے بولتے ہیں لیس ھذا فی یدی (یہ میرے ہاتھ
میں نہیں) اور مراد یہ لیتے ہیں کہ اس کی مجھ میں گنجائش
نہیں اور ضاق فلان ذرعا بکذا اس وقت بولا جاتا
ہے جبکہ شخص کسی مصیبت میں گرفتار ہو اور اس سے نکلنے کی
طاقت نہ رکھتا ہو"[1] پ۱۲ پ۲۰

ذَرْعُهَا۔ اس کا طول، اس کی درازی، اس کی ناپ۔ ذرع
مصدر ہے جس کے معنی پیمائش کرنے اور ناپنے کے آتے ہیں مضاف ہے
ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ۔ پ۲۹/۵

ذَرْنَا۔ تو ہم کو چھوڑ دے، اس میں نا ضمیر
جمع متکلم ہے (ملاحظہ ہو ذَرْ) پ۱/۷

ذَرْنِی۔ تو مجھ کو چھوڑ دے، اس میں نون وقایہ
اور ی ضمیر واحد متکلم ہے، پ۲۹ ۱۳، ۱۵

ذَرْوًا۔ اڑانا، پراگندہ کرنا، جدا کرنا۔ ذَرَا
یَذْرُوْ کا مصدر ہے، پ۲۶/۱۸

ذَرُوْا۔ تم چھوڑ دو، وَذَرَ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر
(ملاحظہ ہو ذَرْ) پ۳ پ۸ پ۱۲ پ۲۸

ذَرُوْنَا۔ تم ہم کو چھوڑو۔ اس میں نا ضمیر جمع
متکلم ہے، پ۲۶/۱

ذَرُوْنِی، تم مجھے چھوڑو، اس میں نون وقایہ
ی ضمیر واحد متکلم ہے، پ۲۴

ذَرُوْهُ۔ تم اس کو چھوڑ دو۔ اس میں ہٗ ضمیر
واحد مذکر غائب ہے، پ۸

ذَرُوْهَا۔ تم اس کو چھوڑ دو۔ اس میں ھا ضمیر
واحد مؤنث غائب ہے، پ۸ پ۱۲

ذَرَّة۔ ذرہ۔ چھوٹی چیونٹی، ذَرَّات جمع،
پ۵ پ۱۱ پ۲۲ پ۳۰

[1] لباب التاویل ج ۳ ص ۱۹۸ طبع مصر ۱۳۳۱ھ

ذَرْهُمْ۔ تو ان کو چھوڑ دے، اس میں هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے (ملاحظہ ہو ذَرْ) پ۷/۱۷ پ۸/۱ پ۱۴/۱ پ۱۸/۴ پ۲۵/۱۲ پ۲۷/۴ پ۲۹/۸

ذُرِّيّٰتِنَا۔ ہماری اولاد، ذُرِّيّٰت، ذُرِّيَّة کی جمع مضاف ہے۔ نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ پ۱۹/۴

ذُرِّيّٰتِهِمْ۔ ان کی اولاد ذُرِّيّٰت مضاف هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، پ۷/۱۶ پ۹/۱۳ پ۲۷/۲

ذُرِّيَّةٌ۔ اولاد، اصل میں تو چھوٹے چھوٹے بچوں کا نام ذریت ہے، مگر عرف میں چھوٹی، اور بڑی سب اولاد کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے او ر اگرچہ اصل میں یہ جمع ہے مگر واحد اور جمع دونوں کے لئے مستعمل ہے، ذُرِّيَّة کے بارے میں تین اقوال ہیں (۱) یہ ذَرْءٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی پیدا کرنے اور پھیلانے کے ہیں اور اس کی ہمزہ متروک ہو گئی ہے جیسے کہ رَوِيَّةٌ اور بَرِيَّةٌ میں (۲) اس کی اصل ذُرْوِيَّةٌ ہے (۳) ذَرٌّ سے جس کے معنی بکھیرنے کے ہیں، فُعْلِيَّةٌ کے وزن پر ہے جیسے قُمْرِيَّةٌ ہے، ذَرَارِیُّ اور ذُرِّيّٰتٌ جمع، پ۳/۱۲ پ۳/۱۲ پ۴/۲ پ۴/۱۲ پ۵/۳ پ۸/۱۳ پ۹/۱۴ پ۱۲/۱۲ پ۱۵/۱ پ۱۶/۷

ذُرِّيَّتَنَا۔ ہماری اولاد، ذُرِّيَّةَ مضاف، نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ پ۱/۱۵

ذُرِّيَّتَهٗ۔ اس کی اولاد، ذُرِّيَّةَ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ پ۷/۱۴ پ۱۵/۷ پ۱۵/۱۹ پ۲۰/۱۵ پ۲۳/۷

ذُرِّيَّتَهَا۔ اس کی اولاد، ذُرِّيَّةَ مضاف، هَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، پ۳/۱۲

ذُرِّيَّتَهُمْ۔ ان کی اولاد، ذُرِّيَّةَ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ پ۹/۱۲ پ۲۲/۲ پ۲۷/۲

ذُرِّيَّتِهِمَا۔ ان دونوں کی اولاد، ذُرِّيَّةِ مضاف هُمَا ضمیر تثنیہ مذکر غائب مضاف الیہ پ۲۳/۷ پ۲۷/۲۰

ذُرِّيَّتِيْ۔ میری اولاد، ذُرِّيَّة مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، پ۱/۱۵ پ۱۳/۱۸

فصل القاف

ذُقْ۔ تو چکھ، ذَوْقٌ سے امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر (ملاحظہ ہو ذَاقَا) پ۲۵/۱۹

فصل الکاف

ذِكْرٌ۔ ذکر، یاد، پند، نصیحت، بیان، ذَكَرَ يَذْكُرُ کا مصدر ہے، امام راغب لکھتے ہیں۔

"ذکر بول کر کبھی تو اس سے نفس کی وہ ہیئت مراد لی جاتی ہے کہ جس کے ذریعہ انسان کے لئے جو کچھ معرفت حاصل کرے، اس کا یاد رکھنا ممکن ہو اور یہ حفظ ہی کی طرح ہے مگر حفظ باعتبار اس کے حصول کے بولا جاتا ہے اور ذکر باعتبار اس کے استحضار کے (یعنی حفظ یاد کرنے کے لئے آتا ہے اور ذکر یاد رکھنے کے لئے) اور کبھی ذکر کسی چیز کے دل میں یا گفتگو میں یاد آجانے کیلئے بھی بولا جاتا ہے، اور اسی لئے کہا گیا ہے کہ ذکر دو ہیں، ذکرِ قلبی اور ذکرِ لسانی، اور پھر دونوں میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں، ایک بھولے پیچھے یاد آنا، دوسرے بغیر بھولے یاد رہنا بلکہ دائمی یاد رکھنا، نیز ہر قول یعنی گفتگو اور بیان کو بھی ذکر کہا جاتا ہے"

اور بیہقی تاج المصادر میں رقمطراز ہیں۔

"ذکر کی دو قسمیں ہیں ایک وہ ذکر جو نسیان کی ضد ہے جیسے ارشاد باری جل وعلا ہے۔ وَمَآ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ (اور یہ مجھکو بھلایا شیطان ہی نے کہ اس کا مذکور کروں) اور ایک وہ ذکر جو کہ قول ہے جس کا ذکر ہو اس کی برائی نہ ہو جیسا کہ عام طور پر گفتگو میں ہوتا ہے نیز وہ گفتگو بھی جس میں مذکور کا عیب بیان ہو جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کی زبانی بیان فرمایا ہے سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ (ہم نے سنا ہے ایک جوان ان کو کچھ کہتا ہے) یعنی ان کو عیب دیتا ہے"

آیت شریفہ "اَءُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا (کیا ہم سب میں سے اسی پر ذکر اتارا گیا) میں ذکر سے قرآن مجید مراد ہے۔ کیونکہ اس سے بڑھکر اور کونسا ذکر ہے۔ پ۳/۱۴، پ۷/۲، پ۸/۱۵و۱۶، پ۱۲/۱۵، پ۱۳/۵و۱۰
پ۱۴/۱و۱۲، پ۱۶/۲، پ۱۷/۲و۳و۴و۵، پ۱۸/۱۱و۱۷، پ۱۹/۱و۵، پ۲۱/۱، پ۲۲/۱۸
پ۲۳/۴و۱۰و۱۲و۱۳و۱۴و۱۷، پ۲۴/۱۹، پ۲۵/۷و۱۰، پ۲۷/۸و۹و۱۸
پ۲۸/۲و۱۲و۱۴، پ۲۹/۴و۱۱، پ۳۰/۴

ذِكْرًا۔ پ۲/۵، پ۱۵/۲۱، پ۱۶/۲و۱۴و۱۵، پ۱۷/۴، پ۲۲/۳، پ۲۳/۵و۹
پ۲۸/۱۸، پ۲۹/۲۱

ذَكَرٌ۔ مرد، نر، ذُكُوْرٌ اور ذُكْرَانٌ جمع، کبھی اس سے عضوِ مخصوص کا کنایہ بھی ہوتا ہے، پ۳۰/۱۲
پ۴/۱۱و۱۲، پ۵/۱۵، پ۶/۴، پ۱۴/۱۹، پ۲۴/۱۰، پ۲۶/۱۲، پ۲۷/۵و۷، پ۲۹/۱۸، پ۳۰/۱۷

ذَكَرَ۔ اس نے ذکر کیا، اس نے یاد کیا، (نصر) ذِكْرٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب پ۲۱/۱۹، پ۳۰/۱۲

ذُكِرَ۔ وہ یاد کیا گیا، وہ ذکر کیا گیا۔ ذِكْرٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ۸/۱، پ۹/۱۵
پ۷/۱۲، پ۲۴/۲، پ۲۶

ذُكِّرَ۔ اس کو یاد دلایا گیا، اس کو نصیحت کی گئی، تذکیر سے جس کے معنی یاد دلانے اور نصیحت کرنے کے ہیں ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو تذکیراً) پ ۵/۱۰ پ ۲/۱۵

ذَكِّرْ۔ تو یاد دلا، تو سمجھا، تو نصیحت کر، تذکیر سے امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر، پ ۷/۱۴ پ ۲۶/۱۷ پ ۲۷/۲و۲ پ ۳۰/۱۲و۱۳

ذُكْرَان۔ مرد، ذَکَر کی جمع۔ پ ۱۹/۱۲

ذُكْرَانًا۔ پ ۲۵/۶

ذَكَرْتَ۔ تو نے یاد کیا، تو نے ذکر کیا، ذِکر سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، پ ۱۵/۱۳

ذُكِّرْتُمْ۔ تم کو سمجھایا گیا، تم کو نصیحت کی گئی، تذکیر سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر حاضر (ملاحظہ ہو تذکیراً) پ ۲۲/۱۹

ذِكْرَكَ۔ تیرا ذکر، تیری یاد، تیرا مذکور، ذِکر مضاف ک ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ، پ ۳۰/۱۵

ذِكْرُكُمْ۔ تمہارا مذکور، تمہارا ذکر، تمہارا یاد کرنا تمہاری نصیحت، ذِکر مضاف کُم ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، پ ۱۷/۱

ذِكْرِنَا۔ ہماری یاد، ذِکر مضاف، نا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، پ ۱۵/۱۶ پ ۲۶/۶

ذَكَرُوا۔ انھوں نے یاد کیا، انھوں نے ذکر کیا، ذِکر سے ماضی کا صیغہ۔ جمع مذکر غائب پ ۷/۵ پ ۱۹/۱۵

ذُكِّرُوا۔ ان کو سمجھایا گیا، ان کو نصیحت کی گئی، ان کو یاد دلائی گئی، تذکیر سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ ۷/۶ پ ۹/۱۱ پ ۹/۲ پ ۱۹/۱ پ ۲۱/۱۵ پ ۲۳/۵

ذَكَرَهُ۔ اس کو یاد کیا، اس کو ذکر کیا، ذَکَرَ صیغہ ماضی، ہ ضمیر واحد مذکر غائب۔ پ ۲۹/۱۶ پ ۳۰/۵

ذِكْرِهِمْ۔ ان کا ذکر، ان کی نصیحت، ذِکر مضاف ہم ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ پ ۱۸/۴

ذَكِّرْهُمْ۔ تو ان کو نصیحت کر، تو ان کو یاد دلا، ذَکِّر تذکیر سے۔ صیغہ امر، ہُم ضمیر جمع مذکر غائب، پ ۱۳/۱۳

ذِكْرٰى۔ نصیحت کرنا، ذکر کرنا، یاد، پند، موعظت ذَکَرَ یَذْکُرُ کا مصدر ہے، کثرتِ ذکر کے لئے ذکرٰی بولا جاتا ہے، یہ ذکر سے زیادہ بلیغ ہے پ ۷/۱۴و۱۶ پ ۸/۸ پ ۱۲/۱۰ پ ۱۴/۶ پ ۱۹/۱۵ پ ۲۱/۱ پ ۲۳/۱۳و۱۶ پ ۲۴/۱۱ پ ۲۴/۱۴ پ ۲۶/۱۵و۱۷ پ ۲۷/۲ پ ۲۹/۱۵ پ ۳۰/۱۲و۱۵و۱۴

ذِكْرِي۔ میری نصیحت، میری یاد، میرا ذکر، ذِکر مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ پ ۱۶/۱۰و۱۲ پ ۱۶/۱۱و۱۲ پ ۱۸/۶ پ ۲۳/۱۰

ذَكَرَيْنِ۔ دو مرد، دو نر، ذَکَر کا تثنیہ، بحالتِ

نصب وجر، پ٥

ذِکْرٰہَا۔ اس کی یاد، اس کا مذکور، اس کا ذکر
ذِکْرٰی مضاف، ہَا ضمیر واحد مونث غائب
مضاف الیہ، پ٣٠

ذِکْرٰہُمْ۔ ان کا نصیحت پکڑنا، ان کا یاد کرنا،
ذِکْرٰی مضاف، ہُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ
پ٢٦

ذُکُوْرٌ۔ مرد، ذَکَرٌ کی جمع، پ٢٥

ذُکُوْرِنَا۔ ہمارے مرد، ذُکُوْرِ مضاف، نَا ضمیر
جمع متکلم مضاف الیہ۔ پ٨

ذَکَّیْتُمْ۔ تم نے ذبح کیا۔ تَذْکِیَۃٌ سے جس کے
معنی ذبح کرنے کے ہیں ماضی کا صیغہ جمع مذکر
حاضر۔ پ٦

فصل اللام

ذُلٌّ۔ تواضع، ذلت، عاجزی، ذَلَّ یَذِلُّ کا
مصدر ہے، دوسرے کے دباؤ اور قہر کی بنا پر جو
ذلت ہو اس کو ذُلٌّ کہتے ہیں اور بغیر کسی کے
قہر اور دباؤ کے خود اپنی سرکشی اور سخت گیری کے
بعد جو ذلت حاصل ہو وہ ذِلٌّ کہلاتی ہے
پ٥ پ٢٥

ذُلُلًا۔ مسخر، مطیع، منقاد، ذَلُوْلٌ کی جمع، پ١٤

ذُلِّلَتْ۔ وہ پست کر دی گئی، وہ مسخر کر دی
گئی، وہ تابع کر دی گئی، تَذْلِیْلٌ سے۔
ماضی مجہول کا صیغہ واحد مونث غائب (ملاحظہ
ہو تَذْلِیْلًا) پ٢٩

ذَلَّلْنٰہَا۔ ہم نے ان کو رام کر دیا۔ ہم نے ان کو
فرمانبردار کر دیا، ہم نے ان کو عاجز کر دیا ذَلَّلْنَا
تَذْلِیْلٌ سے، ماضی کا صیغہ جمع متکلم، ہَا ضمیر
واحد مونث غائب، اَنْعَام (مویشی) کی طرف
راجع ہے اس لئے جمع کے معنی دیگی۔ پ٢٣

ذَلُوْلٌ۔ رام، نرم، مطیع، ہموار، پست، ذُلٌّ
اور ذِلٌّ سے، صفت مشبہ کا صیغہ ذُلُلٌ جمع
ہے۔ ذَلُوْلًا پ٢٩

ذِلَّۃٌ۔ ذلت، خواری، رسوائی، ذَلَّ یَذِلُّ کا
مصدر ہے، پ١ پ٤ پ٩ پ١١ پ١٤ پ٢٩

فصل المیم

ذِمَّۃٌ۔ عہد، ذِمَمٌ جمع، پ١٠

فصل النون المعجمۃ

ذَنْبٌ۔ گناہ، ذُنُوْبٌ جمع، اصل میں ذَنْبٌ

کے معنی کسی چیز کی دُم پکڑنے کے ہیں، اور دم کے اعتبار سے ہی اس کا استعمال ہر اس فعل کے متعلق ہوتا ہے جس کا انجام برا ہو، اور اسی وجہ سے برے انجام کا نام ذنب ہے، اور چونکہ گناہ کا انجام برا ہے اس لئے اسے ذنب کہتے ہیں، پ۶ ۱۹ پ۶ ۲۴ پ۶ ۳۰

ذَنْۢبِكَ۔ تیرا برا انجام، تیرا گناہ، ذَنْبِ مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ، پ۱۲ ۱۴ پ۱۲ ۱۴ پ۲۶ ۶

ذَنْۢبِہٖ۔ اس کا گناہ، ذَنْبِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ۱۹ ۲۰ پ۱۲ ۲۷

ذَنْۢبِہِمْ۔ ان کا گناہ۔ ذَنْبِ مضاف ہِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، پ۱ ۲۱ پ۱۶ ۳۰

ذَنُوْبِ بھرا ڈول، بطور استعارہ حصہ اور نصیب کے معنی میں بھی آتا ہے، ذَنَائِبُ ذِنَابٌ اور اَذْنِبَۃٌ جمع پ۱ ۲۷ ذَنُوْبًا پ۲ ۲۷

ذُنُوْبَ۔ گناہ، ذَنْبٌ کی جمع پ۸ ۲ پ۲ ۴ پ۲ ۹ پ۲ ۲۴

ذُنُوْبَکُمْ۔ تمہارے گناہ، ذُنُوْبِ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، پ۱۲ ۳ پ۲ ۱۲ پ۲ ۲۶ پ۱ ۲۸ پ۹ ۲۹

ذُنُوْبَنَا۔ ہمارے گناہ، ذُنُوْبَ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ پ۳ ۶ پ۱۱ ۴ پ۲۴ ۱۲

ذُنُوْبِہِمْ۔ ان کے گناہ، ذُنُوْبِ مضاف ہِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، پ۳ ۴ پ۱۱ ۶ پ۸ ۹ ...

فصل الواو

ذُوْ۔ والا، صاحب، اسم ہے، اس کے ذریعہ اسماء اجناس و انواع سے موسوم کیا جاتا ہے یہ اسمائے ستہ مکبرہ میں سے ہے، یعنی ان چھ اسموں میں سے ہے کہ جب ان کی تصغیر نہ ہو اور وہ غیر یاء متکلم کی طرف مضاف ہوں تو ان کو پیش کی حالت میں واو، زبر کی حالت میں الف اور زیر کی حالت میں یا آتی ہے جیسے ذُوْ، ذَا ذِیْ۔ یہ ہمیشہ مضاف ہو کر ہی استعمال ہوتا ہے اور اسم ظاہر ہی کی طرف مضاف ہوتا ہے، ضمیر کی طرف نہیں، اور اس کا تثنیہ بھی آتا ہے اور جمع بھی۔ علامہ سہیلی کا بیان ہے۔

"ذُوْ کے وصف میں صاحب کے وصف کی نسبت زیادہ بلاغت ہے اور اس کے ذریعہ اضافت میں زیادہ شرف ہے کیونکہ ذُوْ تابع کی طرف مضاف

ہوتا ہے اور صاحب متبوع کی طرف چنانچہ
ابوھریرۃ صاحب النبی بولتے ہو، النبی
صاحب ابی ھریرۃ نہیں کہتے لیکن ذو کے ساتھ
جب ذوالمال اور ذوالعرش کہو گے تو پہلا
اسم تمہیں متبوع ہی ملے گا تابع نہیں، اور یہی فرق
ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانبیاء میں فرمایا
ہے وَذَا النُّوْنِ اور اس کی اضافت نون کی طرف
کی ہے جس کے معنی مچھلی کے ہیں اور سورہ ن میں
ارشاد ہے وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ حالانکہ
معنی ایک ہی ہیں لیکن دو مختلف حالتوں کی
طرف جس خوبی کے ساتھ دونوں لفظوں میں اشارہ
کیا ہے، بڑا تفاوت ہے، کیونکہ تعریف کے موقع پر
جب ان کا ذکر کیا تو ذا لایا گیا کہ اس ذریعہ اضافت
میں زیادہ بزرگی ہے، نیز لفظ نون استعمال کیا کہ وہ
لفظ حوت سے اشرف ہے کیونکہ اوائل سور میں
موجود ہے اور لفظ حوت میں کوئی ایسی چیز موجود
نہیں جس کے ذریعہ اس کو یہ شرف حاصل ہو، اس
لئے اسی کو استعمال کیا گیا اور جب ایسے مقام پر
ان کا ذکر کیا جہاں ان کی پیروی سے نہی ہے تو
صاحب کا استعمال کیا گیا۔ ؎۱۵

پ ۱/۱۳، پ ۲/۱۶ و ۱۷، پ ۳/۲ و ۹ و ۱۶، پ ۴/۷ و ۹، پ ۷/۳، پ ۸/۳ و ۵، پ ۹/۱۸
پ ۱۱/۱۱، پ ۱۳/۲ و ۷ و ۱۹، پ ۱۵/۲۰، پ ۱۸/۲ و ۱۱، پ ۲۳/۱۰، پ ۲۴/۷ و ۱۲ و ۱۹، پ ۲۵/۱
پ ۲۷/۲ و ۵ و ۱۱ و ۱۲ و ۱۹ و ۲۰، پ ۲۸/۱۱ و ۱۷، پ ۳۰/۱۰

ذَوَا۔ والے، صاحب، ذُوْ کا تثنیہ بحالتِ رفع۔
پ ۸/۳ و ۴

ذَوَاتَا۔ والیاں، صاحب، ذَاتٌ کا تثنیہ بحالتِ
رفع (ملاحظہ ہو ذَات) پ ۲۷/۱۳

ذَوَاتَی۔ والیاں، صاحب، ذَاتٌ کا تثنیہ
بحالتِ نصب و جر۔ پ ۲۲/۸

ذُوْقُوْا۔ تم چکھو، ذَوْقٌ سے امر کا صیغہ جمع مذکر
حاضر (ملاحظہ ہو ذَاقَ) پ ۴/۲ و ۱۰، پ ۷/۹، پ ۸/۱۱، پ ۹/۱۸، پ ۱۰/۳ و ۱۱، پ ۱۱/۹
پ ۲۱/۲ و ۵، پ ۲۲/۱۱ و ۱۹، پ ۲۳/۱۷، پ ۲۶/۴ و ۱۸، پ ۲۷/۹ و ۱۰، پ ۳۰/۱

ذُوْقُوْهُ۔ تم اس کو چکھو، اس میں ہٗ ضمیر واحد
مذکر غائب ہے، پ ۹/۱۶

ذَوَیْ۔ والے، صاحب، ذُوْ کا تثنیہ بحالتِ
نصب و جر، پ ۲۵/۱۷

ذَوِیْ۔ والے، صاحب، ذُوْ کی جمع۔ بحالتِ
نصب و جر، پ ۲/۶

فصل الھاء

؎۱۵ الاتقان مولفہ امام سیوطی ج ۱ ص ۱۶۳ طبع مصر۔

ذَهَابٌ۔ جانا، چلنا، چھوڑنا۔ ذَهَبَ يَذْهَبُ کا مصدر ہے (ملاحظہ ہو اِذْهَبْ) پ ۱۸/۱

ذَهَبَ۔ وہ گیا، وہ لے گیا، ذَهَابٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب پ ۱/۲، پ ۱۲/۲و۷، پ ۱۷/۶، پ ۱۸/۵، پ ۲۱/۱۸، پ ۲۹/۱۸

ذَهَبٌ۔ سونا، زر، اَذْهَابٌ، ذُهُوبٌ، ذُهْبَانٌ جمع، پ ۳/۱۰، پ ۱۰/۱۱، پ ۱۵/۱۶، پ ۱۷/۱۰، پ ۲۲/۶، پ ۲۵/۱۱و۱۳

ذَهَبًا۔ پ ۳/۱۷

ذَهَبَتْ۔ وہ گئی، وہ چلی گئی، ذَهَابٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، پ ۲۸/۸

ذَهَبْنَا۔ ہم گئے، ہم چلے گئے، ذَهَابٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب۔ پ ۱۲/۱۲

ذَهَبُوْا۔ وہ گئے، وہ لے گئے، ذَهَابٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب۔ پ ۱۲/۱۲

فصل الیاء المثناۃ

ذِیْ۔ والا، صاحب۔ اسماء ستہ مکبرہ میں سے ہے (ملاحظہ ہو ذُوْ) پ ۱/۱۰، پ ۵/۳، پ ۸/۵، پ ۱۰/۱، پ ۱۱/۱۷، پ ۱۳/۳و۱۸، پ ۱۴/۱۹، پ ۱۵/۵، پ ۱۶/۲، پ ۲۳/۱و۱۷، پ ۲۴/۱و۶، پ ۲۷/۱۲، پ ۲۸/۴، پ ۲۹/۷و۲، پ ۳۰/۶و۱۴و۱۵

ذِئْبٌ۔ گرگ، بھیڑیا۔ ذِئَابٌ، اَذْؤُبٌ، ذُؤْبَانٌ جمع، پ ۱۲/۱۲

باب الراء المهملة

فصل الالف

رَأَى۔ اس نے دیکھا، رُؤْیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ، واحد مذکر غائب، یہ تمام قرآن میں بغیر یا کے تنہا الف کے ساتھ لکھا ہوا ہے، البتہ سورہ النجم میں دو جگہ ی کے ساتھ مرقوم ہے (ملاحظہ ہو آریٰ اور رآیٰ) پ۸ ع۱۵، پ۱۲ ع۷و۱۳، پ۱۳ ع۱۸، پ۱۵ ع۱۹، پ۱۶ ع۱۰، پ۲۱ ع۱۹

رَابِطُوْا۔ تم دل لگائے رہو، تم لگے رہو، تم آمادہ رہو، رِبَاطٌ اور مُرَابَطَۃٌ سے، جس کے معنی محافظت اور نگرانی کرنے اور چوکی دینے کے ہیں امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، علامہ خازن بغدادی لکھتے ہیں۔

"مُرَابَطَۃٌ کی اصل یہ ہے کہ اِدھر کے لوگ اپنے گھوڑے اور اُدھر کے لوگ اپنے گھوڑے اس طرح باندھ لیں کہ فریقین میں سے ہر ایک دوسرے سے جنگ کے لئے مستعد رہے، بعد میں ہر اُس شخص کو جو سرحد پر اقامت گزیں ہو کر سرحد پا کا دفاع کرنے لگا۔ مرابط کہنے لگے۔ گو اس کے پاس کوئی سواری بندھی ہوئی نہ ہو۔"[1]

شرعاً مرابطت کی دو قسمیں ہیں ایک اسلامی سرحد پر کافروں کے مقابلہ میں دفاع کے لئے چوکی دیتے رہنا، دوسرے نفس کی بندش اور نگرانی کرنا اسی لئے حدیث میں ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار میں مصروف رہنے کو رباط کہا گیا ہے، پ۴ ع۱۱

رَابِعُهُمْ۔ ان کا چوتھا، رَابِعٌ اسم عدد مضاف ہے، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ پ۱۵ ع۱۵، پ۲۸ ع۲

رَابِيًا۔ چڑھنے والا، پھولنے والا، بلند۔ رَبُوٌّ سے جس کے معنی پھولنے کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، پ۱۳ ع۸

رَابِيَۃً۔ سخت، زائد، رُبُوٌّ سے جس کے معنی

---

[1] تفسیر لباب التاویل ج ۱ ص ۳۹۴ و ۳۹۵ طبع مصر۔

بڑھنے اور زائد ہونے کے ہیں۔ اسم
فاعل کا صیغہ واحد مؤنث ۱۹/۵ ۔

رَاَتْہُ ۔ اس (عورت) نے اس کو دیکھا، رَاَتْ
رُؤْیَۃٌ سے، ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب
ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، (ملاحظہ ہو اَرَیٰ اور
رَاَیٰ) ۱۹/۱۸

رَاَتْہُمْ ۔ اس نے ان کو دیکھا۔ اس میں ھُمْ
ضمیر جمع مذکر غائب ہے، ۱۵/۱۲

رَاجِعُوْنَ ۔ پھر جانے والے لوٹنے والے،
رُجُوْعٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، رَاجِعٌ
کی جمع بحالت رفع (ملاحظہ ہو اِرْجِعْ اور
رَجَعَ) ۱/۵ ۲/۲ ۱۷/۶ ۱۸/۳

رَاجِفَۃٌ ۔ کانپنے والی، رَجْفٌ سے اسم فاعل
کا صیغہ واحد مؤنث (ملاحظہ ہو تَرْجُفُ) ۳۰/۲

رَاحِمِیْنَ ۔ رحم والے، مہربانی کرنے والے،
رُحْمٌ اور رَحْمَۃٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع
مذکر، رَاحِمٌ کی جمع بحالت نصب و جر (ملاحظہ
ہو رُحَمَآءُ اور رَحْمَۃٌ) ۹/۸ ۱۳/۴ ۱۷/۲ ۱۸/۶

رَادٌّ ۔ رد کرنے والا، پھیرنے والا، دفع کرنے والا
رَدٌّ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو
تُرَدُّ) ۱۱/۱۲

رَادِفَۃٌ ۔ پیچھے آنے والی، رَدْفٌ سے جس
کے معنی پیچھے ہونے اور کسی کے پیچھے سواری پر
بیٹھنے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث ۳۰

رَادُّکَ ۔ تجھ کو پھیرنے والا، تجھ کو لوٹانے والا،
رَادُّ مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف
الیہ، ۲۰/۱۲

رَادُّوْہُ ۔ اس کو پھیرنے والے، اس کو لوٹا دینے
والے، رَآدٌّ رَدٌّ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع
مذکر بحالت رفع، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب رَادُّوْ
اصل میں رَادُّوْنَ تھا نون جمع اضافت کے
سبب سے گر پڑا، ۲۰/۲

رَادِّیْ ۔ پھیر دینے والے، لوٹا دینے والے، رَدٌّ
سے۔ اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت نصب و جر
یہ بھی اصل میں رَآدِّیْنَ تھا، نون جمع اضافت
کے سبب سے ساقط ہو گیا ہے، ۱۴/۱۱

رَازِقِیْنَ ۔ رزق دینے والے، روزی دینے
والے، رِزْقٌ سے۔ اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر
(ملاحظہ ہو اُرْزُقْ اور رِزْقٌ) ۷/۵ ۱۴/۲ ۱۵/۱۰
۱۸/۱۴ ۲۲/۱۱ ۲۸/۱۲

رَاسٌ ۔ سر، رُؤُوْسٌ جمع۔ ۹/۸ ۱۶/۲

رَاسِخُوْنَ ۔ ثابت قدم۔ مضبوط، پکے رُسُوْخٌ

سے جس کے معنی کسی شئے کے استوار اور مضبوط ہونے کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر پ۳ ع۹ پ۶ ع۲

رَاْسِہٖ۔ اس کا سر، رَاْس مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ۸ ع۱۵ پ۱۱ ع۱۶ پ۲۵

رَاْسِیْ۔ میرا سر، رَاْس مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، پ۱۲ ع۱۵ پ۱۶ ع۱۴

رٰسِیٰتٍ۔ ایک جگہ دھری رہنے والی، چولہوں پر قائم رہنے والی، رُسُوٌّ سے جس کے معنی کسی چیز پر قائم رہنے اور استوار ہونے کے ہیں۔ اسم فاعل کا صیغہ جمع مونث رَاسِیَۃٌ واحد، پ۲۲ ع۸

رَاشِدُوْنَ بھلائی پانے والے، راہ یافتہ رَشَدٌ اور رُشْدٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر رَاشِدٌ کی جمع (ملاحظہ ہو رَشَدًا اور رُشْدٌ) پ۲۶ ع۱۲

رَاضِیَۃً۔ پسندیدہ، خوش، من بھاتی، راضی رِضًی سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مونث، (ملاحظہ ہو رَضِی) پ۲۹ ع۵ پ۳۰ ع۱۲ و ۱۴ و ۲۶

رَاعِنَا۔ ہماری رعایت کر، ہمارا خیال رکھ، ہماری طرف کان لگا، رَاعِ مُرَاعَاۃٌ سے جس کے معنی کسی کی بات پر کان رکھنے اور دوسرے کے حق کی رعایت کرنے کے ہیں، امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر نَا ضمیر جمع متکلم، شاہ عبدالقادر صاحبؒ فرماتے ہیں یہود پیغمبر کی مجلس میں بیٹھتے اور حضرت کلام فرماتے بعضی بات جو نہ سنی ہوتی چاہتے کہ پھر تحقیق کریں تو کہتے رَاعِنَا یعنی ہماری طرف بھی متوجہ ہوں، ان سے مسلمان بھی سیکھ کر کسی وقت یہ لفظ کہتے، اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا کہ یہ لفظ نہ کہو اگر کہنا ہو تو انظرنا کہو، اس کے معنی بھی یہی ہیں اور آگے سے سنتے رہو کہ پوچھنا ہی نہ پڑے، یہود کو اس لفظ کہنے میں دغا تھی اس کو زبان دبا کر کہتے تو راعینا ہو جاتا یعنی چرواہا اور ان کی زبان میں راعنا احمق کو بھی کہتے تھے[1] پ۱ ع۱۳ پ۵ ع۴

رَاعُوْنَ۔ نباہنے والے، رعایت کرنے والے خبردار، رِعَایَۃٌ سے جس کے معنی نگہداشت رکھنے اور نگرانی کرنے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر رَاعِیٌ کی جمع بحالت رفع۔ پ۱۸ ع۱ پ۲۹ ع۷

رَاغَ۔ وہ جا گھسا، وہ پوشیدہ طور سے گیا۔ (نَصَرَ) رَوْغٌ سے جس کے معنی چپکے سے کسی چیز کی طرف ہونے اور خفیہ داؤ گھات لگانے کے ہیں، ماضی کا صیغہ، واحد مذکر غائب، پ۲۳ ع۷ پ۲۶ ع۱۹

رَاغِبٌ۔ رغبت کرنے والا، بے رغبتی کرنے والا

[1] موضح القرآن سورۂ بقر۔

رَغْبَۃٌ سے۔ اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، جب اس کے صلہ میں عَنْ آتا ہے تو اس کے معنی بے رغبتی کرنے اور منہ پھیرنے کے ہوتے ہیں، اور یہاں یہی صورت ہے (ملاحظہ ہو رُغْبٌ اور رَغَبًا) پ۱۶

رَاغِبُوْنَ ۔ رغبت کرنے والے، رَغْبَۃٌ سے، اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ رفع رَاغِبٌ کی جمع، پ۱۴ س۲۹

رَافِعُكَ ۔ تجھ کو اٹھانے والا، رَافِعٌ رَفْعٌ سے جس کے معنی اٹھانے اور بلند کرنے کے ہیں اسمِ فاعل کا صیغہ واحد مذکر مضاف ہے، كَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ، واضح رہے کہ یہاں رفع سے رفع حقیقی جسمانی مراد ہے، رفع روحانی یا رفع درجات مراد نہیں ہے، جیسا کہ منکرین نزول مسیح (علیہ الصلوۃ والسلام) کا خیال ہے، کیونکہ یہود مدعیانِ قتلِ مسیح ہیں اور آیت ان کے اس زعمِ باطل کی تردید میں ہے اور ظاہر ہے کہ اگر رفع روحانی یا رفع درجات مراد لیا جائے تو تردید کے کوئی معنی ہی نہیں رہتے کیونکہ رفع روحانی یا رفع درجات اور قتل میں باہم کوئی منافات نہیں ہے، پس قتل کی تردید اس بات کے کہنے سے کس طرح ہو سکتی ہے کہ ان کی روح آسمان پر اٹھالی گئی یا ان کے درجے بلند ہوگئے، ہاں اگر رفع حقیقی جسمانی مراد لیا جائے تو بلا اشتباہ ان کے ادعاءِ قتل کی واشگاف تردید ہے کہ انھوں نے تو داؤ لگایا ہی ہے مگر ہم تم کو صحیح وسالم مع جسم کے اٹھالیں گے، آیت کو بغور پڑھئے کہ رفع حقیقی جسمانی یعنی صحیح وسالم زندہ وسلامت آسمان پر اٹھالینے کے علاوہ دوسرے معنی مناسب ہو ہی نہیں سکتے، ارشاد ہے۔

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ ۔

اور خفیہ تدبیر کی انھوں نے اور خفیہ تدبیر کی اللہ نے اور اللہ تدبیر کرنیوالوں میں بہتر ہے، جس وقت کہا اللہ نے اے عیسیٰ میں تجھ کو بھر لونگا اور اٹھا لونگا اپنی طرف

شاہ عبدالقادر صاحبؒ فرماتے ہیں۔

"یہود کے عالموں نے اس وقت کے بادشاہ کو بہکایا کہ یہ شخص ملحد ہے، توریت کے حکم سے خلاف بتاتا ہے، اس نے لوگ بھیجے کہ ان کو پکڑ لاویں جب وہ پہنچے۔ حضرت عیسیٰؑ کے یار سرک گئے۔ اس شتابی میں حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو آسمان پر اٹھا لیا اور ایک صورت ان کی رہ گئی اسی کو پکڑ لائے پھر سولی پر چڑھایا"[1] ۔

[1] موضح القرآن سورۂ آل عمران

غور کیجئے یہود کی خفیہ تدبیر تو یہ تھی کہ انھوں
نے مکر و فریب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو
سولی پر چڑھانا چاہا اور حق تعالیٰ کی خفیہ تدبیر یہ
تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو زندہ و سلامت
آسمان پر اٹھا لیا اور جو شخص سب سے پہلے
ان کو گرفتار کرنے آیا تھا اسی پر حضرت عیسیٰ
علیہ السلام کی شبیہ ڈال دی اور یہود نے حضرت
عیسیٰ علیہ السلام کے شبہ میں اسی شخص کو سولی
پر چڑھا دیا، اب یہاں کس طرح سے رفعِ جسمانی
حقیقی کے علاوہ کچھ اور مراد لیا جا سکتا ہے، پ۳/۱۴

رَافِعَةٌ۔ بلند کرنے والی، اونچا کرنے والی رَفْعٌ
سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مونث، پ۲۷/۱۴

رَأْفَةٌ۔ ترس، مہربانی، شفقت، رحمت، نرمی،
رَأَفَ یَرْأَفُ کا مصدر ہے۔ پ۱۸ پ۲۷

رَاقٍ۔ افسوں کنندہ، جھاڑنے پھونکنے والا رُقْیَةٌ
سے جس کے معنی افسوں اور جھاڑ پھونک کرنے کے
ہیں۔ اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، پ۲۹/۱۷

رَاٰکَ۔ اس نے تجھ کو دیکھا، رَأٰی رُؤْیَةٌ سے ماضی
کا صیغہ، واحد مذکر غائب، کَ ضمیر واحد مذکر حاضر
(ملاحظہ ہو اَرَیٰ اور رَاٰی) پ۱/۲

رَاکِعًا۔ جھکنے والا، عاجزی کرنے والا۔ سجدہ
کرنے والا، رکوع کرنے والا، رُکُوْعٌ سے جس کے
معنی انحنا یعنی جھکنے کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ
واحد مذکر، رکوع کا استعمال کبھی تو نماز کی ہیئتِ
مخصوصہ کے لئے ہوتا ہے، اور کبھی تواضع و تذلل
یعنی عاجزی اور گڑگڑانے کے لئے خواہ کسی عبادت
میں ہو یا غیر عبادت میں، پ۲۳

رَاکِعُوْنَ۔ رکوع کرنے والے، عاجزی کرنیوالے
جھکنے والے۔ رُکُوْعٌ سے اسم فاعل کا صیغہ، جمع
مذکر بحالتِ رفع، رَاکِعٌ کی جمع، پ۶/۱۴ پ۱۱

رَاکِعِیْنَ۔ جھکنے والے، رکوع کرنے والے،
رُکُوْعٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالتِ نصب و جر
رَاکِعٌ کی جمع، پ۱/۵ پ۳/۱۴

رَانَ۔ اس نے زنگ پکڑ لیا۔ (ضَرَبَ) رَیْنٌ سے
جس کے معنی زنگ آلودہ ہونے اور میل پکڑنے کے
ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ۳۰/۸

رَاَوْا۔ انھوں نے دیکھا، رُؤْیَةٌ سے ماضی کا صیغہ
جمع مذکر غائب، رَاَوْا اصل میں رَاَیُوْا تھا، ی
متحرک ماقبل اس کا مفتوح اس یاء کو الف سے
بدلا، اب الف اور واو دو ساکن جمع ہوئے، الف
کو حذف کر دیا۔ پ۹ پ۱۶/۸ پ۲۳/۵ پ۲۴/۱۴ پ۲۵/۶
پ۲۸/۱۲ پ۲۹/۱۲

رَاَوْا۔ انھوں نے دیکھا، رُؤْیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب پ۲/۲ پ۱۱ پ۱۴ پ۲۰ پ۲۲

رَاوَدْتُّنَّ۔ تم نے گفت وشنید کی، تم نے بہلایا، تم نے پھسلایا، مُرَاوَدَۃٌ سے جس کے معنی دوسرے کو کسی کام پر جس کے کرنے کا وہ ارادہ نہ رکھتا ہو، پھسلانے، آمادہ کرنے، اور اس کے متعلق گفت وشنید کرنے کے ہیں ماضی کا صیغہ جمع مونث حاضر۔ راغب لکھتے ہیں۔

مراودت یہ ہے کہ تمہاری اپنے	والمراودۃ ان تنازع
غیر سے ارادہ میں نزاع ہو اور تم	غیرك فی الارادۃ
اس بات کی خواہش کرو جو وہ نہیں	فتريد غير ما يريد
چاہتا یا تم بسہولت اس چیز کے	اوترود غير ما
طالب ہو جس کا وہ بسہولت طالب ہو	يرود۔

پ۱۲

رَاوَدَتْنِیْ۔ اس نے مجھے پھسلایا، اس نے مجھ سے گفت وشنید کی، اس نے مجھ سے خواہش کی رَاوَدَتْ مُرَاوَدَۃٌ سے۔ ماضی کا صیغہ واحد مونث غائب۔ ن وقایہ ی ضمیر واحد متکلم، پ۱۲

رَاوَدْتُّهٗ۔ میں نے اس کو پھسلایا، میں نے اس سے گفت وشنید کی رَاوَدْتُ مُرَاوَدَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، پ۱۲ و۱۳/۱

رَاوَدَتْهُ۔ اس (عورت) نے اس کو پھسلایا اس نے اس کو بہلایا۔ اس میں ہ ضمیر واحد مذکر غائب ہے پ۱۲

رَاوَدُوْهُ۔ انھوں نے اس سے گفت وشنید کی انھوں نے اس کو پھسلایا۔ رَاوَدُوْا مُرَاوَدَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، پ۲۷

رَاَوْكَ۔ انھوں نے تجھ کو دیکھا، اس میں كَ ضمیر واحد مذکر حاضر ہے (ملاحظہ ہو رَاَوْا) پ۱۹

رَاَوْهُ۔ انھوں نے اس کو دیکھا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے پ۱۲ پ۲۶ پ۲۹

رَاَوْهَا۔ انھوں نے اس کو دیکھا، اس میں هَا ضمیر واحد مونث غائب ہے، پ۲۹

رَاَوْهُمْ۔ انھوں نے ان کو دیکھا، اس میں هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے پ۲۸

رَاٰهُ۔ اس نے اس کو دیکھا۔ رَاٰی رُؤْیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو رَآی) پ۱۸ پ۱۹ پ۲۲ پ۲۳ پ۲۴ پ۳۰

رَاٰهَا۔ اس نے اس کو دیکھا۔ اس میں هَا ضمیر

واحد مؤنث غائب ہے، پ۱۹ ع۲

رَاٰی۔ دیکھنا، رَاٰی یَرٰی کا مصدر ہے نیز غلبۂ ظن کی بنا پر نقیضین[۱] میں سے کسی ایک پر نفس کے اعتقاد کا نام "رائے" ہے، اس کی جمع آراء ہے۔ [۲]

رَاٰی۔ اس نے دیکھا، رُؤْیَۃٌ اور رَاْیٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، رُؤْیَۃٌ کے معنی ادراکِ مرئی کے ہیں اور نفس کے مختلف قوی کے اعتبار سے اس کی مختلف قسمیں ہیں۔ اول آنکھ سے یا ایسی چیز سے جو آنکھ کے قائم مقام ہو دیکھنا جیسے لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ (البتہ تم دیکھو گے دوزخ کو پھر دیکھو گے دوزخ کو یقین کی آنکھ سے) یعنی بچشم سر دیکھو گے۔ اور فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ (پس اب اللہ دیکھے گا تمہارے کام) آنکھ کے دیکھنے سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ذرہ ذرہ کو دیکھتا ہے مگر اس کو آنکھوں کی احتیاج نہیں، دوسرے بذریعہ وہم و تخیل جیسے وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا اور کبھی تو دیکھے جس وقت جان لیتے ہیں کافروں کی) کہ یہاں دیکھنے سے اس وقت کا خیال کرنا مراد ہے تیسرے بذریعہ تفکر جیسے إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ (میں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے) یعنی میں اس تفکر میں ہوں جس میں تم نہیں۔ چوتھے بذریعہ عقل جیسے مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ (جھوٹ نہیں کہا دل نے جو دیکھا) کہ یہاں رویت بذریعہ عقل ہے۔ نیز جب رَاٰی کا تعدیہ دو مفعولوں کی طرف ہوگا تو علم کے معنی کا مقتضی ہوگا جیسے وَيَرَى الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ (اور جانتے ہیں وہ لوگ کہ جن کو علم دیا گیا ہے)[۲] پ۲۲ ع۵

رَاَیْتُ۔ میں نے دیکھا۔ رُؤْیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم۔ یہاں خواب میں دیکھنے کا مذکور ہے، بیداری کی حالت میں دیکھنے اور بحالتِ خواب دیکھنے میں یہ فرق ہے کہ بیداری میں حقیقتاً بذریعہ بصر اس شئے کا ادراک ہوتا ہے اور خواب میں اس شئے کا تصور قلب میں ہوتا ہے اس توہم پر کہ بذریعہ حاسۂ بصر اس کا ادراک ہو رہا ہے۔ حالانکہ

---

[۱] کلام میں وہ دو باتیں کہ ایک کے صحیح ہوتے دوسری صحیح نہ ہو سکے۔ نقیضین کہلاتی ہیں۔ مثلاً کسی ایک ہی چیز کے متعلق یہ کہنا کہ وہ سپید ہے اور وہ سپید نہیں باہم نقیضین ہیں۔

[۲] مفردات امام راغب۔

بذریعہ حاسہ ادراک نہیں ہوتا۔"[۱] پ ۱۲/۱۱

رَاَیْتَ۔ تونے دیکھا، رُؤْیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، اَرَاَیْتَ (کیا تونے دیکھا۔ بھلا تونے دیکھا) میں الف اولیٰ بلفظِ استفہام تقریر و تنبیہ کے لئے ہے محض استفہام کے لئے نہیں ہے۔"[۲] امام راغب لکھتے ہیں۔

"اَرَاَیْتَ، اَخْبِرْنِیْ (تو مجھے بتا) کے قائم مقام ہوتا ہے اور اس پر ک داخل ہوتا ہے اور تا کو تثنیہ، جمع اور تانیث میں اسی کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور تغیر و تبدل کاف پر ہوتا ہے تا پر نہیں ہوتا، ارشاد ہے اَرَاَیْتَکَ ھٰذَا الَّذِیْ، قُلْ اَرَاَیْتَکُمْ" پ ۹ پ ۱۴/۷ پ ۱۵/۱۲ پ ۶/۸ پ ۱۹/۲و۱۸ پ ۲۰/۱۹ پ ۲۴ پ ۲۷ پ ۳۰ (۲۱و۲۲و۲۵)

رَاَیْتَکَ۔ تونے دیکھا، یہاں اَرَاَیْتَکَ (آیا تونے دیکھا، بھلا دیکھ تو) ہے، اس میں الف بلفظ استفہام تنبیہ کے معنی میں ہے اور رَاَیْتَ رُؤْیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر ہے اور کَ ضمیر واحد مذکر حاضر خطاب کے لئے ہے۔ امام اللغۃ علامہ ابنِ خالویہ لکھتے ہیں کہ

"اس کاف میں جو تا کے بعد ہے تین اقوال ہیں کسائی کے قول میں موضع نصب میں ہے اس کی تقدیر اَرَاَیْتَ نَفْسَکَ ہے، اور فراء کے قول میں موضع رفع میں ہے اور تقدیر اَرَاَیْتَ اَنْتَ نَفْسُکَ ہے اور اہل بصرہ کے قول میں کاف کا کوئی موضع نہیں بلکہ تاکید خطاب کے لئے آیا ہے جس طرح کہ ذَاکَ اور ذَالِکَ کہا جاتا ہے"[۳] پ ۱۵

رَءَیْتُکُمْ۔ تم نے دیکھا، یہاں اَرَءَیْتُکُمْ (دیکھو تو، کیا دیکھا ہے تم نے) ہے اس میں ہمزہ بلفظِ استفہام تنبیہ کے معنی میں ہے، رَءَیْتَ صیغہ واحد مذکر حاضر ہے اور کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، خطاب جمع کے لئے ہے۔ علامہ ابن الشجری نے امالی میں تصریح کی ہے کہ اَرَاَیْتُکُمْ وغیرہ میں جو تا کو فتحہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ تذکیر، تانیث کی اصل ہے اور توحید تثنیہ اور جمع کی پس جب صیغہ واحد مذکر حاضر کو فتحہ تا سے مخصوص کر کے تا کو خطاب سے مجرد کر لیا گیا اور کاف اور جو کاف پر زیادہ

---

[۱] التحفۃ المتلامیہ فی الفروق الاصطلاحیہ للشیخ علی اکبر النجفی طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن سنہ ۱۳۴۰ھ

[۲] کتاب اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن الکریم لابن خالویہ ص ۲۰۱ طبع دار الکتب المصریہ سنہ ۱۳۶۰ھ

[۳] اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن الکریم ص ۲۰۲۔

Seminar
Religion & Culture

کیا گیا ہے مثلاً کُمَا، کُمْ اور کُنَّ خطاب کے لئے
مستقل ہو گیا تو تار کے لئے حرکت اصلیہ کو لازم
کر دیا گیا، [1] پ ۱۰ و ۱۱

رَءَیْتُمْ - تم نے دیکھا، رُؤْیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ
جمع مذکر حاضر اَرَءَیْتُمْ اور اَفَرَءَیْتُمْ میں ہمزہ
بلفظ استفہام تنبیہ کے معنی میں ہے، پ ۱۱ پ ۱۰ و ۱۱
پ ۲ و ۸ پ ۹ پ ۱۰ پ ۲۲ پ ۲۴ پ ۲۵ پ ۲۶ پ ۲۷ و ۱۵ پ ۲۹

رَاَیْتُمُوْہُ - تم نے اس کو دیکھا، اس میں واو
اشباع کا اور ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، [illegible]

رَاَیْتَہٗ - تو نے اس کو دیکھا، اس میں ہٗ ضمیر واحد
مذکر غائب ہے (ملاحظہ ہو رَاَیْتَ) [illegible]

رَاَیْتَھُمْ - تو نے ان کو دیکھا، اس میں ھُمْ
ضمیر جمع مذکر غائب ہے، [illegible]

رَاَیْتُھُمْ - میں نے ان کو دیکھا۔ اس میں ھُمْ
ضمیر جمع مذکر غائب ہے (ملاحظہ ہو رَاَیْتُ) [illegible]

رَاَیْنَہٗ - ان عورتوں نے اس کو دیکھا رَاَیْنَ
رُؤْیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مؤنث غائب۔ ہٗ
ضمیر واحد مذکر غائب، [illegible]

فصل الباء الموحدة

رَبٌّ - پروردگار، مالک، صاحب، یہ اصل میں
رَبَّ یَرُبُّ کا مصدر ہے جس کے معنی تربیت
کے ہیں اور پھر مبالغہ کے لئے عَدْلٌ کی طرح
بطور وصف استعمال کیا جانے لگا اور بعض کا
قول ہے کہ یہ بَرٌّ کی طرح صفت مشبہ کا صیغہ ہے
امام راغب کا بیان ہے کہ رَبٌّ مصدر ہے جو فاعل
کے لئے مستعار ہے، تربیت کی تعریف امام موصوف
نے ان الفاظ میں کی ہے۔ ھو انشاء الشیٔ حالا
فحالا الی حد التمام[2] یعنی کسی چیز کو یکے بعد
دیگرے ایک حالت سے دوسری حالت میں
اس طرح نشو و نما دیتے رہنا کہ حد کمال تک
پہنچ جائے، اس معنی کے اعتبار سے امام حلیمی نے
جو رَبٌّ کی تعریف کی ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں
درج ذیل ہے، امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات
میں رقمطراز ہیں۔

قال الحلیمی رحمہ اللہ	حلیمی رحمہ اللہ نے رب کے
فی معنی الرب ھو	معنی میں فرمایا ہے کہ رب
المبلغ کل ما ابدع	وہ ہے جو ہر اس چیز کو جسے
حد کمالہ الذی	اس نے ایجاد کیا ہے کمال
قدرہ لہ فھو یسل	کی اس حد تک پہنچا دیتا ہے

[1] ملاحظہ ہو المعلی ابن العجزی ج ۱ ص ۲۹۹ - طبع دائرۃ المعارف ۱۳۳۹ھ [2] مفردات۔

النطفة من الصلب ثم یجعلها علقة ثم العلقة مضغة ثم یخلق المضغة عظاما ثم یکسو العظم لحما ثم یخلق فی البدن الروح ویخرجه خلقا آخر وهو صغیر ضعیف فلا یزال ینمیه و ینشیه حتی یجعله رجلا ویکون فی بدء امره شابا ثم یجعله کهلا ثم شیخا وهکذا کل شیء خلقه فهو القائم علیه والمبلغ ایاه الحد الذی وضعه وجعله نهایة ومقدارا له[1]

کہ جو حد اس چیز کے لئے اس نے مقدر فرمادی ہے، پس وہ نطفہ کو پشت سے نکالتا، پھر اس کو پھٹکی بناتا پھر پھٹکی کو بوٹی پھر بوٹی سے ہڈیاں پیدا کرتا پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھاتا پھر بدن میں جان ڈالتا اور اس کو ایک نئی صورت میں جبکہ وہ ناتواں بچہ ہوتا ہے نکال کھڑا کرتا اور برابر اس کی نشوونما کرتا رہتا ہے یہاں تک اس کو پورا مرد کر دیتا ہے اور ابتدا رحال میں وہ جوان ہوتا ہے پھر اس کو ادھیڑ پھر بوڑھا بنا دیتا ہے اور چیز بھی اس نے پیدا کی اس کا یہی طور ہے پس رب وہ ہے جو اس کا نگراں اور اس حد پر اس کو پہنچانے والا جو حد کہ اس کے لئے اس نے مقرر کی اور اس کی نہایت و مقدار قرار دی ہے۔

ابن خالویہ لغوی نے تصریح کی ہے کہ رب کے معنی لغت میں سید اور مالک کے ہیں[2]۔ امام بیہقیؒ کتاب الاسماء والصفات میں امام خطابیؒ سے ناقل ہیں کہ

بہت سے مفسرین سے آیہ کریمہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کی تفسیر میں مروی ہے کہ رب کے معنی سید (سردار) کے ہیں اور یہ معنی اس وقت بن سکتے ہیں جب کہ ہم عالمین کے معنی جماد کو چھوڑ کر ممیزین یعنی ذوی العقول کے قرار دیں کیونکہ جس طرح سید الناس کہا جاتا ہے اس طرح سید الشجر والجبال وغیرہ کہنا درست نہیں ہے اور اسی معنی میں ارشادِ الٰہی ہے۔ اِرْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ (پھر جا اپنے آقا کے پاس اور اس سے پوچھ کیا حقیقت ہے ان عورتوں کی جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے) کہ یہاں رب بمعنی سید (آقا، خاوند) ہے، اور بعض کا قول ہے کہ رب بمعنی مالک ہے اور اس اعتبار سے اضافت بربنائے عموم درست ہے اور بہت سے علماء اس طرف گئے ہیں کہ اسم عالم تمام کائنات کے لئے بولا جاتا ہے، ان کا استدلال اس آیت کریمہ

[1] کتاب الاسماء والصفات ص ۲۶ طبع انوار احمدی الہ آباد [2] کتاب اعراب ثلاثین سورة من القرآن الکریم ص ۲۱۔

سے ہے۔ قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ (بولا فرعون کیا معنی جہان کا صاحب۔ موسیٰ نے کہا صاحب آسمان وزمین کا اور جو ان کے بیچ ہے اگر تم یقین کرو) [1]

امام راغب نے لکھا ہے کہ

"رَبّ مطلقاً (یعنی جب بغیر کسی شرط کے استعمال ہو) سوائے اللہ تعالیٰ کے جو مصالح موجودات کا کفیل ہو اور کسی کے لئے نہیں بولا جاتا چنانچہ ارشاد ہے بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ (دیس ہے پاکیزہ اور رب ہو گناہ بخشتا) اور اسی طرح اللہ کا قول ہے وَلَا يَأْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا (اور نہیں لائق کہ تم کو حکم کرے کہ ٹھیراؤ فرشتوں کو اور نبیوں کو رب) یعنی انھیں معبود قرار دو اور خالق اور مسبب الاسباب اور بندوں کی مصلحتوں کا کفیل سمجھو۔

اور اضافت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور غیر اللہ کے لئے بھی آتا ہے جیسے ارشاد ہے رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (سارے جہاں کا صاحب) اور رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ (صاحب تمہارا اور صاحب تمہارے اگلے باپ دادوں کا) اور رب الدار (گھر والا) اور رب الفرس (گھوڑے والا) ان دونوں کے مالک کے لئے بولا جاتا ہے اور اسی معنی میں ارشاد الٰہی ہے اُذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ فَاَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ (میرا ذکر کیجیو اپنے بادشاہ کے پاس سو بھلا دیا شیطان نے ذکر کرنا اپنے بادشاہ سے) اور ارشاد ہے اِرْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ (پھر جا اپنے بادشاہ کے پاس)

آیت کریمہ (قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ (اس نے کہا۔ خدا کی پناہ وہ مالک ہے میرا اچھی طرح رکھا ہے مجھکو) میں بعض کا قول ہو کہ رب سے اللہ تعالیٰ مراد ہے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ بادشاہ مراد ہے جس نے ان کی تربیت کی تھی، اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قول کے زیادہ مناسب پہلے معنی ہیں۔" اَرْبَابٌ جمع

ب ۱	۱و۱۵و۱۶
ب ۳	۲و۱۲و۱۳
ب ۶	۸و۹
ب ۷	۱۱و۱۵
ب ۸	۷و۱۴و۱۵و۱۶
ب ۹	۳و۴و۷و۸و۹
ب ۱۱	۵و۶و۹
ب ۱۲	۲و۱۴
ب ۱۳	۵و۸و۱۸
ب ۱۴	۳
ب ۱۵	۳و۹و۲و۱۴
ب ۱۶	۲و۶و۱۱و۱۲و۱۳و۱۵و۱۶
ب ۱۷	۲و۵و۶و۷
ب ۱۸	۲و۳و۵و۶
ب ۱۹	۱و۶و۷و۹و۱۰و۱۱و۱۲و۱۳و۱۴و۱۵و۱۶و۱۷
ب ۱۹	۱۸
ب ۲۰	۲و۵و۶و۷و۸
ب ۲۱	۱۴
ب ۲۲	۸
ب ۲۳	۲و۵و۷و۸و۹و۱۲و۱۴

[1] کتاب الاسماء والصفات ص ۵۶۔

پ ۲۴: ۵ و ۱۲ و ۱۶ — پ ۲۵: ۱۱ و ۱۳ و ۱۴ و ۲۰ — پ ۲۶: ۲ و ۱۸ — پ ۲۷: ۷ و ۱۱ و ۱۶ — پ ۲۸: ۵ و ۱۳ و ۲۰

پ ۲۹: ۶ و ۸ و ۹ و ۱۰ و ۱۳ — پ ۳۰: ۲ و ۶ و ۸ و ۳۱ و ۳۸ و ۳۹

رَبَّا ۓ (ملاحظہ ہو اَرْبَا)

رِبًا۔ بیاج، سود، امام راغب لکھتے ہیں۔

"راس المال (اصل سرمایہ) پر جو زیادتی ہو وہ "ربا" ہے لیکن شرع میں وہ اس زیادتی کے ساتھ مخصوص ہے جو ایک خاص ہی طریقہ پر ہو اور دوسری طرح نہ ہو"

حافظ ابنِ حجر عسقلانی فرماتے ہیں۔

"الربا مقصور ہے اور مد بھی بیان کیا گیا ہے جو شاذ ہے یہ ربا یربو سے ہے اور الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے لیکن قرآن کے رسم الخط میں واو کے ساتھ واقع ہے اور ربا کی اصل زیادت ہے خواہ نفس شے میں ہو جیسے ارشادِ الٰہی ہے اَهْتَزَّتْ وَرَبَتْ (وہ لہلہائی اور بڑھی) یا مقابلہ میں جیسے دو درہم کے بدلہ ایک درہم اب بعض کا قول تو یہ ہے کہ یہ دونوں معنی میں حقیقت ہے اور بعض کہتے ہیں کہ پہلے میں حقیقت ہے اور دوسرے میں مجاز، ابنِ سریج کہتے ہیں کہ یہ دوسرے معنی میں حقیقتِ شرعیہ ہے، نیز ربا کا اطلاق ہر بیع حرام پر بھی ہوتا ہے"[1]

حضرت الاستاذ فقیہ النفس علامہ محمود حسن خان صاحب ٹونکی صاحب معجم المصنفین فرماتے ہیں۔

"ربا اور ربیع لغاتِ عرب سے ہے، جب تک کوئی اصطلاح شرعی توقیفی خلاف لغت کے مغیر نہ ہو، کتاب وسنت کے معنی لغتِ عرب سے معلوم ہوتے ہیں "ربا" لغۃً زیادۃ ہے اور لسان العرب وغیرہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ حقیقت "بیع" کی معاہدہ فی تعاوض الاموال ہے پس لغوی اعتبار سے ربا کی تعریف یہ ہے کہ تعاوض الاموال کے معاہدہ میں عوضین متماثلین سے ایک عوض کا دوسرے عوض پر زیادت مذکور ہونا، یا عوضین میں سے عوض دین پر زیادت مذکور ہونا، اور جب معاہدہ میں زیادت مذکور ہوئی تو اس زیادت کا نام عرب میں "ربا" ہے وھو المتعامل فیما بین الناس اور معاہدہ میں مذکور ہونے کی وجہ سے اس کو مشروط کہا جائے گا کسائر شروط البیع والمعاوضات"

باجماعِ امت ربا دو قسم ہے ایک حسی جس کو کتاب اللہ نے لاتاکلوا الربا اضعافا مضاعفۃ میں بیان فرمایا ہے اور حدیث صحیح الفضل ربا میں اسی حسی ربا کو بیان کیا گیا ہے اور حدیث فلا یاخذن الا مثلا بمثل (بروایۃ مسلم عن فضالہ) اور حدیث لاتاخذوا الدینار بالدینارین

[1] فتح الباری ج ۴ ص ۲۶۴ طبع میریہ مصر

ولا الدرهم بالدرهمین (طبرانی عن ابن عمر)
بھی بحق ربا کتاب اللہ کی تفسیر ہے اور تفسیر اضعافا
کے تحت داخل ہے، حدیث بخاری بھی رباحسی کی
مفسر ہے الذهب بالذهب مثلاً بمثل
والورق بالورق مثلاً بمثل (رواه البخاری)
یعنی فضل ربا ہے پس اس حسی ربا میں شارع نے لغوی
معنی میں اور شرعی معنی میں مغائرت پیدا نہیں فرمائی
ہے۔ پس حسی رباشرعی کی بھی وہی تعریف ہے جس
کی عربی عبارت یہ ہے ھو الفضل الخالی عن
العوض المشروط فی البیع۔

دوسرا رباحکمی ہے کہ حسًا تفاضل عوضین میں نہیں پر
لیکن شارع نے سدًا لباب الربا صورتِ تماثل کو بھی
رباحسی کے حکم میں قرار دیا ہے جبکہ معاوضہ یدًا بید
نہ ہو کیونکہ مادہ ربا کا تاخیر و تاجیل ہے اور بغیر تاخیر
کے فضل غیر متعامل ہے اسی معنی پر محمول ہے حدیث
مسلم کی لاربا فیما کان یدًا بید فضل حسی کا دروازہ
اسی رباحکمی سے مفتوح ہے کہ تجارت حاضرہ میں
فضل حسی عادۃً ناممکن ہے، اس رباحکمی کو شارع نے
حدیث نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن بیع دینا
اور حدیث الذهب بالورق ربًا الا ھاءَ وھاءَ
الحدیث فی الاشیاء الستۃ المنصوصہ میں بیان فرمایا
ہے اس رباشرعی پر لغوی ربا صادق نہیں ہے۔[1]

حضرت الاستاذ مدظلہم نے ربوا کے موضوع پر
ایک مستقل رسالہ تصنیف فرمایا ہے، جس میں ربا
کی حقیقتِ شرعیہ پر نہایت مجتہدانہ اور سیر حاصل
بحث ہے، اس عہدِ ضلالت میں جبکہ ربوا کی
حقیقتِ شرعیہ کے سمجھنے میں عوام تو عوام خواص
کو غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں اس رسالہ کا بغور
مطالعہ ان تمام غلط فہمیوں کے ازالہ کا ضامن ہے[2]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ
میں رقمطراز ہیں۔

"ربا وہ قرض ہے جو اس شرط پر ہو کہ قرضدار قرضخواہ کو

---

[1] ملاحظہ ہو صدارت کے استفتا کا جواب مسئلہ ربوا میں" ص ۱۱۳ و ۱۱۴

[2] اس رسالہ کی تصنیف دفتر صدارت عالیہ محکمہ امور مذہبی حیدرآباد دکن سے شائع کئے ہوئے ایک استفتاء کے جواب میں جو ربا القرض کے متعلق ہے عمل میں آئی ہے اور چونکہ جواب مجتہدانہ مطلوب تھا اس لئے حسب فرمائش سلیقۂ اجتہاد ہی پر جواب تحریر کیا گیا۔ حضرت الاستاذ مدظلہم العالی کی فقہ و اصول میں جو مجتہدانہ شان ہے اس کا اندازہ علماء کو اس کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے یہ رسالہ (۱۳۴) صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۳۴۵ھ میں دستی پریس کے ذریعہ طبع ہو کر حیدرآباد دکن سے شائع ہو چکا ہے۔

جتنا لیا ہے اس سے زیادہ یا اس سے اچھا واپس ادا کرے ؎۱
اور بعد چند سطور کے ارقام فرماتے ہیں۔

"واضح رہے کہ ربا کی دو صورتیں ہیں، حقیقی اور محمول بر حقیقی لیکن حقیقی ربا تو وہ دیون میں ہوتا ہے اور ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اس میں معاملات جس غرض کے لئے وضع کئے گئے ہیں وہ غرض الٹ جاتی ہے، لوگ زمانۂ جاہلیت میں اس کے اندر بہت منہمک تھے، اس کے باعث وسیع جنگیں پیش آئی ہیں اور یہ تھوڑا سا بھی بہت کی دعوت دیتا ہے پس اس کا دروازہ سرے سے مسدود کرنا واجب ہے چنانچہ قرآن میں اس کے بارے میں جو اترنا تھا اتر چکا۔

دوسرے ربا الفضل (یعنی تجارت میں بڑھتی لینا) اور اصل اس بارے میں حدیث مستفیض الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثل سواء بسواء يدا بيد فاذا اختلف الاصناف فبيعوا كيف شئتم اذا كان يدا بيد (بیچو سونے کو سونے سے اور چاندی کو چاندی سے اور گیہوں کو گیہوں سے اور جو کو جو سے اور کھجور کو کھجور سے اور نمک کو نمک سے جتنا ایک اتنا دوسرا برابر سرابر ہاتھوں ہاتھ اور جب جنسیں مختلف ہوں تو جس طرح چاہو بیچو بشرطیکہ ہاتھوں ہاتھ ہو) ہے۔ یہ "ربا الفضل" ربا حقیقی سے مشابہت کی بنا پر تغلیظاً ربا سے موسوم ہے، جس طرح کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے منجم کو کاہن فرمایا ہے، اور اسی سے لا ربا الا فی النسیئة (ربا نہیں مگر نسیہ یعنی دین میں) کے معنی سمجھے جا سکتے ہیں پھر شریعت میں ربا کا استعمال اس معنی میں کثرت سے ہوا یہاں تک کہ وہ اس معنی میں بھی حقیقتِ شرعیہ بن گیا واللہ اعلم" ؎۲

ایامِ جاہلیت میں ربا کا جس طور معمول تھا اس کے متعلق امام مالک، زید بن اسلم سے جو مشہور تابعی ہیں ناقل ہیں کہ انھوں نے بیان کیا جاہلیت میں ربا یہ تھا کہ ایک شخص کا دوسرے شخص کے ذمہ ایک مدت معینہ کے لئے حق

؎۱ حضرت الاستاذ فرماتے ہیں "یہ تعریف ربا کی بالکل صحیح اور جامع تفسیر ہے اس لئے کہ قرض لغت عرب میں دین ہے، لسان العرب، صحاح، مصباح وغیرہ سے ثابت ہو چکا ہے اور جملہ دیون کو لفظِ قرض شامل ہے" ص ۱۴۳۔

؎۲ حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۰۶ مطبع مصر ۱۳۲۲ھ

(واجب الاداء) ہوتا پس جب مدت پوری ہو جکتی تو کہتا کہ تو ادا کرتا ہے یا زیادہ کرتا ہے اب اگر وہ ادا کر دیتا تو اس کو لے لیتا ورنہ اپنا حق زیادہ کر دیتا اور مہلت میں تاخیر کر دیتا [۱] امام طبری نے عطا اور مجاہد سے اسی کے قریب قریب روایت کیا ہے۔ نیز قتادہ سے نقل کیا ہے کہ جاہلیت میں ربا کا یہ دستور تھا کہ ایک شخص مدت معینہ پر سودا بیچتا جب مدت پوری ہو جاتی اور خریدار کے پاس ادا کرنے کے لئے نہ ہوتا تو یہ رقم زیادہ کر دیتا اور مدت کو موخر کر دیتا [۲]۔ ۲۷

رِبَاطِ۔ باندھنا، سرحد پر چوکی دینا، یہ باب مفاعلت کا مصدر ہے اور مجرد میں رَبَطَ کا بھی، جس کے معنی مضبوط اور مستحکم باندھنے کے ہیں، نیز اسم بھی آتا ہے اس شئے کے معنی میں جس کے ساتھ دل یا گھوڑے باندھے جائیں اور اس جگہ کے معنی میں بھی جہاں دشمن کے دفاع کے لئے لشکر کا پڑاؤ ہوتا ہے جیسے مورچہ اور چھاؤنی۔ یہاں اس کا استعمال مصدری کے معنی میں بمعنی گھوڑے باندھنے کے ہوا ہے (ملاحظہ ہو رابطوا) ۲۰۰

رُبٰعَ۔ چار چار، یہ اَرْبَعٌ اَرْبَعٌ سے معدول ہے اور چونکہ اس میں دو عدل ہیں ایک اس کے صیغہ کی دوسری اس کی تکرار سے اس لئے غیر منصرف ہے یہ علامہ زمخشری کی رائے ہے اور قاضی بیضاوی کے خیال میں بنا بر عدل و وصف غیر منصرف ہے وہ کہتے ہیں رباع بمعنی بر صفت ہے اگرچہ اس کی اصل وصف پر مبنی نہیں ہے [۳]۔ ۴/ ۳

رَبَّانِیُّوْنَ۔ زاہد، خدا پرست، درویش، اللہ والے مربی، مرشد خلق، رَبَّانِیٌّ کی جمع، بحالت رفع، امام راغب لکھتے ہیں۔

"رَبَّانِیُّ کے متعلق بعض کا قول ہے کہ وہ رَبَّان کی طرف منسوب ہے اور لفظ فعلان فعل (بکسر العین) سے بنایا جاتا ہے جیسے عطشان اور سکران اور قلت کے ساتھ فَعَلَ (بفتح العین) سے بھی بنتا ہے چنانچہ نعسان آیا ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ رَبٌّ کی طرف منسوب ہے جو مصدر ہے اور ربانی وہ ہے کہ جو علم کی پرورش کرے جیسے کہ حکیم ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ منسوب تو اسی کی طرف ہے جو مصدر ہے اور اس کے معنی ہیں اس

---

[۱] موطا مع شرح تنویر الحوالک ج ۲ ص ۱۶۳ طبع دار احیاء الکتب العربیہ ۱۳۴۳ھ [۲] فتح البادی ج ۴ ص ۲۶۴

[۳] الکمالین علی الجلالین لشیخ سلام اللہ ص ۱۳ ضمیمہ ص ۶۷ طبع نولکشور

شخص کے جو اپنے نفس کی علم کے ذریعہ تربیت کرے
اور حقیقت میں یہ دونوں معنی باہم متلازم ہیں کیونکہ
جس نے بذریعہ علم اپنے نفس کی پرورش کی اس نے
علم کی پرورش کی اور جس نے علم کی پرورش کی اس نے
اس کے ذریعہ اپنے نفس کی پرورش کی اور
بعض کا قول ہے کہ یہ رَبٌّ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب
ہے پس جیسے اِلٰهِیٌّ ہے اسی طرح رَبَّانِیٌّ ہے اور
نون کی زیادتی اس میں ایسی ہے جیسی کہ اہلِ عرب
لحیانی اور جسمانی کے بولتے وقت کرتے ہیں۔
حضرت علیؓ کا قول ہے انا ربانی هذه الامة
(میں اس امت کا ربانی ہوں) جمع رَبَّانِیُّوْنَ ہے
اور بعض کا قول ہے کہ لفظ رَبَّانی اصل میں سریانی ہے
اور یہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ
اہلِ عرب کے کلام میں قلیل الوجود ہے۔" پ ۱۱ ع ۱۳

رَبَّانِیِّیْنَ - زاہد، خدا پرست، درویش، اللہ والے
مربی، مرشدِ خلق، رَبَّانِیٌّ کی جمع بحالتِ نصب و جر
پ ۳ ع ۱۶

رَبَائِبُكُمْ - تمہاری جوروؤں کی لڑکیاں،
رَبَائِبُ رَبِیْبَةٌ کی جمع۔ جس کے معنی اس
زیر پرورش لڑکی کے ہیں جو اگلے شوہر سے ہو
مضاف ہے کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ
ربیبہ کو ربیبہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی
ماں کے دوسرے شوہر کے آغوشِ تربیت میں
ہوتی ہے، پ ۴ ع ۱۵

رَبَتْ - وہ بڑھی، وہ پھولی، وہ ابھری (نَصَرَ)
رَبُوٌّ سے جس کے معنی بڑھنے پھولنے اور بلند
ہونے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب
پ ۱۷ ع ۸ پ ۲۴ ع ۱۱

رَبِحَتْ - وہ سود مند ہوئی، اس نے فائدہ دیا
اس نے نفع دیا (سَمِعَ) رِبْحٌ سے جس کے
معنی نفع دینے اور سود مند ہونے کے ہیں
ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، پ ۱

رَبَطْنَا - ہم نے گرہ دی، ہم نے باندھ دیا،
(ضَرَبَ) رَبْطٌ سے جس کے معنی باندھنے کے ہیں
ماضی کا صیغہ جمع متکلم پ ۱۵ ع ۱۴ پ ۲۰

رُبُعٌ - چوتھائی، حصہ چہارم، اسم ہے اَرْبَاعٌ جمع پ ۴

رَبُّكَ - تیرا رب، تیرا پروردگار، تیرا مالک، تیرا
صاحب، رَبٌّ مضاف کَ ضمیر واحد مذکر حاضر
مضاف الیہ۔ آیت شریفہ اِرْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ
(پھر جا اپنے بادشاہ پاس) اور اُذْكُرْنِیْ عِنْدَ
رَبِّكَ (میرا ذکر کیجیو اپنے بادشاہ کے پاس) میں
رَبِّ بمعنی بادشاہ، سردار اور آقا کے ہے۔

پ۱ ۴و۷و۸ — پ۲ ۲ و ۱ — پ۳ ۱۲و۱۳و۱۴ — پ۵ ۹ — پ۶ ۸ و ۱۳و۱۴

پ۷ ۵و۱۶و۱۹ — پ۸ ۱و۲و۳و۵و۷ — پ۹ ۶و۹و۱۱و۱۲و۱۴و۱۵و۱۶

پ۱۱ ۷و۹و۱۲و۱۵ — پ۱۲ ۴و۶و۷و۹و۱۰و۱۱و۱۵و۱۶ — پ۱۳ ۷و۹

پ۱۴ ۲و۳و۶و۱۰و۱۵و۲۰و۲۱و۲۲ — پ۱۵ ۲و۳و۴و۵و

پ۱۵ ۱و۴و۷و۸و۱۰و۱۱و۱۴ — پ۱۶ ۶و۷و۹و۱۰و۱۶و۱۸و۲۰

پ۱۷ ۴و۱۳و۱۴و۱۶ — پ۱۸ ۴ و ۷ — پ۱۹ ۱و۳و۵و۶و۸و۹و۱۰

پ۱۹ ۱۱و۱۲و۱۳و۱۴ — پ۲۰ ۲و۳و۷و۸و۹و۱۰و۱۲و۱۳

پ۲۱ ۱۴و۱۶و۱۷ — پ۲۲ ۷ و ۸ — پ۲۳ ۹و۱۰و۱۴ (باقی برحاشیہ)

رَبُّكِ۔ تیرا رب، تیرا پروردگار، تیرا مالک، رَبُّ مضاف لِکِ ضمیر واحد مونث حاضر مضاف الیہ۔ پ۱۲ ۵ — پ۲۶ ۱۹ — پ۳۰ ۱۴

رَبُّكُمْ۔ تمہارا رب، تمہارا پروردگار، تمہارا مالک، تمہارا صاحب، رَبّ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ۔ پ۱ ۳و۶و۹و۱۳و۱۶

پ۲ ۶و۹و۱۶ — پ۳ ۳ و ۱۶ — پ۴ ۲و۵و۱۱و۱۲ — پ۶ ۳و۴و۱۴ — پ۷ ۶و۱۲و۱۹

پ۸ ۵و۶و۷و۸و۱۲و۱۴و۱۵و۱۶و۱۷ — پ۹ ۳و۵و۶و۱۰

پ۹ ۱۲و۱۴و۱۵ — پ۱۱ ۶و۹و۱۱و۱۶و۱۷ — پ۱۲ ۳ و ۵ و ۸

پ۱۳ ۷و۱۳و۱۴ — پ۱۴ ۱و۲و۳و۴و۹و۱۰و۱۲ — پ۱۵ ۲و۳و۴و۶و۷و

پ۱۵ ۹و۱۴و۱۵و۱۶ — پ۱۶ ۵و۱۳و۱۴ — پ۱۷ ۵و۶و۸و۱۷

پ۱۸ ۴ — پ۱۹ ۶و۱۳ — پ۲۱ ۱۳و۱۴ — پ۲۲ ۸و۹و۱۴ — پ۲۳ ۱و۸و۱۵

پ۲۳ ۱۶و۱۷ — پ۲۴ ۳و۵و۸و۹و۱۰و۱۲و۱۷ — پ۲۵ ۳و۶و

پ۲۵ ۶و۷و۱۲و۱۴و۱۸ — پ۲۷ ۱۴و۱۹ — پ۲۸ ۷و۱۷و۱۸ — پ۲۹ ۹ — پ۳۰ ۳

رَبُّكُمَا۔ تم دونوں کا رب، تم دونوں کا پروردگار، تم دونوں کا مالک، تم دونوں کا صاحب، رَبّ مضاف کُمَا ضمیر تثنیہ مذکر حاضر مضاف الیہ۔ پ۹ ۸ — پ۱۶ ۱۱ — پ۲۷ ۱۱و۱۲و۱۳

رُبَمَا۔ کسی وقت، بہت وقت، رُبَ حرفِ جر ہے اور مَا کافہ ہے اور بعض کے خیال میں نکرہ موصوفہ ہے۔ امام سیوطیؒ لکھتے ہیں۔

"رُبّ حرفِ جر ہے اس کے معنی میں آٹھ اقوال ہیں (۱) وہ دائمی طور پر تقلیل کے لئے آتا ہے، اکثر علما اسی پر ہیں (۲) وہ دائمی طور پر تکثیر کے لئے آتا ہے چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ کَانُوْا مُسْلِمِیْنَ (بہت وقت آرزو کریں گے یہ لوگ جو منکر ہیں کسی طرح ہوتے مسلمان) کیونکہ وہ کثرت سے اس کی تمنا کریں گے، اور اول قول کے قائل یہ کہتے ہیں کہ وہ اہوالِ قیامت کی مدہوشیوں میں اس طرح مشغول ہوں گے کہ بہت کم ہوش میں آئیں گے جب اس کی تمنا کریں گے۔ (۳) وہ تقلیل و تکثیر دونوں کے لئے مساوی طور پر آتا ہے (۴) وہ اکثر تقلیل کے لئے آتا ہے اور نادراً تکثیر کے لئے اور یہی اختیاری ہے (۵) اس کے بالکل

پ۲۴ ۶و۱۱و۱۹و۲۰ — پ۲۵ ۱و۳و۹و۱۱و۱۳و۱۴و۱۶و۱۸ — پ۲۶ ۱۷و۱۹ — پ۲۷ ۱و۳و۴و۶و۷و۱۲و۱۳و۱۵ و ۱۹ — پ۳۰ ۴و۵و۱۳

بر عکس (یعنی تکثیر کے معنی میں کثرت سے اور تقلیل کے معنی میں ندرت سے) (٦) ان دونوں معنی میں سے کسی کے لئے اس کی وضع عمل میں نہیں آئی بلکہ حرفِ اثبات ہے جو نہ تکثیر پر دلالت کرتا ہے، نہ تقلیل پر اور جو کچھ سمجھا جاتا ہے خارجی طور پر سمجھا جاتا ہے (٧) فخر و مباہات کے موقع پر تکثیر کے لئے اور دیگر مواقع پر تقلیل کے لئے (٨) مبہم عدد کے لئے ہے خواہ تقلیل ہو یا تکثیر۔

اور اس پر مَا کافہ بھی داخل ہوتا ہے جو اس کو عملِ جر سے روک کر جملوں پر داخل کرتا ہے، اس صورت میں بیشتر اس کا دخول ایسے جملہ فعلیہ پر ہوتا ہے جس کا فعل ماضی ہو خواہ وہ لفظاً موجود ہو یا معناً، اور آیتِ سابقہ میں وہ مستقبل پر داخل ہوا ہے، اور بعض کا قول ہے کہ یہ اس بنیاد پر ہے گویا صور پھونک چکا[51] اور قیامت آگئی یعنی مستقبل یہاں معناً ماضی ہی ہے) ب ۱۴

رَبَّنَا۔ ہمارا رب، ہمارا پروردگار، ہمارا صاحب، ہمارا مالک، رَبّ مضاف، نا ضمیر جمع متکلم، مضاف الیہ، ب ۱ (۵ و ۱۶) ب ۲ (۹ و ۱۷) ب ۳ (۸ و ۹ و ۱۰ و ۱۳) ب ۴ (۶ و ۱۱) ب ۵ (۷ و ۸) ب ۷ (۱ و ۵ و ۹) ب ۸ (۲ و ۹ و ۱۱ و ۱۲ و ۱۳) ب ۹ (۱ و ۶ و ۸) ب ۱۱ (۱۴) ب ۱۳ (۱۸ و ۱۹) ب ۱۴ (۱۸) ب ۱۵ (۲ و ۱۳ و ۱۴) ب ۱۶ (۱۱ و ...) ب ۱۶ (۲ و ۱۷) ب ۱۷ (۷ و ۱۳) ب ۱۸ (۶) ب ۱۹ (۱ و ۴ و ۷) ب ۲۰ (۸ و ۹ و ۱۱) ب ۲۱ (۱۵) ب ۲۲ (۵ و ...) ب ۲۲ (۸ و ۹ و ۱۴ و ۱۹) ب ۲۳ (۶ و ۱۱ و ۱۴) ب ۲۴ (۶ و ۷ و ۱۴ و ۱۸) ب ۲۵ (۳ و ۷ و ۱۴) ب ۲۶ (۲ و ۴ و ۱۶) ب ۲۸ (۴ و ۷ و ۲۰) ب ۲۹ (۳ و ۱۱ و ۱۹)

رِبٰوا۔ سود، بیاج، یہ لفظ تمام قرآن میں با کے بعد واو اور واو کے بعد الف سے مرقوم ہے مگر ایک جگہ سورہ الروم میں با کے بعد الف سے لکھا ہوا ہے، قاضی بیضاوی اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں۔

"چونکہ ایک لغت پر اس میں تفخیم ہے اس لئے صلاۃ کی طرح واو سے اس کو لکھا گیا اور واو کے بعد الف اس لئے زیادہ کر دیا گیا کہ واو جمع سے مشابہ ہو"[52] (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو رِبًا) ب ۳ (۶) ب ۴ (۵) ب ۶ (۲) ب ۲۱ (۷)

رَبْوَۃ۔ بلندی، بلند جگہ، ٹیلا، اسم ہے، رِبًا اور رُبُوٌّ سے مشتق ہے رُبًی اور رُبًی جمع (ملاحظہ ہو رَابِیًا) ب ۳ (۴) ب ۱۸ (۴)

رَبُّهٗ۔ اس کا رب، اس کا پروردگار، اس کا صاحب، اس کا مالک، رَبّ مضاف، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، آیت شریفہ اَمَّا اَحَدُکُمَا فَیَسْقِیْ رَبَّهٗ خَمْرًا (ایک جو ہے

[51] الاتقان ج ۱ ص ۱۲۳ طبع مصر۔ [52] تفسیر انوار التنزیل ج ۱ ص ۱۰۲ طبع مصر۔

تم دونوں میں سو پلاویگا اپنے بادشاہ کو شراب) اور فَاَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ (سو بھلا دیا اس کو شیطان نے ذکر کرنا اپنے بادشاہ سے) میں رب سے مراد آقا اور بادشاہ ہے ذات باری نہیں ہے۔ پ۱/۴و۱۳و۱۵و۱۹

پ۳/۳و۶و۷و۸و۱۲، پ۷/۱۰، پ۸/۱۴و۱۷، پ۹/۷، پ۱۱/۷، پ۱۲/۳و۴و
پ۱۲/۱۳و۱۴و۱۵، پ۱۳/۷و۱۰، پ۱۴/۴، پ۱۵/۳و۱۹و۲۰، پ۱۶/۲و۳و
پ۱۶/۴و۷و۱۲و۱۶و۱۷، پ۱۷/۶و۱۱، پ۱۸/۹، پ۱۹/۳، پ۲۱/۱و۱۵، پ۲۲/۸
پ۲۳/۷و۱۱و۱۳و۱۵و۱۷، پ۲۴/۸، پ۲۵/۱۴، پ۲۶/۹، پ۲۷/۵و۸و۱۳، پ۲۸/۱۹
پ۲۹/۴و۱۱و۱۳و۲۰، پ۳۰/۲و۳و۴و۹و۱۲و۱۴و۱۷و۲۳و۲۵

رَبَّهَا۔ اس کا رب، اس کا پروردگار، اس کا مالک، اس کا صاحب، رَبِّ مضاف، ھَا ضمیر واحد مونث غائب مضاف الیہ، پ۳/۱۴
پ۱۳/۱۹، پ۲۴/۶، پ۲۶/۳، پ۲۸/۳و۲۰، پ۲۹/۱۷، پ۳۰/۹

رَبُّهُمْ۔ ان کا رب، ان کا مالک، ان کا پروردگار، ان کا صاحب، رَبّ مضاف، ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ،
پ۱/۳و۵و۸و۱۶، پ۲/۱و۳، پ۳/۴و۶و۱۰و۱۷، پ۴/۵و۸و۱۱
پ۶/۵و۱۳، پ۷/۷و۹و۱۰و۱۲و۱۹، پ۸/۴و۵و۹و۱۷، پ۹/۹و۱۵
پ۱۰/۳و۹، پ۱۱/۶، پ۱۲/۲و۳و۵و۶، پ۱۳/۷و۸و۹و۱۳و۱۵و۱۶

پ۱۴/۱۲و۱۳و۱۹، پ۱۵/۶و۱۲و۱۵و۲۰، پ۱۶/۳، پ۱۷/۱و۴و۹، پ۱۸/۴
پ۱۹/۴، پ۲۱/۲و۴و۷و۱۰و۱۲و۱۵، پ۲۲/۱و۱۵و۱۷، پ۲۳/۲و۳و۱۶و۱۷
پ۲۴/۱و۵و۶، پ۲۵/۱و۲و۳و۴و۵و۱۷و۲۰، پ۲۶/۵و۶و۱۸، پ۲۷/۱و۳و
پ۲۷/۵و۱۸، پ۲۸/۱و۴و۵و۷و۱۱و۱۲و۱۹، پ۳۰/۸و۱۶و۲۲و۲۳و۲۵

رَبُّهُمَا۔ ان دونوں کا رب، ان دونوں کا پروردگار، ان دونوں کا صاحب، ان دونوں کا مالک، رَبّ مضاف هُمَا ضمیر تثنیہ مذکر غائب مضاف الیہ، پ۸/۹، پ۹/۱۴، پ۱۶/۱

رَبِّیْ میرا رب، میرا پروردگار، میرا مالک، میرا صاحب، رَبّ مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، پ۳/۳و۱۳، پ۶/۱۴، پ۷/۶و۸و۱۳و۱۵
پ۸/۷و۱۰و۱۱و۱۵و۱۶و۱۷، پ۹/۱و۱۳و۱۴، پ۱۱/۷و۱۰، پ۱۲/۳و۴و۵و
پ۱۲/۸و۱۳و۱۵و۱۷، پ۱۳/۵و۱۰و۱۸، پ۱۵/۱۰و۱۱و۱۵و۱۶و۱۷، پ۱۶/۲و۳و
پ۱۶/۵و۶و۱۱و۱۵، پ۱۷/۱، پ۱۹/۴و۶و۸و۱۰و۱۴و۱۸، پ۲۰/۴و۷و۱۲و۱۵
پ۲۲/۷و۱۰و۱۱و۱۲، پ۲۳/۱و۶و۷و۱۲و۱۶، پ۲۴/۸و۹و۱۲، پ۲۵/۱و۳و۱۲و۱۴
پ۲۸/۱۵، پ۲۹/۱۲، پ۳۰/۱۴

رَبَّيٰنِيْ۔ ان دونوں نے مجھ کو پالا، ان دونوں نے میری پرورش کی، رَبَّيَا تَرْبِيَةً سے ماضی کا صیغہ تثنیہ مذکر غائب ہے، الف تثنیہ نون سے قبل محذوف ہے، ن وقایہ ی ضمیر واحد متکلم، پ۱۵/۳

رِبِّیُّوْنَ - خدا کے طالب، خدا پرست، اللہ والے
ہزاروں جماعتیں رِبِّیٌّ کی جمع جو رَبَّانِیٌّ کی
طرح ہے، یہ امام راغب کا بیان ہے،
امام بخاریؒ نے اس کے معنی جماعتوں کے کئے
ہیں اور اس کا واحد رِبِّیٌّ بتایا ہے یہ معنی اصل میں
امام لغت ابو عبیدہؒ سے منقول ہیں[1] اس صورت
میں رِبّی بحسب تصریح قاضی بیضاوی رِبّۃ
کی طرف بطور مبالغہ منسوب ہے جس کے معنی
جماعت کے ہیں[2] امام بغوی لکھتے ہیں -
"رِبِّیُّوْنَ کَثِیْرٌ کے معنی حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ
اور قتادہؒ نے جماعاتِ کثیرہ کے بیان کئے ہیں اور
حضرت ابن مسعودؓ نے ہزاروں بتائے ہیں، کلبیؒ کا
قول ہے کہ ایک ربیہ دس ہزار کا ہوتا ہے، ضحاک
ایک ہزار کہتے ہیں اور حسن بصریؒ فقہاء و علماء ترجمہ
کرتے ہیں اور بعض کا قول ہے کہ ربیون اتباع ہیں
ربانیون حکام اور ربیون رعیت اور بعض کہتے
ہیں کہ رب کی طرف منسوب ہے یعنی وہ لوگ جو
رب کی عبادت کرتے ہیں"[3]
اور ابو حاتم احمد بن حمدان لغوی نے کتاب الزینۃ
میں تصریح کی ہے کہ یہ سریانی لفظ ہے[4] - پ ۴

فصل التاء المثناة

رَتْقًا - منہ بند، ملا ہوا، جڑا ہوا، رَتَقَ یَرْتُقُ کا
کا مصدر ہے "رتق" کے معنی اصل میں بند ہونے
اور جڑ جانے کے ہیں خواہ خلقی طور پر ہو یا صناعی
طور پر مصدر یہاں پر اسم فاعل یا اسم مفعول
کے معنی میں ہے، پ ۱۷

رَتِّلْ - کھول کھول کر پڑھ، آہستہ آہستہ یعنی
واضح پڑھ، ترتیلٌ سے امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر
(ملاحظہ ہو ترتیلاً) پ ۲۹ / ۱۴

رَتَّلْنٰہُ - ہم نے اس کو تھم تھم کر پڑھا، ہم نے
اس کو ٹھیر ٹھیر کر پڑھ سنایا، رَتَّلْنَا ترتیلٌ سے
ماضی کا صیغہ جمع متکلم ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب پ ۱۹

فصل الجیم المعجمۃ

رَجًّا - کپکپانا، لرزانا، ہلانا، رَجَّ یَرُجُّ کا مصدر ہے
اس کے معنی کسی چیز کو ہلانے اور جنبش دینے کے
ہیں، پ ۲۷ / ۱۴

[1] ملاحظہ ہو فتح الباری شرح صحیح البخاری ج ۸ ص ۱۵۵ طبع میریہ مصر [2] انوار التنزیل ج ۱ ص ۱۳۲
[3] معالم التنزیل ج ۱ ص ۳۶۲ طبع مصر ۱۳۳۱ھ [4] الاتقان ج ۱ ص ۱۳۹ -

رِجَالٌ۔ مرد، پیادے، پاؤں چلتے، اول معنی کے اعتبار سے رَجُلٌ کی جمع ہے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے رَاجِلٌ کی جیسے رِکَابٌ رَاکِبٌ کی جمع ہے رَاجِلٌ رِجْلٌ سے مشتق ہے جس کے معنی پیر کے ہیں اور اسی مناسبت سے پاؤں پیدل اور پیادہ کو رَاجِلٌ کہتے ہیں۔

واضح رہے کہ مردانِ جن کے لئے بھی رِجَالٌ کا استعمال ہوتا ہے، ارشاد ہے وَاَنَّہٗ کَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (اور بہت سے مرد آدمیوں میں سے پناہ لیتے تھے جنوں کے مردوں سے) شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ نے تصریح کی ہے کہ رجال الغیب جن ہی ہوتے ہیں اور اسی آیت کو استدلال میں پیش کیا ہے[1]۔ قرآن مجید میں دو جگہ رجال پیادوں کے معنی میں استعمال ہوا ہے ایک فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُکْبَانًا (پھر اگر تم کو ڈر ہو تو پیادہ پڑھ لو یا سوار) اور دوسرے یَاْتُوْکَ رِجَالًا (آویں گے تیرے پاس پاؤں چلتے) پ ۱۲ پ ۱۲ پ ۵/۲ و ۳ و ۷ و ۱۱ پ ۸/۱۲ و ۱۷ پ ۱۱/۲ پ ۱۸/۱۰ و ۱۱

پ ۱۹/۱۹ پ ۲۰/۱۵ پ ۲۱/۱۹ پ ۲۶/۱۱ پ ۲۹/۱۱ رِجَالًا پ ۲/۱۵ پ ۴/۱۲
پ ۶/۴ پ ۸/۱۲ پ ۳/۹ پ ۱۴/۱۲ پ ۱۷/۱ و ۱۱ پ ۲۳/۱۲

رِجَالِکُمْ۔ تمہارے مرد، رِجَالِ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، پ ۳/۶ پ ۲۲/۲

رُجَّتْ۔ وہ ہلائی گئی، اس کو جنبش دی گئی، (نَصَرَ) رَجٌّ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب، پ ۲۷/۱۴

رُجْزٌ۔ پلیدی، گناہ، عذاب، بت۔ امام بغوی وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مجاہد، عکرمہ، قتادہ، زہری، ابن زید اور ابو سلمہ کا بیان ہے کہ رُجز سے مراد اوثان یعنی بت ہیں، پس اللہ نے فرمایا کہ اس سے دور رہ اور قریب نہ جا اور بعض کا قول ہے کہ زا اس میں سین سے بدل لی گئی ہے۔ اہل عرب قرب مخرج کے سبب سین اور زے کو ایک دوسرے کی جگہ لے آتے ہیں اس تاویل کی دلیل فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ ہے۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس کے معنی ہیں گناہوں سے دور رہ، اور ابو العالیہ اور ربیع کہتے ہیں کہ رُجز

[1] ملاحظہ ہو الصارم المنکی فی الرد علی السبکی للحافظ ابن عبدالہادی المقدسی ص ۱۲۳ طبع مصر ۱۳۱۸ھ امام موصوف کی عبارت یہ ہے "ورجال الغیب ہم الجن قال تعالیٰ وانہ کان رجال من الانس یعوذون برجال من الجن فزادوہم رہقاً۔"

راکے پیش سے بمعنی بت اور راکے زیر سے بمعنی
نجاست ومعصیت ہے، ضحاک نے اس کا ترجمہ
شرک سے کیا ہے اور کلبی نے عذاب کے معنی بتائے
ہیں"۔[1] پ ۲۹ ع ۱۵

رِجْزٌ عقوبت، بلا، عذاب، قاضی بیضاوی
لکھتے ہیں۔

"کہ رجز اصل میں وہ چیز ہے جس سے گھن آئے
اور رجس بھی اسی کی طرح ہے"۔[2]

لیکن علامہ زمخشری، الفائق فی غریب الحدیث
میں رقمطراز ہیں۔

"رجز اور رجس کے معنی عذاب کے ہیں، ابو تراب
کا بیان ہے کہ میں نے ابو السمیدع حصینی سے سنا وہ
کہتے تھے کہ رجز اور رجس وہ سخت مصیبت ہے
جو لوگوں پر نازل ہو، یہ اہلِ عرب کے محاورہ ارتجزت
السماء بالرعد وارتجست (آسمان بجلی کی کڑک
سے کانپ اٹھا اور لرز گیا) اور رعد مرتجز و
مرتجس (کپکپا دینے اور لرزا دینے والی گرج) سے
ماخوذ ہے اور وہ ایسی جنبش ہے جس کے ساتھ شور ہو
کیونکہ جو عذاب کہ اترتا ہے اس میں ضروری ہے کہ
جن پر اترے وہ ہل جائیں اور چیخ اٹھیں"۔[3]

اور امام راغب فرماتے ہیں۔

"رجز کی اصل اضطراب (یعنی خوب ہلنا اور جنبش
کرنا ہے) اور اسی سے رجز البعیر رجزا فہو ارجز
وناقۃ رجزاء آتا ہے جبکہ اونٹ یا اونٹنی
کے قدم قریب قریب پڑنے اور ضعف کے
سبب ڈگمگانے لگیں"۔ ....

آیہ شریفہ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ (بلا کی
مار ہے دکھ والی) میں رجز یہاں زلزلہ کی طرح
ہے"۔ پ ۹ ع ۶، ۷، ۱۰ پ ۲۲ ع ۷ پ ۲۵ ع ۱۴ رِجْزًا پ ۱ ع ۶ پ ۹ ع ۱۰ پ ۲۰ ع ۱۶

رِجْسٌ۔ ناپاک، پلید، گندہ، عقوبت، عذاب
بلا، اَرْجَاسٌ جمع، رجس کی چار صورتیں
ہیں (۱) طبیعت کی جہت سے (۲) عقل کی
جہت سے (۳) شرع کی جہت سے (۴) ان
تینوں جہت سے، رجس شرعی جوا اور شراب،
رجس عقلی شرک اور لحم خنزیر، تینوں کا مجموعہ میتہ
(مردار) ہے، حق تعالیٰ نے سب کے لئے لفظ
رجس استعمال فرمایا ہے، بعض کا قول ہے کہ
رِجْزٌ اور رِجْسٌ زور کی چیخ کو کہتے ہیں (ملاحظہ ہو

[1] معالم التنزیل ج ۷، ص ۱۴۴۔ [2] انوار التنزیل ج ۱ ص ۴۴ و ۴۵۔
[3] الفائق فی غریب الحدیث طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن۔

رِجْزٌ) پ۷ ع۲، پ۸ ع۲ و۵ و۱۶، پ۱۱ ع۱ و۱۵، پ۱۷ ع۱۱، پ۲۲ ع۱

رِجْسًا پ۱۱ ع۵

رِجْسِهِمْ۔ ان کی نجاست، ان کی گندگی، ان کی پلیدی، رِجْس مضاف هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، پ۱۱ ع۵

رَجْعٌ۔ پھر آنا، لوٹ آنا، مینہ، بارش، رَجَعَ یَرْجِعُ کا مصدر ہے، متعدی آتا ہے آیت شریفہ وَالسَّمَاۤءِ ذَاتِ الرَّجْعِ میں بعض نے تو "ذاتِ الرجع" کا ترجمہ چکر مارنے والا کیا ہے، شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، اور قاضی بیضاوی کا بھی رجحان اسی طرف ہے اس اعتبار سے آسمان کو "ذات الرجع" اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے ہر دورہ میں جس جگہ سے حرکت کرتا ہے وہیں لوٹ آتا ہے[1]۔ لیکن اکثر مفسرین اور ائمہ لغت کی تصریح کے مطابق یہاں رجع اپنے معنی مصدری میں نہیں بلکہ بارش اور مینہ کے معنی میں اسم ہے علامہ ابن خالویہ لغوی، ابو عبیدہ سے ناقل ہیں کہ رجع مطر یعنی بارش کو کہا جاتا ہے اور ابن الاعرابی روایت کرتے ہیں کہ کل مطر یثبت فی الارض فهو رجع[2] (ہر وہ بارش جو زمین میں ٹھیر جائے رجع ہے) بارش یا مینہ کا نام رجع کیوں پڑا، قاضی بیضاوی نے اس کی دو وجہیں لکھی ہیں "لان الله یرجعه وقتا فوقتا اولما قیل من ان السحاب یحمل الماء من البحار ثم یرجعه الی الارض[3] (اس لئے کہ اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً بارش کو لوٹاتا رہتا ہے یا اس لئے کہ کہا گیا ہے کہ ابر سمندروں سے پانی لاد لیتا اور پھر زمین کی طرف لوٹا دیتا ہے)۔

حاکم نے بسندِ صحیح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے۔ رجع کے معنی . . . . بارش کے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے بھی اسی ترجمہ کو اختیار کیا ہے، پ۳۰ ع۱۱

رَجَعَ۔ وہ لوٹا، وہ پھر آیا (ضَرَبَ) رُجُوْعٌ سے جس کے معنی جہاں سے ابتدا ہوئی یا ابتدار کا اندازہ ہوا وہیں لوٹنے کے ہیں خواہ وہ کوئی مکان ہو یا فعل ہو یا قول، اور خواہ رجوع بذاتہ ہو یا کسی

[1] انوار التنزیل ج ۲ ص ۳٦۸ طبع مصر۔ [2] کتاب اعراب ثلاثین سورہ من القرآن الکریم ص ۴۹ و ۵۱۔
[3] انوار التنزیل ج ۲ ص ۳٦۸ ۔ [4] مستدرک ج ۲ ص ۵۲۰ طبع دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن۔

بڑنے کے ذریعہ یا کسی فعل سے ، ماضی رجوع
سے ماضی ، لوٹ کر پہنچانا اور لوٹنے کے ہیں ، ماضی کا صیغہ
واحد مذکر غائب ہے واضح رہے کہ رجوع مصدر
لازم ہے ، پ ع

رُجِعْتُ میں لوٹایا گیا رَجْعٌ سے ماضی مجہول
کا صیغہ واحد متکلم ، پ

رَجَعْتُمْ تم لوٹے تم پھرے رُجُوْعٌ سے
ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر ، پ

رَجَعَكَ تجھ کو واپس لوٹایا ، تجھ کو پھیر لایا
رَجْعٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب
كَ ضمیر واحد مذکر حاضر ، پ

رَجَعْنَا ہم لوٹے ہم واپس ہوئے ہم پھرے
رُجُوْعٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم ، پ

رَجَعْنٰكَ ہم نے تجھ کو واپس لوٹا دیا ، ہم تجھے
پھیر لائے رَجَعْنَا رَجْعٌ سے ماضی کا صیغہ
جمع متکلم كَ ضمیر واحد مذکر حاضر ، پ

رَجَعُوْا وہ پھرے ، وہ واپس ہوئے رُجُوْعٌ
سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب ، پ پ پ

رَجْعِهٖ اس کو لوٹانا ، اس کو پھیر لانا
رَجْعٌ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب
مضاف الیہ ، پ

رُجْعٰى پھر جانا ، لوٹنا ، رَجَعَ يَرْجِعُ کا مصدر
ہے لازم آتا ہے ، پ

رَجْفَةٌ زلزلہ ، بھونچال ، کپکپاہٹ ، لرزش
اسم ہے پ پ پ پ

رَجُلٌ مرد جس کی مردی و مردانگی ظاہر ہو
رِجَالٌ جمع پ پ پ پ پ پ پ
پ پ پ پ پ پ رَجُلًا پ
پ پ پ پ پ

رَجُلَانِ دو مرد ، رَجُلٌ کا تثنیہ بحالت رفع
واضح رہے کہ اسم و فعل کے تثنیہ میں الف جب
کہ حرف آخر میں واقع ہو قرآن کے رسم الخط
میں وہ لکھا نہیں جاتا ، صرف قَدْ مَسَّنِيَ الْكِبَرُ
اس سے مستثنیٰ ہے ، پ

رِجْلِكَ تیرا پاؤں ، رِجْلٌ مضاف كَ ضمیر
واحد مذکر حاضر مضاف الیہ ، پ

رَجِلِكَ تیرے پیادے ، رَجِلٌ مضاف كَ
ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ رَجِلٌ راجلٌ
کی جمع ہے ، پ

رَجُلَيْنِ دو مرد رَجُلٌ کا تثنیہ بحالت نصب
و جر ، پ پ پ پ

رِجْلَيْنِ ، دو پیر ، دو پاؤں ، رِجْلٌ کا تثنیہ

بحالت نصب و جر، پ ۱۸/۱۲

رَجْمًا سنگسار کرنا، قتل کرنا، بے سوچ سمجھے منہ سے بات نکالدینا، لعنت کرنا، برا بھلا کہنا، پھٹکارنا، دھتکارنا، رَجَمَ یرجُمُ کا مصدر اصل میں رَجْمٌ کے معنی رجام (پتھروں) سے مارنے کے ہیں اور بقیہ تمام معانی مستعار ہیں، پ ۱۶

رَجَمْنٰكَ ہم نے تجھ کو سنگسار کیا، ہم نے تجھ پر پتھراؤ کیا، رَجَمْنَا رَجَمَ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، كَ ضمیر واحد مذکر حاضر، پ ۱۲

رُجُوْمًا آلات سنگساری (پتھر) کی جمع، رجم اصل میں مصدر ہے اور جن چیزوں سے رجم کیا جائے اس کے لئے بطور اسم مستعمل ہے، پ ۲۹

رَجِیْمٌ ملعون، مردود، راندہ ہوا، رَجْم سے بروزن فعیل بمعنی مفعول یعنی مرجوم اور شیطان چونکہ اللہ تعالیٰ کی درگاہ سے راندہ ہوا اور مردود ہے اس لئے یہ اس کی مخصوص صفت ہے اور قرآن مجید میں جہاں کہیں یہ لفظ آیا ہے اسی کی صفت میں آیا ہے۔ پ ۳

پ ۱۴/۱۹،۳،۲ پ ۲۲/۱۳ پ ۳۰/۶

فصل الحاء المهملة

رِحَالِهِمْ ان کی خرجینیں، ان کے کجاوے رِحَالِ مضاف هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ رِحَال رَحْلٌ کی جمع ہے، پ ۱۳

رَحُبَتْ وہ کشادہ ہوئی، وہ فراخ ہوئی، رَحُمَ رُحْبٌ سے اس کے معنی فراخ ہونے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب پ ۱۰ پ ۲۱

رَحْلِ کجاوہ، خورجین، تھیلہ، اصل میں یہ اونٹ پر سواری کے لئے جو چیز رکھی جاتی ہے یعنی پالان کو رحل کہتے ہیں اور مجازاً منزل، مسکن اور سامان سفر خرجین اور تھیلہ وغیرہ کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے، رِحَالٌ جمع، پ ۱۳

رَحْلِهٖ اس کا اسباب سفر، اس کا پالان، اس کا کجاوہ، رَحْلِ مضاف ہ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ پ ۱۳

رِحْلَةَ سفر کرنا، کوچ کرنا، کجاوہ کسنا، اصل میں تو اس کے معنی اونٹ پر پالان کسنے کے ہیں اور چونکہ اس کا مقصد کوچ اور سفر ہوتا ہے اس لئے سفر کے معنی میں آنے لگا، رَحَلَ یرحَلُ کا مصدر ہے۔ پ ۳۰

رَحِمَ اس نے رحم کیا، اس نے مہربانی کی، (رحیم) رُحْمٌ اور رَحْمَةٌ سے ماضی کا صیغہ

واحد مذکر غائب، پ۱۲/۱۰و۱۴ پ۱۳/۱ پ۲۵/۱۵

رُحْمًا شفقت، مہربانی، محبت، رَحِمَ یَرْحَمُ کا مصدر ہے، پ۱۶/۲

رُحَمَآءُ۔ بڑے نرم دل، بڑے مہربان، رَحِیْمٌ کی جمع۔ (ملاحظہ ہو رَحِیْمٌ) پ۲۶/۱۲

رَحْمَتِكَ۔ تیری مہربانی، تیری مہر، تیری بخشائش رَحْمَةِ مضاف كَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ (ملاحظہ ہو رَحْمَة) پ۹/۸ پ۱۱/۱۴ پ۱۹/۱۷

رَحْمَتِنَا۔ ہماری مہربانی، ہماری رحمت، ہماری بخشش، رَحْمَةِ مضاف، نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ پ۱۳/۱ پ۱۶/۶و۷ پ۱۷/۵و۶

رَحْمَتِهٖ۔ اس کی رحمت، اس کی مہربانی، رَحْمَةِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ پ۱/۸و۱۳ پ۳/۱۶ پ۵/۸و۱۴ پ۹/۱۴ پ۱۱/۱و۱۱ پ۱۵/۶و۱۴ پ۱۸/۷و۸و۹ پ۱۹/۳ پ۲۰/۱و۱۰ پ۲۱/۸ پ۲۲/۱ پ۲۵/۲و۴و۲۰ پ۲۶/۱۱ پ۲۷/۲۰ پ۲۹/۲۰

رَحِمْتَهٗ۔ تو نے اس پر رحم کیا، تو نے اس پر مہربانی کی، رَحِمَ رُحْمًا اور رَحْمَةً سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، پ۲۴

رَحْمَتِیْ۔ میری رحمت، میری مہربانی، رَحْمَةِ مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، پ۹ پ۲۰/۱۵

رَحْمٰن۔ بڑا مہربان، بہت بخشش کرنے والا، چونکہ اس لفظ کے معنی بجز ذاتِ باری کے اور کسی پر صادق نہیں آتے کیونکہ اسی کی رحمت سب پر عام ہے اس لئے سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کے لئے اس لفظ کا استعمال نہیں ہوتا، علماءِ عربیت کا اس میں اختلاف ہے کہ رحمٰن عربی زبان کا لفظ ہے یا نہیں اور عربی ہونے کی صورت میں یہ مشتق ہے یا غیر مشتق، مبرد اور ثعلب جو لغت و عربیت کے امام ہیں اس طرف گئے ہیں کہ یہ عبرانی لفظ ہے اور اس کی اصل خا معجمہ سے ہے، امام خطابیؒ لکھتے ہیں۔[۱]

"رحمٰن کی تفسیر اور اس کے معنی میں نیز اس امر میں کہ وہ رحمۃ سے مشتق ہے یا نہیں لوگوں کا اختلاف ہے، بعض اس طرف گئے ہیں کہ یہ غیر مشتق ہے کیونکہ اگر یہ رحمۃ سے مشتق ہوتا تو مرحوم کے ذکر کے ساتھ آتا، اور جس طرح کہ رحیم لعبادہ کہا جاتا ہے رحمٰن لعبادہٖ کہنا جائز ہوتا، نیز اس لئے کہ اگر رحمۃ سے مشتق ہوتا تو عرب سننے کے ساتھ ہی اس پر انکار نہ کرتے کیونکہ وہ رحمتِ پروردگار کے منکر نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ

---

[۱] الاتقان ج ۱ ص ۱۳۹

نُفُوْرًا) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ
کرو، تو کہتے ہیں رحمٰن کیا ہے، کیا تو جس کو کہے گا
اس کو ہم سجدہ کریں گے، اس سے ان کی نفرت میں
اور زیادتی ہوتی جاتی ہے) اور بعض نے یہ خیال کیا
ہے کہ یہ عبرانی نام ہے اور جمہور اس طرف گئے
ہیں کہ یہ رحمۃ سے مشتق ہے اور مبالغہ پر مبنی ہے
اس کے معنی رحمت والے کے ہیں، اس سلسلہ میں
اس کی کوئی نظیر نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ جس طرح
رحیم کا تثنیہ اور جمع آتا ہے اس کا تثنیہ اور جمع
نہیں آتا، فعلان کا وزن کلام عرب میں مبالغہ
کا وزن ہے، چنانچہ شدید الامتلاء کو ملآن اور
اور خوب پیٹ بھرے کو شبعان کہتے ہیں۔[1]

بہرحال یہ واقعہ ہے کہ خدا کے لئے رحمٰن
کا لفظ اسلام سے پہلے عام طور پر عربوں میں
مستعمل نہ تھا اور صرف یہود و نصاریٰ اور
بعض دیگر ارباب مذاہب اس کو بولتے تھے
چنانچہ نجد کے آخری کتبات میں رحمٰن ہی کا نام
ملتا ہے، سد عرم کے عیسائی کتبہ کا آغاز بنعمۃ
الرحمٰن الرحیم سے ہوتا ہے، اسی لئے اسلام
نے جب ابتداءً رحمٰن کا نام لیا تو قریش کو اچنبھا
ہوا کہ یہ کون نیا نام ہے، صلح حدیبیہ میں جب
حضرت علیؓ نے عہد نامہ کی پیشانی پر بسم اللہ
الرحمٰن الرحیم لکھا تو قریش نے ماننے سے
انکار کیا کہ ہم رحمٰن کو نہیں مانتے[2]

جو لوگ رحمٰن کو رحمت سے مشتق بتاتے
ہیں وہ رحمٰن و رحیم میں نہایت دقیق اور نازک
فرق بیان کرتے ہیں چنانچہ ابن حجر عسقلانیؒ
لکھتے ہیں۔

"اس میں اختلاف ہے کہ آیا رحمٰن اور رحیم کے
ایک ہی معنی ہیں جس طرح کہ ندمان اور ندیم
کے ہیں اور ان دونوں کو جو ایک ساتھ ذکر کیا گیا
ہے وہ تاکید کیلئے ہے یا باعتبار تعلق دونوں میں
باہم مغایرت ہے۔ پس رحمٰن ہے دنیا کے لئے
اور رحیم ہے آخرت کے لئے، کیونکہ دنیا میں
اس کی رحمت مومن و کافر سب کے لئے عام ہے
اور آخرت میں مومن کے ساتھ مخصوص ہے یا مغایرت
کسی اور جہت سے ہے کہ رحمٰن تو اس حیثیت
سے زیادہ بلیغ ہے کہ وہ بڑی بڑی نعمتوں اور

[1] کتاب الاسماء والصفات امام بیہقی ص ۲۷ طبع انوار احمدی الٰہ آباد
[2] ارض القرآن ج ۲ ص ۲۳۹ طبع معارف پریس اعظم گڑھ۔

ان کے اصول پر مشتمل ہے جیسے کوئی غضب میں
بھرا ہو تو اسے غضبان کہتے ہیں اور رحیم کو
اس کے بعد ہی اس لئے لایا گیا کہ بطور تتمہ ہو کر
چھوٹی نعمتوں کو شامل ہو جائے اور بعض کا قول
ہے کہ رحیم زیادہ بلیغ ہے کیونکہ فَعِیل کا صیغہ
مبالغہ کا مقتضی ہے اور تحقیق یہ ہے کہ مبالغہ کی
جہت دونوں میں مختلف ہے۔" [1]

علامہ ابن خالویہ نحوی کا بیان ہے کہ
"رحمٰن کو رحیم پر اس لئے مقدم کیا گیا کہ رحمٰن
اللہ تعالیٰ کا اسم خاص ہے اور رحیم اسم مشترک
ہے کیونکہ رجل رحیم تو بولتے ہیں مگر رجل
رحمٰن نہیں بولتے ہیں خاص کو عام پر مقدم کیا
گیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رحمٰن
اور رحیم دو ایسے اسم ہیں جن میں رقت کے
معنی ہیں اور ایک میں بہ نسبت دوسرے کے
رقت کا مفہوم زیادہ ہے اور دوسروں کا بیان
ہے کہ رحمٰن میں رقت زیادہ ہے اور رحیم
میں رقت زیادہ ہے پس رحیم لطیف کی طرح
ہے اور ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ رحیم اور رحمٰن
دونوں لغتیں ہیں پس رحیم تو رحمۃ سے بروزن
فعیل ہے اور رحمٰن بروزن فعلان،

ابوعبیدہ کا بیان ہے کہ یہ اس بنا پر ہے کہ اہل عرب
کے نزدیک زبان میں وسعت ہے جیسے کہ ندیم
اور ندمان کے ایک ہی معنی ہیں، ابوعبیدہ نے
اس شعر کو پیش کیا ہے ؎

وَنَدْمَانٍ يَزِيدُ الْكَأْسَ طِيبًا
سَقَيْتُ وَقَدْ تَغَوَّرَتِ النُّجُومُ

اور دوسرے علماء کا قول ہے کہ رحمٰن عبرانی
کا رخمان ہے، ان لوگوں نے جریر کی یہ بیت
استشہاد میں پیش کی ہے،

أَوَ تَتْرُكُونَ إِلَى الْقَسَّيْنِ هِجْرَتَكُمْ
وَمَسْحَكُمْ صُلْبَهُمْ رَخْمَانَ قُرْبَانَا

مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں
ایک اور فرق نمایاں کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔
"اگرچہ یہ دونوں اسم رحمت سے ہیں لیکن رحمت
کے دو مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں عربی
میں فعلان کا باب عموماً ایسے صفات کے لئے
استعمال کیا جاتا ہے جو محض صفات عارضہ ہوتے
ہیں، فعیل کا وزن کے لئے ضروری نہیں ہوتا جیسے
پیاسے کے لئے عطشان غضب ناک کے لئے

[1] فتح الباری ج ۸ ص ۱۱۹ طبع میریہ مصر [2] کتاب اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن الکریم ص ۱۳۔

غضبان سراسیمہ کے لئے حیران، مست کے لئے سکران، لیکن فعیل کے وزن میں صفات قائمہ وفاعلہ کا خاصہ ہے یعنی عموماً ایسے صفات کے لئے بولا جاتا ہے جو جذبات و عوارض ہونے کی جگہ صفات قائمہ ہوتے ہیں اور اپنا فعلی ظہور بھی رکھتے ہیں مثلاً کریم کرم کرنے والا، عظیم بڑائی رکھنے والا، علیم علم رکھنے والا، حکیم حکمت رکھنے والا، پس الرحمٰن کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں رحمت ہے اور الرحیم کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ذات جس میں نہ صرف رحمت ہے بلکہ جس کی رحمت اپنا فعلی ظہور بھی رکھتی ہے اور تمام کائنات اس سے فیضیاب ہو رہی ہے۔" [۱]

شاہ عبدالعزیز صاحب تفسیر فتح العزیز میں ایک اور نکتہ واضح فرماتے ہیں۔

"باید دانست کہ از نام [illegible] دو قسم رحمت [illegible] اول آنکہ [illegible] اگر [illegible] تو جہانام [illegible] حاجات پرورده [illegible] ضروریات او در ہر وقت ولحظہ بایست ونابایست او در ہر آئینہ ست وازیں رحمت بنام رحمان تعبیر فرمودہ اند و قسم دوم از رحمت آنست کہ بعد از پرورش و حصول کمال ثمرات آں کمال را مترتب فرماید وآں کمال را رائیگاں نسازد . . . . وازیں رحمت بہ رحیم فرمودہ اند۔" [۲]

بہرحال یہ سب نکتہ سنجیاں اس بنیاد پر ہیں کہ رحمٰن کا اشتقاق رحمت سے ہے اور وہ عربی زبان کا لفظ ہے ورنہ اگر اس کو عبرانی لفظ مان لیا جائے تو پھر کسی دقیقہ سنجی کی ضرورت نہیں رہتی اس صورت میں یہ لفظ اللہ کی طرح ذات باری کا علم ہوگا۔ قرآن مجید میں یہ لفظ (۵۷) جگہ مذکور ہے اور بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا استعمال بطور صفت نہیں بلکہ بطور علم ہوا ہے۔ پ۱ ۲/۳، پ۱۳ ۱۰، پ۱۵ ۱۲، پ۱۶ [illegible]، پ۱۶ [illegible]، پ۱۷ [illegible]، پ۱۹ [illegible]، پ۲۲ ۱۸ و ۱۹، پ۲۳ [illegible]، پ۲۴ [illegible]، پ۲۵ [illegible]، پ۲۶ [illegible]، پ۲۷ [illegible]، پ۲۸ [illegible]، پ۲۹ [illegible]، پ۳۰ [illegible]

ترجمہ: [illegible] اس نے ہم پر رحم کیا اس سے ہم [illegible] کی اس [illegible] رحمت کی [illegible] [illegible] (مرحمت ہو [illegible]) پ۲۹

رَحْمَةً [illegible] ان پر مہربانی کی ہم نے

۱؎ ترجمان القرآن ج ۱ ص ۲۹ طبع دہلی ۱۳۵۰ھ ۲؎ تفسیر فتح العزیز ص ۱۲ طبع محمدیہ ۱۲۶۲ھ

ان پر رحم کیا، ہم نے ان پر بخشش کی۔ رَحِمْنَا
رُحْمٌ اور رَحْمَۃٌ سے، ماضی کا صیغہ، جمع متکلم
ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب۔ پ ۱۸
رَحِمَہٗ۔ اس پر رحم کیا، اس پر مہربانی کی، اس پر
بخشش کی، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے
(ملاحظہ ہو رَحِمَ) پ ۸
رَحْمَۃٌ۔ رحمت، بخشش، مہربانی، رَحِمَ
یَرْحَمُ کا مصدر ہے، امام راغب لکھتے ہیں۔
"رحمۃ وہ رقت ہے جو مرحوم کی طرف (یعنی جس پر
رحم کیا جائے) احسان کی مقتضی ہو، اور کبھی اس کا
استعمال مجرد رقت کے معنی میں ہوتا ہے اور کبھی
صرف احسان کے معنی میں جو رقت سے خالی ہو،
جیسے رحم اللہ فلانا (اللہ نے فلانے پر رحم کیا)
جب اس سے ذاتِ باری کو موصوف کیا جائیگا
تو صرف احسان مراد ہوگا، رقت مراد نہ ہوگی،
اسی لئے مروی ہے کہ اللہ کی طرف سے رحمت
انعام اور فضل ہے اور آدمیوں کی طرف سے
رحمت رقت و تعطف (شفقت) ہے اور
اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد
ہے جو آپ نے اپنے رب سے نقل کیا ہے کہ
جب اس نے رحم کو پیدا کیا تو اس سے فرمایا میں
رحمٰن ہوں اور تو رحم ہے، میں نے تیرے نام کو
اپنے نام میں سے نکالا ہے، پس جو تجھے ملائیگا
میں اسے ملاؤں گا اور جو تجھے قطع کرے گا میں اُسے
پارہ پارہ کردوں گا۔ یہ اسی طرف اشارہ ہے جو
سابق میں گذرا کہ رحمت رقت اور احسان دو معنوں
پر مشتمل ہے۔ پس رقت کو تو طبائع انسانی میں جگہ
دی اور احسان کے ساتھ خود منفرد رہا تو یہ ہوا کہ
جس طرح لفظ رحم رحمت سے ہے اسی طرح
اس کے جو معنی لوگوں میں موجود ہیں وہ اس
معنی سے ہیں جو ذات باری کے لئے پائے جاتے
ہیں اور ان دونوں کے معنوں میں بھی وہی تناسب
ہے جو ان دونوں کے لفظوں میں ہے"
مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو میں رحمت کی
بہت اچھی تشریح کی ہے جو انہی کے لفظوں میں
درج ذیل ہے۔
"عربی میں رحمت عواطف کی ایسی رقت اور
نرمی کو کہتے ہیں جس سے کسی دوسری ہستی کے لئے
احسان و شفقت کا ارادہ جوش میں آجائے، پس
رحمت میں محبت، شفقت، فضل، احسان سب کا

مفہوم داخل ہے اور مہر و محبت، لطف اور فضل سے زیادہ وسیع ہے۔[1]

ب۲/۳ و ۶ و ۱۱ ب۳/۹ ب۴/۲ و ۸ ب۵/۱۰ ب۶/۴ ب۷/۸ و ۱۲ ب۸/۳ و ۵ و ۶ و ۷ و

ب۹/۱۳ و ۱۴ و ۱۶ ب۹/۹ و ۱۴ ب۱۰/۹ و ۱۴ ب۱۱/۸ و ۱۱ ب۱۲/۲ و ۳ و ۵ و ۶ و ۷ و ۸

ب۱۳/۹ ب۱۴/۳ و ۱۴ و ۱۸ ب۱۵/۳ و ۹ و ۱۰ و ۱۱ و ۱۳ و ۲۰ و ۲۱ ب۱۶/و ۲ و

ب۱۶/۴ و ۵ ب۱۷/۶ و ۷ ب۲۰/۲ و ۸ و ۱۲ ب۲۱/۶ و ۷ و ۸ و ۱۰ و ۱۸ ب۲۲/۱۳

ب۲۲/۲ و ۱۰ و ۱۳ و ۱۵ ب۲۳/۳ و ۶ و ۱۶ ب۲۵/۶ و ۹ و ۱۳ و ۱۸ ب۲۶/۲ ب۲۷/۱۸ و ۲۰

رَحِیۡق. شراب ناب، اسم جامد ہے، علامہ ابومنصور ثعالبی، فقہ اللغۃ میں ابو عبیدہ سے ناقل ہیں "الرحیق صفوۃ الخمر التی لیس فیھا غش"[2] (رحیق وہ شرابِ صاف ہی جس میں ذرا آمیزش نہ ہو) ب۳۰/۸

رَحِیۡم. بڑا مہربان، نہایت رحم والا، رَحۡمَۃٌ سے بروزن فَعِیۡلٌ مبالغہ کا صیغہ رُحَمَآءُ جمع رحیم اسماءِ حسنٰی میں سے ہے اس کا استعمال غیر کے لئے بھی ہوتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید میں رَؤُفٌ رَّحِیۡمٌ کہا گیا ہے۔ ابن مبارک کہتے ہیں رحمٰن وہ ذات ہی کہ جب اس سے مانگا جائے تو عطا فرمائے اور رحیم وہ ذات ہے کہ اس سے نہ مانگا جائے تو غضب میں آئے[3] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو

(رحمٰن) ب۱/۱۵ و ۶ و ۴ و ۳ ب۲/۳ و ۵ و ۶ و ۸ و ۹ و ۱۱ و ۱۲

ب۳/۱۲ و ۱۷ ب۴/۴ ب۵/۱ ب۶/۵ و ۹ و ۱۰ و ۱۴ ب۷/۳ و ۱۲ ب۸/۵ و ۷ ب۹/۹ و ۱۱

ب۱۰/۵ و ۶ و ۷ و ۱۰ و ۱۸ ب۱۱/۱ و ۲ و ۳ و ۵ و ۱۶ ب۱۲/۴ و ۸ ب۱۳/۱ و ۵ و ۱۸

ب۱۴/۳ و ۷ و ۸ و ۱۲ و ۲۰ و ۲۱ ب۱۷/۱۶ ب۱۸/۷ و ۸ و ۹ و ۱۰ و ۱۵

ب۱۹/۵ و ۸ و ۹ و ۱۰ و ۱۱ و ۱۲ و ۱۳ و ۱۴ و ۱۵ و ۱۶ و ۱۷ ب۲۰/۵

ب۲۱/۴ و ۱۴ ب۲۲/۷ و ۱۸ ب۲۳/۳ ب۲۴/۳ و ۱۵ و ۱۸ ب۲۵/۲ و ۱۵ ب۲۶/۱ و ۱۳ و ۱۴

ب۲۷/۳ و ۱۷ و ۲۰ ب۲۸/۲ و ۴ و ۶ و ۸ و ۱۶ و ۱۹ ب۲۹/۱۴

رَحِیۡمًا ب۴/۱۴ و ۱۵ ب۵/۲ و ۶ و ۱۰ و ۱۱ و ۱۳ و ۱۶ ب۶/۱ ب۱۵/۷

ب۱۸/۱۶ ب۱۹/۴ ب۲۱/۱۷ و ۱۹ ب۲۲/۳ و ۵ و ۶ ب۲۶/۱۰۔

فصل الخاء المعجمۃ

رُخَآءً. ملائم، نرم نرم، اسم ہے، رِخۡوَۃٌ اور رَخَاوَۃٌ سے جس کے معنی نرم ہونے کے ہیں ماخوذ ہے۔ ب۲۳/۱۲

فصل الدال المھملۃ

رَدَّ. اس نے پھیر دیا، اس نے لوٹا دیا، اس نے واپس کر دیا (نَصَرَ) رَدٌّ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو رَدُّوۡھَا) ب۲۱/۱۹

[1] ترجمان القرآن ج۱ ص۳۹ [2] فقہ اللغۃ باب ۲ فصل ۱۵ فی تفصیل اسماء الخمر وصفاتہا۔ [3] فتح الباری ج۸ ص۱۱۴

رِدْءًا۔ مددگار، مدد دینے والا، جو دوسرے کی مدد کے لئے ساتھ چلے رِدْءٌ کہلاتا ہے، رِدْءٌ سے جس کے معنی مدد کرنے کے ہیں صفت مشبہ کا صیغہ اَرْدَاءٌ جمع، پ۲۰

رُدَّتْ۔ وہ واپس کردی گئی، وہ پھیردی گئی، وہ لوٹادی گئی، رَدٌّ سے، ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب، پ۱۳

رُدِدْتُ۔ میں لوٹایا گیا، مجھکو واپس کیا گیا، مجھے پھیرا گیا، رَدٌّ سے، ماضی مجہول کا صیغہ واحد متکلم، پ۱۵

رَدَدْنَا۔ ہم نے پھیر دیا، ہم نے لوٹا دیا، ہم نے واپس کردیا، رَدٌّ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم پ۱۵

رَدَدْنٰهُ۔ ہم نے اس کو پھیر دیا، ہم نے اس کو واپس کردیا، ہم نے اس کو لوٹا دیا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، پ۳۰ پ۲۰

رَدِفَ۔ وہ پیچھے لگا، وہ پیچھے ہوا (ع) رِدْفٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو رَادِفَةٌ) پ۳۰

رَدْمًا۔ موٹی دیوار، مضبوط دیوار، سد محکم، رَدَمَ یَرْدِمُ کا مصدر ہے، جس کے معنی رخنہ کو پتھروں سے بند کردینے کے ہیں مگر یہاں مصدر بمعنی اسم مفعول ہے، پ۱۶

رَدُّوْا۔ انھوں نے الٹا دیا، انھوں نے لوٹا دیا، انھوں نے پھیر دیا، رَدٌّ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، آیہ شریفہ فَرَدُّوْا اَیْدِیَهُمْ فِیْ اَفْوَاهِهِمْ (پھر انھوں نے اپنے ہاتھ لوٹا دیئے اپنے منہ میں) کے تین معانی بیان کئے گئے ہیں (۱) غصہ کے مارے پشت دست کاٹنے لگے، (۲) منہ پر ہاتھ لیجا کر خاموش کرنے لگے (۳) اَفْوَاهِهِمْ میں هِمْ کی ضمیر بجانب انبیاء راجع کی جائے یعنی انبیاء کے منہ پر ہاتھ رکھنے لگے رَدٌّ کے استعمال سے یہاں اس بات پر تنبیہ مقصود ہے کہ انھوں نے بار بار ایسا کیا، پ۱۳

رُدُّوْا۔ وہ واپس لائے گئے، وہ لوٹائے گئے وہ پھیرے گئے، رَدٌّ سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ۷ پ۸ پ۱۱

رَدُّوْهُ۔ انھوں نے اس کو لوٹا دیا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، [illegible] پ۵

رُدُّوْهُ۔ اس کو پھیر دو، اس کو لوٹاؤ، اس کو پھیر دو، رُدُّوْا رَدٌّ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، پ۲۶

رُدُّوْهَا۔ اس کو پھیر دو، اس کو واپس لاؤ، اس

میں ھا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے۔ پ ۲۳/۱۲

رَدَّهَا ۔ اس کا پھیر دینا، رَدَّ مضاف ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، رَدٌّ رَدَّ یَرُدُّ کا مصدر ہے جس کے معنی کسی شئے کے لوٹانے کے ہیں خواہ ذات شئے کو لوٹایا جائے یا اس کی کسی حالت کو، پ

رَدِّهِنَّ ۔ ان (عورتوں) کا لوٹانا، ان کا پھیر لینا رَدِّ مضاف ھِنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب مضاف الیہ، پ ۲/۱۲

فصل الزاء المعجمة

رَزَّاقٌ ۔ رزق دینے والا (روزی) دینے والا رِزْقٌ سے جس کے معنی روزی دینے کے ہیں بروزن فَعَّالٌ مبالغہ کا صیغہ، امام حلیمی کہتے ہیں "رزق پر رزق کثرت سے اور وسعت کے ساتھ دینے والا رزاق ہے" امام خطابی کا بیان ہے کہ رزاق وہ ذات ہے جو رزق کی متکفل ہے اور ہر جان کے قیام کے لئے جس قدر قوت کی ضرورت ہے اس کی بہم پہنچانے والی ہے۔[1] یاد رہے کہ اس لفظ کا اطلاق بجز ذات باری کے غیر پر جائز نہیں ہے، پ ۲۷

رِزْقٌ ۔ روزی، رزق، راغب لکھتے ہیں کہ "رزق کبھی تو عطا جاری کو کہا جاتا ہے خواہ دنیوی ہو یا اخروی اور کبھی حصہ کو، اور کبھی جو پیٹ میں پہنچ کر غذا بن جاتی ہے اس کو" عطاء دنیوی کی مثال فِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ (آسمان میں ہے تمہاری روزی) اور عطاء اخروی کی مثال وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا (اور ان کو ہے ان کی روزی وہاں صبح اور شام) اور حصہ کی مثال وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنَّكُمْ تُكَذِّبُونَ (اور اپنا حصہ یہی لیتے ہو کہ تم جھٹلاتے ہو) اور غذا کی مثال فَلْيَأْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ (سو وہ تمہارے لئے اس میں سے کھانا لے آئے) ہے۔ أَرْزَاقٌ جمع
پ ۱/۷، پ ۸/۱۱، پ ۹/۱۵، پ ۱۰/۶، پ ۱۱/۱۱، پ ۱۳/۵، پ ۱۴/۱۶، پ ۱۵/۳ و ۱۷، پ ۱۶/۱۷، پ ۱۷/۱۴، پ ۱۸/۹، پ ۲۰/۱۱ و ۱۲، پ ۲۱/۲ و ۷، پ ۲۲/۴ و ۸ و ۹ و ۱۰ و ۱۱، پ ۲۳/۶، پ ۲۴/۲، پ ۲۵/۳ و ۴ و ۱۰، پ ۲۷/۲، رِزْقًا، پ ۱/۳، پ ۳/۱۲، پ ۱۲/۸، پ ۱۳/۱۷، پ ۱۴/۱۵ و ۱۹، پ ۱۶/۱۷، پ ۱۷/۱۵، پ ۳۰/۱ و ۱۲، پ ۲۲/۱، پ ۲۴/۷، پ ۲۶/۱۵، پ ۲۸/۱۸

رِزْقُكُمْ تمہارا رزق، تمہاری روزی، رِزْقُ مضاف كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ پ ۲۶/۱۸، پ ۲۷/۱۶

[1] کتاب الاسماء والصفات امام بیہقی ص ۵۰ ۔

رَزَقَكُمْ۔ اس نے تم کو روزی دی، اس نے تم کو رزق دیا، رَزَقَ رِزْقٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، (ملاحظہ ہو اُرْزُقْ) پ ۲/۲، پ ۸/۱۴ و ۱۳، پ ۹/۱۷، پ ۱۴/۱۶ و ۱۷، پ ۱۶/۷، پ ۲۳/۳، پ ۲۴/۱۲

رِزْقُنَا۔ ہمارا رزق، ہماری روزی، رِزْقُ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، پ ۲۳/۱۴

رُزِقْنَا۔ ہمیں روزی دی گئی، ہمیں رزق دیا گیا، رَزْقٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع متکلم۔ پ ۱/۳

رَزَقْنٰكُمْ۔ ہم نے تم کو رزق دیا، ہم نے تم کو روزی دی، رَزَقْنَا رَزْقٌ سے، ماضی کا صیغہ جمع متکلم، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، پ ۱/۶، پ ۲/۵، پ ۳/۲، پ ۹/۱۰، پ ۱۶/۱۴، پ ۲۱/۷، پ ۲۵/۱۴

رَزَقْنٰهُ۔ ہم نے اس کو روزی دی، ہم نے اس کو رزق دیا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، پ ۱۴/۱۴

رَزَقْنٰهُمْ۔ ہم نے ان کو روزی دی، ہم نے ان کو رزق دیا، اس میں هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، پ ۱/۱، پ ۹/۱۵، پ ۱۱/۱۵، پ ۱۳/۹ و ۱۷، پ ۱۴/۱۳، پ ۱۵/۷، پ ۱۷/۱۲، پ ۲۰/۹، پ ۲۱/۱۵، پ ۲۲/۱۹، پ ۲۵/۵ و ۸، ۱

رَزَقَنِیْ۔ اس نے مجھے رزق دیا، اس نے مجھے روزی دی، ن وقایہ ی ضمیر واحد متکلم۔

ملاحظہ ہو رَزَقَكُمْ) پ ۳۰/۸

رُزِقُوْا۔ وہ روزی دیئے گئے، ان کو رزق دیا گیا، رَزْقٌ سے، ماضی مجہول کا صیغہ، جمع مذکر غائب، پ ۱/۳

رِزْقُهٗ۔ اس کا رزق، اس کی روزی، رِزْقُ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، مضاف الیہ، پ ۲۸/۱۷، پ ۲۹/۲، پ ۳۰/۱۴

رِزْقُهَا۔ اس کا رزق، اس کی روزی رِزْقُ مضاف هَا ضمیر واحد مونث غائب مضاف الیہ پ ۱۲/۱، پ ۱۴/۲۱، پ ۲۱/۱

رِزْقُهُمْ، ان کا رزق، ان کی روزی، رِزْقُ مضاف، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ پ ۱۴/۱۶، پ ۱۷/۷

رَزَقَهُمْ۔ اس نے ان کو رزق دیا۔ اس نے ان کو روزی دی، اس میں هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے (ملاحظہ ہو رَزَقَكُمْ) پ ۵/۴، پ ۸/۴، پ ۱۷/۱۱ و ۱۲

رِزْقُهُنَّ ان (عورتوں) کی روزی، ان کا رزق رِزْقُ مضاف، هُنَّ ضمیر جمع مونث غائب مضاف الیہ، پ ۲/۱۴

فصل السین المھملۃ

رَسّ - کنواں، ابنِ ابی حاتم نے مجاہد سے جو کبار تابعین میں سے مشہور مفسر ہیں یہی معنی نقل کئے ہیں۔ امام بخاریؒ نے "رس" کے معنی معدن (کان) کے بیان کئے ہیں اور اس کی جمع رِساس بتائی ہے، ابوعبیدہ کا بھی یہی قول ہے، خلیل کہتے ہیں "ہر وہ کنواں جس کی کوٹھی پختہ نہ تعمیر کی جائے "رس" کہلاتا ہے"[۱] راغب لکھتے ہیں۔

"بعض کا قول ہے کہ رس ایک وادی ہے شاعر کہتا ہے ع وَهُنَّ لِوَادِي الرَّسِّ كَالْيَدِ لِلْفَمِ، اور اصل میں رس کسی شے کا تھوڑا سا اثر جو پایا جاتا ہے اس کو کہتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے سمعت رسا من الخبر (میں نے کچھ یوں ہی سی خبر سنی) رس الحديث في نفسي (میرے جی میں کچھ بات پڑی) وجد رسا من حمى (اس نے بخار کا کچھ اثر محسوس کیا) رُسَّ الميتُ (میت دفن کی گئی) یعنی اس کی ذات کے بعد اس کا نشان رکھا گیا۔"

"اصحاب الرس" کے متعلق جو تحقیق تھی سابق میں گذر چکی، پ۱۹ ع۱۵

رِسٰلٰتِ - پیغامات، رِسَالَۃٌ کی جمع پ۸ ع۱۶، پ۲۲ ع۱۲، پ۲۹ ع۱۲

رِسٰلٰتِہٖ - اس کے پیغامات، رِسَالٰتِ مضاف ہ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ۲۹ ع۱۲

رِسٰلٰتِیْ - میرے پیغامات، رِسَالٰت مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، پ۹

رِسَالَۃٌ - پیغام، اِرْسَالٌ سے جس کے معنی بھیجنے کے ہیں اسم ہے، اس کے معنی پیغام اور خط کے آتے ہیں رَسَائِلُ اور رِسَالَاتٌ جمع

"رسالت" کی شرعی تعریف علامہ سعد الدین تفتازانی نے ان الفاظ میں کی ہے۔

"هي سفارة العبد بين الله وبين ذوي الالباب من خليقته ليزيح بها عللهم فيما قصرت عنه عقولهم من مصالح الدنيا والآخرة[۲] (وہ اللہ تعالیٰ اور اس کی ہوشمند مخلوق کے مابین بندہ کی سفارت ہے تاکہ اس کے ذریعہ ان کی ان بیماریوں کو زائل کردیا جائے کہ جن میں ان کی عقلیں دنیا و آخرت کی مصلحتوں سے عاجز ہو چکی ہیں" پ۸ ع۱۷

رِسَالَتَہٗ - اس کا پیغام، رِسَالَۃ مضاف

۱؎ فتح الباری ج ۸ ص ۳۷۷ ۲؎ شرح عقائد تفتازانی ص ۹۷ طبع علوی لکھنو

ہ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ پ ۱۲ پ ۹
رُسُلٌ ۔ رسول، پیغمبر، رَسُوْل کی جمع ہے ۔
پ ۱ پ ۳ پ ۵ پ ۶ پ ۷ پ ۸
پ ۱۲ پ ۱۳ پ ۱۴ پ ۱۵ پ ۱۶ پ ۱۷ پ ۱۸ پ ۲۲ پ ۲۳
پ ۲۴ پ ۲۶ پ ۲۹ رُسُلاً پ ۶ پ ۱۱
پ ۱۲ پ ۱۶ پ ۱۸ پ ۲۲ پ ۲۴ ۔
رُسُلُكَ ۔ تیرے پیغمبر، تیرے رسول، رُسُلِ
مضاف كَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ، پ ۴
رُسُلُكُمْ ۔ تمہارے رسول، تمہارے پیغمبر، رُسُلُ
مضاف كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ پ ۲۴
رُسُلُنَا ۔ ہمارے بھیجے ہوئے، ہمارے رسول،
ہمارے پیغمبر، رُسُلُ مضاف، نَا ضمیر جمع متکلم
مضاف الیہ پ ۶ پ ۷ پ ۸ پ ۱۱ پ ۱۲ پ ۱۳ پ ۱۴
پ ۱۶ پ ۲۰ پ ۲۴ پ ۲۵ پ ۲۷
رُسُلُهٗ ۔ اس کے رسول، اس کے پیغمبر، رُسُلُ
مضاف ہ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ
پ ۳ پ ۴ پ ۵ پ ۶ پ ۷ پ ۱۲ پ ۱۳ پ ۲۷ پ ۲۸

رُسُلُهُمْ ۔ ان کے رسول، ان کے پیغمبر
رُسُلُ مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ
پ ۳ پ ۵ پ ۷ پ ۱۱ پ ۱۳ پ ۲۲ پ ۲۴ پ ۲۸
رُسُلِیْ ۔ میرے رسول، میرے پیغمبر، رُسُلِ مضاف
ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ پ ۶ پ ۲۸ پ ۲۸
رَسُوْلٌ ۔ پیغمبر، بھیجا ہوا، رسول رِسَالَۃٌ سے
ہے۔ شیخ شمس الدین قہستانی لکھتے ہیں ۔
"فَعُوْلٌ مبالغہ ہے مُرْسَلٌ مُفْعَلٌ بالفتح کا
اور فَعُوْلٌ کا استعمال اس طرح پر نادر ہی ہوتا ہے"[1]
نبی اور رسول کے مابین کیا نسبت ہے[2]
اس بارے میں تین مختلف رائیں ہیں ۔
(۱) یہ دونوں مساوی ہیں یعنی ہر نبی
رسول ہے اور ہر رسول نبی ہے ۔ علامہ تفتازانی
نے شرح عقائد نسفی اور شرح مقاصد میں
اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور امام ابن ہمام نے
المسائرہ میں اس کو محققین کی طرف منسوب
کیا ہے۔ فرماتے ہیں ۔

---

[1] جامع الرموز ص ۵ طبع نول کشور

[2] جو کچھ ذہن میں حاصل ہو وہ مفہوم ہے، اس کی دو قسمیں ہیں، جزئی اور کلی، جزئی وہ مفہوم ہے جس کے ایک ذات سے زیادہ پر صادق ہونے کو عقل روا نہ رکھے جیسے مفہوم موسیٰ و عیسیٰ علیہما الصلوٰۃ والسلام اور کلی وہ مفہوم ہے جس کے ایک ذات سے زیادہ پر صادق ہونے کو عقل روا رکھے جیسے مفہوم نبی اور رسول کا۔
جو دو کلی ہیں ان میں نسبت چار ہی طرح کی متصور ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یا تو دونوں میں س (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

"واما على ما ذكره المحققون من ان النبى انسان بعثه الله لتبليغ ما اوحى اليه وكذا الرسول فلا فرق"[1] (لیکن محققین نے جو ذکر کیا ہے کہ نبی وہ انسان ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے مبعوث فرمایا ہے کہ جو کچھ اس کی طرف وحی کی ہے اس کی تبلیغ کردے اور اسی طرح رسول اس بنا پر کوئی فرق نہیں ہے۔

لیکن آیت شریفہ "وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی" (یعنی ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول اور نہ نبی) اس قول کی تردید کر رہی ہے کیونکہ عطف مغایرت پر دلالت کرتا ہے اور احد المتساویین کی نفی تساوی آخر کی نفی کو مستلزم ہے، پس اگر ان کے مابین تساوی مانی جائے تو "ولا نبی" کہنے کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ نبی تو رسول ہی کے ذکر میں آگیا اب علیحدہ ذکر کی کیا حاجت،

(۲) یہ دونوں متبائنین ہیں رسول وہ ہے جو جدید شرع لیکر آئے اور نبی وہ ہے جو جدید شرع لیکر نہ آئے۔ پس کوئی رسول نبی نہیں اور کوئی نبی رسول نہیں، لیکن یہ محض غلط ہے، کیونکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے متعلق قرآن مجید میں صاف تصریح ہے "وکان رسولاً

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ہر ایک کلی دوسری کلی کے ہر فرد پر صادق آئے گی جیسے انسان اور ناطق کہ انسان ناطق کے ہر فرد پر صادق آتا ہے اور ناطق انسان کے ہر فرد پر ایسی دو کلیوں کو "متساویین" کہتے ہیں اور ان کی نسبت کو "تساوی" یا دونوں میں سے ہر ایک دوسری کے کسی فرد پر صادق نہ آئے گی جیسے انسان اور گھوڑا، کہ نہ انسان گھوڑے کے کسی فرد پر صادق آتا ہے نہ گھوڑا انسان کے کسی فرد پر ایسی دو کلیوں کو متبائنین کہتے ہیں اور ان کی نسبت کو تبائن، یا دونوں میں سے ایک تو دوسری کے ہر فرد پر صادق آئیگی اور دوسری پہلی کے ہر فرد پر صادق نہ آئیگی بلکہ صرف بعض افراد پر جیسے حیوان اور انسان کہ حیوان تو انسان کے ہر فرد پر صادق آتا ہے اور انسان حیوان کے صرف بعض افراد پر ایسی دو کلیوں میں سے اول کو اعم کہتے ہیں اور دوسری کو اخص اور ان کی نسبت کو عموم خصوص مطلق، مثال مذکور میں حیوان اعم ہے اور انسان اخص، اور یا ان دونوں میں سے ہر ایک دوسری کے صرف بعض افراد پر صادق آئیگی جیسے حیوان اور سپید کہ حیوان سپید کے صرف بعض افراد پر صادق آتا ہے اور سپید حیوان کے صرف بعض افراد پر چنانچہ بطخ پر دونوں صادق ہیں اور ہاتھی پر صرف حیوان صادق ہے اور برف پر صرف سپید ایسی دو کلیوں کو اعم واخص من وجہ کہتے ہیں اور ان کی نسبت کو عموم وخصوص من وجہ۔

[1] (حاشیہ صفحہ ہذا) المسائرہ مع شرحہ المسامرہ ص ۴۲ و طبع انصاری دہلی ۱۳۲۰ھ

نَبِیًّا (اور تھا رسول نبی) اور اسی طرح حضرت
موسیٰ علیہ السلام کے حق میں وارد ہوا ہے۔

(۳) ان دونوں کے مابین عموم خصوص
مطلق ہے۔ اکثر علماء کی یہی رائے ہے اب بعض
تو اس طرف گئے ہیں کہ رسول اعم ہے اور نبی
اخص کیونکہ رسول فرشتہ بھی ہوتا ہے اور انسان
بھی، ارشاد ہے اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ
رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (اللہ چھانٹ لیتا ہے
فرشتوں میں پیغام پہنچانے والے اور آدمیوں
میں) اور نبی صرف انسان ہی ہوتا ہے فرشتہ
نہیں، پس ہر رسول نبی ہوا لیکن ہر نبی رسول
نہیں کیونکہ بعض رسول فرشتے ہوتے ہیں اور جمہور
کا یہ قول ہے کہ نبی اعم ہے اور رسول اخص[1]
پس ہر رسول نبی ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں مگر
اس صورت میں نبی اور رسول میں فرق کیا ہوگا
اور ان دونوں کی شرعی تعریف کیا ہوگی۔ اس
سلسلہ میں سخت اختلاف اقوال ہے جو درج
ذیل ہے حضرت شاہ عبد القادر صاحبؒ نے جمہور
کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے۔

"جس کو اللہ سے وحی آئی وہ نبی ہے اور ان میں
جو خاص ہیں امت رکھتے ہیں یا کتاب وہ رسول
ہیں"[2]

قاضی ناصر الدین علامہ عبد اللہ بن عمر البیضاوی
لکھتے ہیں۔

"رسول وہ ہے جس کو اللہ نے شریعت جدیدہ
دیکر مبعوث فرمایا ہو تاکہ وہ لوگوں کو اس کی طرف
دعوت دے اور نبی اس کو بھی عام ہے اور اس
کو بھی کہ جس کو شرع سابق کے برقرار رکھنے کے لئے
بھیجا ہو، جیسے وہ انبیاء بنی اسرائیل جو حضرت
موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کے مابین ہوئے ہیں،
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے علماء
کو ان انبیاء سے اسی بنا پر تشبیہ دی ہے، پس
نبی، رسول سے اعم ہے اور اس پر یہ چیز بھی
دلالت کرتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
سے انبیاء کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ
ایک لاکھ چوبیس ہزار، عرض کیا گیا ان میں رسول
کتنے ہیں فرمایا تین سو تیرہ کا جم غفیر اور بعض کا
قول ہے رسول وہ ہے کہ معجزہ اور کتاب جو اس پر

[1] واضح رہے کہ اس بحث کے سلسلہ میں ہمارے پیش نظر نبراس شرح شرح عقائد مصنفہ علامہ عبد العزیز بن احمد فرہاری
ص ۲۹ طبع ہاشمی میرٹھ ہے۔ [2] موضح القرآن، تفسیر سورہ مریم۔

نازل کی گئی ہو دونوں کا جامع ہو اور جو نبی ہی ہو رسول نہ ہو وہ ہے جس کے پاس کتاب نہ ہو اور بعض کہتے ہیں رسول وہ ہے جس کے پاس فرشتہ وحی لیکر آئے اور نبی اس کو بھی کہا جاتا ہے اور نیز اس کو بھی جس کی طرف خواب میں وحی کی جائے"[1]

محدث ملا علی قاری، المنہج الازہر شرح الفقہ الاکبر میں فرماتے ہیں۔

" زیادہ تر مشہور فرق جو ان دونوں میں منقول ہے یہ ہے کہ نبی رسول سے اعم ہے کیونکہ رسول وہ ہے جو تبلیغ پر مامور ہو اور نبی وہ ہے جس کی طرف وحی کی جائے خواہ وہ تبلیغ پر مامور ہو یا نہ ہو"[2]

شیخ ابن ہمام نے المسائرہ میں اس فرق کو بعض اہل ظواہر و اصحابِ حدیث کی طرف منسوب کیا ہے[3]۔ شیخ اکبر محی الدینؒ ابن عربی بھی فتوحاتِ مکیہ میں اسی کے قائل ہیں[4] اور علامہ جلال الدین دوانی نے بھی تفسیر جلالین میں اسی کو اختیار کیا ہے[5]۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے کتاب النبوات میں اس سلسلہ میں ایک نفیس بحث سپردِ قلم فرمائی ہے جو ہدیۂ ناظرین کر فرماتے ہیں۔

" نبی وہ ہے جس کو اللہ بتلاتا ہے اور وہ جو کچھ اللہ بتلاتا ہے اس کو بتاتا ہے اب اگر اسی کے ساتھ وہ اس شخص کی طرف بھی بھیجا گیا کہ جو حکم الٰہی کا مخالف ہے تاکہ اس کو اللہ کے پیغام کی تبلیغ کرے تو وہ رسول ہے، لیکن جس صورت میں کہ وہ پہلی ہی شریعت پر عامل ہے اور کسی کی طرف اس کو بھیجا نہیں گیا کہ جسے وہ اللہ کی طرف سے پیغام پہنچائے تو وہ "نبی" ہوگا رسول نہیں اللہ فرماتا ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ (اور ہم نے جو رسول بھیجا تجھ سے پہلے یا نبی سو جب لگا خیال باندھنے شیطان نے ملا دیا اس کے خیال میں) "ارسال" کا ذکر فرماکر جو ہر دو نوع کو عام ہے ان میں سے ایک کو بایں طور خاص کیا ہے کہ وہ رسول ہے اور یہی وہ رسول مطلق ہے جو اللہ کے مخالفوں کی طرف تبلیغِ رسالت پر مامور ہے جیسے حضرت نوح علیہ السلام۔ صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ وہ پہلے رسول ہیں جو اہلِ زمین کی طرف مبعوث

[1] تفسیر انوار التنزیل ج ۲ ص ۶۴ [2] شرح فقہ اکبر ص ۵۸ طبع مصر [3] المسائرہ ص ۹۴
[4] فتوحات مکیہ باب ۱۴ و ۱۵۹ [5] تفسیر جلالین سورۂ حج۔

ہوئے اوران سے پہلے جو تھے انبیار تھے جیسے
حضرت شیث اور حضرت ادریس علیہما السلام اور
ان دونوں سے بھی پہلے حضرت آدم علیہ السلام جونبی
مکلم تھے (یعنی ان سے حق تعالیٰ نے کلام فرمایا تھا)
حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ
حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام کے مابین
دس قرن گزرے ہیں جو سب کے سب اسلام پر
تھے، ان انبیار پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی
آتی تھی جس پر یہ خود بھی عمل پیرا ہوتے تھے اوران
مومنوں کو بھی حکم فرماتے تھے جو ان کے پاس تھے
کیونکہ وہ سب ان پر ایمان رکھتے تھے ٹھیک
اسی طرح جس طرح کہ ایک شریعت والے ان
تمام باتوں کو مانتے ہیں کہ جن کی علما رسول کی
طرف سے تبلیغ کرتے ہیں اور یہی حال انبیار
بنی اسرائیل کا ہے کہ وہ شریعت تورات کے مطابق
حکم کرتے تھے اور گو ان میں سے کسی کی طرف
ایک معین واقعہ میں خاص وحی بھی کی جاتی تھی
تاہم شریعت تورات میں ان کی مثال اسی عالم
کی سی ہے جس کو اللہ عزوجل کسی قضیہ میں ایسے معنی
سمجھادیں جو مطابق قرآن ہوں جیسے کہ اللہ
عزوجل نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس قضیہ کا

حکم سمجھایا کہ جس میں انھوں نے اور حضرت
داؤد علیہ السلام نے فیصلہ کیا تھا۔
پس انبیار کو تو اللہ تعالیٰ بتلاتا اور اپنے
امرونہی اور خبر سے ان کو مطلع فرماتا ہے اور وہ
ان لوگوں کو کہ جو ان پر ایمان لاتے ہیں اللہ عزوجل
نے جو کچھ خبر دی ہے اور امرونہی سے مطلع فرمایا
ہے بتلاتے ہیں، پھر اگر کفار کی طرف بھی رسول
ہوئے تو ان کو توحیدِ الٰہی اور اس وحدہٗ لاشریک لہٗ
کی عبادت کی دعوت دیتے ہیں۔
نیز یہ ضروری ہے کہ رسولوں کی ایک قوم
تکذیب کرے، اللہ عزوجل فرماتا ہے کَذٰلِكَ
مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا
قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ (اسی طرح ان سے
پہلے لوگوں کے پاس جو رسول آیا تو یہی کہا کہ
جادوگر ہے یا دیوانہ) اور ارشاد ہے مَا يُقَالُ
لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ (تجھ
سے وہی کہیں گے جو کہدیا ہے سب رسولوں
سے تجھ سے پہلے) وجہ یہ ہے کہ رسول مخالفوں
ہی کی طرف بھیجے جاتے ہیں اس لئے ان کی ایک
جماعت ان کو جھٹلاتی ہے ارشاد ہے وَمَآ
اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ

مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاۗءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَاۗءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ (اور جتنے بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے یہی مرد تھے کہ حکم بھیجتے تھے ہم ان کو بستیوں کے رہنے والے، سو کیا یہ لوگ نہیں پھرے ملک میں کہ دیکھ لیتے کیسا ہوا انجام ان کا جو ان سے پہلے تھے اور پچھلا گھر تو بہتر ہے پرہیز کرنے والوں کو، کیا اب بھی تم نہیں سمجھتے، یہاں تک کہ جب ناامید ہونے لگے رسول اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا تھا، پہنچی ان کو مدد ہماری، پھر بچا دیا جن کو ہم نے چاہا اور پھیری نہیں جاتی آفت ہماری قوم گنہگار سے)

اور فرمایا اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ (ہم مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی دنیا کی زندگانی میں اور جب کھڑے ہوں گے گواہ)

ارشادِ ربانی وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اس امر کی دلیل ہے کہ نبی بھی مرسل ہی ہوتا ہے لیکن اطلاق کے وقت وہ رسول سے موسوم نہیں ہوگا کیونکہ وہ کسی قوم کی طرف ایسی باتیں لیکر نہیں بھیجا گیا کہ جن سے وہ واقف نہ ہوں بلکہ اہلِ ایمان کو ان باتوں کا حکم دیتا تھا کہ جن کے حق ہونے کو وہ جانتے ہیں جو نوعیت کہ ایک عالم کی ہوتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لئے ارشاد فرمایا ہے العلماء ورثۃ الانبیاء (علماء انبیاء کے وارث ہیں)۔

نیز رسول کی شرط یہ بھی نہیں ہے کہ وہ نئی شریعت ہی لیکر آئے کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام باوجود رسول ہونے کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر تھے، نیز حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام دونوں کے دونوں رسول تھے اور شریعتِ تورات پر تھے، حق تعالیٰ مومن آلِ فرعون کی زبانی فرماتے ہیں وَلَقَدْ جَاۗءَكُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَاۗءَكُمْ بِهٖ ۭ حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْ

بَعْدِہٖ رَسُوْلًا (اور تمہارے پاس آچکا ہے
یوسف اس سے پہلے کھلی باتیں لیکر پھر تم رہے
دھوکے ہی میں ان چیزوں سے جو وہ لایا یہانتک
کہ جب مر گیا کہنے لگے ہرگز نہ بھیجے گا اللہ اس کے
بعد کوئی رسول) اور فرمایا اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ
کَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِہٖ
وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَ
اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِیْسٰی وَ
اَیُّوْبَ وَیُوْنُسَ وَھٰرُوْنَ وَسُلَیْمٰنَ وَاٰتَیْنَا
دَاوٗدَ زَبُوْرًا وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰھُمْ عَلَیْکَ
مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْھُمْ عَلَیْکَ
وَکَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا (ہم نے وحی بھیجی
تیری طرف جیسے وحی بھیجی نوحؑ پر اور ان نبیوں
پر جو اس کے بعد ہوئے، اور وحی بھیجی ابراہیمؑ پر
اور اسمٰعیلؑ پر اور اسحٰقؑ پر اور یعقوبؑ پر اور اس
کی اولاد پر اور عیسیٰؑ پر اور ایوبؑ پر اور یونسؑ پر
اور ہارونؑ پر اور سلیمانؑ پر اور ہم نے دی داؤدؑ
کو زبور اور بھیجے ایسے رسول جن کا احوال ہم نے
سنایا تجھ کو اس سے پہلے اور ایسے رسول جن کا
احوال نہیں سنایا تجھکو اور باتیں کیں اللہ نے
موسیٰؑ سے بول کر)۔

اور ارسال اسم عام ہے جو ارسالِ ملائکہ
ارسالِ ریاح، ارسالِ شیاطین اور ارسالِ نار،
سب پر مشتمل ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یُرْسَلُ
عَلَیْکُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ (چھوٹتے
ہیں تم پر شعلے آگ کے صاف اور دھواں ملے)
اور ارشاد ہے جَاعِلِ الْمَلٰٓئِکَةِ رُسُلًا
اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ (جس نے ٹھیرائے فرشتے پیغام
لانے والے جن کے پر ہیں) یہاں سب فرشتوں کو
رسول قرار دیا گیا ہے اور مَلَک لغت میں اس کو
کہتے ہیں جو الوکة یعنی رسالت کا حامل ہو اور دوسری
جگہ فرمایا اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَةِ رُسُلًا
وَّمِنَ النَّاسِ (اللہ چھانٹ لیتا ہے فرشتوں
میں پیغام پہنچانے والے اور آدمیوں میں) اور یہ
وہ ہیں جن کو وحی دیکر بھیجتا ہے چنانچہ ارشاد ہے
وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحْیًا
اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا
فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَآءُ (اور کسی آدمی کی
طاقت نہیں کہ اس سے باتیں کرے اللہ مگر اشارے
سے یا پردے کے پیچھے یا بھیجے کوئی پیغام لانے
والا پھر پہنچا دے اس کے حکم سے جو وہ چاہے)
اور فرمایا ھُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًا

بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِہٖ (وہی ہے کہ چلاتا ہے ہوائیں خوش خبری لانے والی مینہ سے پہلے) اور ارشاد فرمایا اِنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ تَؤُزُّھُمْ اَزًّا (ہم نے چھوڑ رکھے ہیں شیطان منکروں پر اچھالتے ہیں ان کو ابھار کر) لیکن لفظ رسول جبکہ اللہ کی طرف مضاف ہو اور رسول اللہ کہا جائے تو اس سے وہی سمجھا جائے گا جو اللہ کی طرف سے پیغام لیکر آئے خواہ فرشتہ ہو خواہ بشر ہو، چنانچہ ارشاد ہے اَللہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ اور فرشتے کہتے ہیں یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ لَنْ یَّصِلُوْٓا اِلَیْکَ (اے لوطؑ ہم بھیجے ہوئے ہیں تیرے رب کے وہ ہرگز نہ پہنچ سکیں گے تجھ تک) اور عام فرشتوں اور ہواؤں اور جنوں کا ارسال کسی فعل کی انجام دہی کے لئے ہوتا ہے تبلیغ رسالت کے لئے نہیں، اللہ فرماتا ہے۔ اُذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللہِ عَلَیْکُمْ اِذْ جَآءَتْکُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْھِمْ رِیْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْھَا وَکَانَ اللہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا (یاد کرو احسان اللہ کا جب چڑھ آئیں تم پر فوجیں پھر ہم نے بھیجدی ان پر ہوا اور وہ فوجیں جو تم نے نہیں دیکھیں اور ہے اللہ جو کچھ تم کرتے ہو دیکھنے والا) پس اللہ کے جو رسول اللہ کی طرف سے امر ونہی کی تبلیغ کرتے ہیں عند الاطلاق یہی اللہ کے رسول ہیں۔[۵]

غرض امام موصوف کے نزدیک جس کو اللہ کی طرف سے وحی آئے اور وہ مومنین ہی کو احکام الٰہی کی تعلیم دے وہ نبی ہے اور جو اس کی دعوت کافروں کے لئے بھی عام ہو تو رسول ہے

امام موصوف نے طبقاتِ انبیاء کے سلسلہ میں بھی ایک اہم فرق واضح کیا ہے جو یاد رکھنے کے قابل ہے، فرماتے ہیں۔

" (جس طرح اولیاء اللہ میں دو طبقے ہیں، سابقین مقربین، اور اصحاب یمین مقتصدین) اسی کی نظیر انبیاء علیہم السلام میں عبد رسول اور نبی ملک کی تقسیم ہے۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دونوں کے درمیان اختیار عطا فرمایا تھا کہ خواہ عبد رسول بنیں خواہ نبی ملک آپ نے عبد رسول بننا اختیار فرمایا۔

---

۵ ملاحظہ ہو کتاب النبوات ص ۱۷۲ و ۱۷۳ و ۱۷۴ طبع منیریہ مصر ۱۳۴۶ھ

پس "نبی ملک" تو جیسے داؤد و سلیمان علیہما السلام
اور ان کے امثال ہیں، اللہ تعالیٰ حضرت سلیمان
پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قصے میں ارشاد
فرماتا ہے، قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَھَبْ لِیْ
مُلْکًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ اِنَّکَ
اَنْتَ الْوَھَّابُ. فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّیْحَ تَجْرِیْ
بِاَمْرِہٖ رُخَآءً حَیْثُ اَصَابَ ۙ وَالشَّیٰطِیْنَ
کُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ۙ وَّاٰخَرِیْنَ مُقَرَّنِیْنَ
فِی الْاَصْفَادِ ۔ ھٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ
اَوْ اَمْسِکْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۔ (اس نے عرض کیا
کہ اے میرے رب مجھے بخش دے اور مجھکو عطا فرما
ایسی بادشاہی کہ کسی کو سزاوار نہ ہو میرے بعد
بیشک تو بہت دینے والا ہے تو ہم نے اس کا تابع
بنا دیا ہوا کو کہ چلتی تھی اس کے حکم سے نرم نرم
جہاں پہنچنا چاہتا، اور شیطان سارے عمارت
بنانے والے اور غوطے لگانے والے اور کتنے اور
بندھے ہوئے بیڑیوں میں، یہ ہے ہماری عطا
پس احسان کر دیا رکھ چھوڑ کچھ حساب نہیں) یعنی
جس کو چاہو عطا کرو اور جس کو چاہو محروم، تم پر کچھ
حساب نہیں، پس "نبی ملک" پر جو کچھ فرض کیا گیا
وہ اس کو انجام دیتا ہے اور جس کو اللہ نے
اس پر حرام کر دیا اسے ترک کر دیتا ہے اور ولایت
و مال میں جس طرح پسند کرتا اور مناسب سمجھتا ہے
تصرف کرتا ہے بغیر اس کے کہ اس پر کچھ گناہ ہو۔

لیکن عبد رسول بغیر اپنے رب کے حکم
کے کسی کو نہیں دیتا اور یہ نہیں کرتا کہ جسے چاہے
عطا کر دے اور جسے چاہے محروم رکھے بلکہ جس کو
عطا کرنے کا رب حکم دے اسے عطا کرتا اور جس
کی تولیت کا امر کرے اسے والی بناتا ہے پس
اس کے سارے کے سارے کام اللہ تعالیٰ کی
عبادات ہیں، چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت
ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے
ارشاد فرمایا۔ انی واللہ لا اعطی احدا ولا
امنع احدا انما انا قاسم اضع حیث امرت
میں اللہ کی قسم نہ کسی کو عطا کرتا ہوں اور نہ کسی سے
روکتا ہوں میں تو صرف تقسیم کرنے والا ہوں جہاں
مجھے حکم دیا گیا رکھ دیتا ہوں۔

اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اموالِ شرعیہ
کو اللہ اور رسول کی طرف منسوب کرتا ہے چنانچہ
ارشادِ الٰہی ہے قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ
(کہدو کہ مالِ غنیمت اللہ کا ہے اور رسول کا)

اور مَا اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ (جو کچھ دلایا اللہ نے اپنے رسول کو بستیوں والوں سے سو اللہ اور رسول کے لئے) اور وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ (اور جان رکھو کہ جو غنیمت لاؤ کچھ چیز سو اللہ کے واسطے اس میں سے پانچواں حصہ اور رسول کے واسطے)۔

اور اسی لئے اقوال علماء میں ظاہر یہی قول ہے کہ یہ اموال ولی الامر کے اجتہاد کے مطابق وہاں خرچ کئے جائیں جہاں اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہو، چنانچہ امام مالکؒ اور دیگر سلف کا یہی مذہب ہے اور امام احمدؒ سے بھی یہی مشہور ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے تین حصے کر دئیے جائیں چنانچہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اسی کے قائل ہیں۔

مقصود یہاں یہ ہے کہ عبد رسول، نبی ملک سے افضل ہے چنانچہ حضرت ابراہیم حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ حضرت محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام افضل ہیں حضرت یوسف حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام سے کہ مقربین سابقین ابرار اصحاب الیمین سے افضل ہیں۔“ سلہ

امام ابن تیمیہؒ نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ

”اولیاء اللہ میں سب سے افضل مرسلین ہیں اور مرسلین میں سب سے افضل اولوالعزم ہیں، نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ...... اور ان اولوالعزم میں سب سے افضل محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین امام المتقین، سید ولد آدم اور امام الانبیاء ہیں۔“ سلہ

اور محدث ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے جد امجد ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام افضل ہیں اور (بقیہ تینوں حضرات میں) ظاہر یہ ہے کہ نوح علیہ السلام افضل ہیں پھر موسیٰ علیہ السلام پھر عیسیٰ علیہ السلام . . . . اور ہمارے شیخ المشائخ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان تینوں میں کون افضل ہو اس کے متعلق میں کسی روایت

سلہ الفرقان بین اولیاء الرحمٰن و اولیاء الشیطان ص ۴۴ طبع احمدی لاہور

سلہ ایضاً ص ۹ و ۱۰

واقف نہیں ہو سکا۔ ؎۱

انبیاء ورسل کی تعداد کے بارے میں جو روایتیں آئی ہیں ان پر تفصیلی بحث لفظ انبیاء کے ضمن میں گزر چکی ہے اور چونکہ ان روایتوں کو قطعیت کا درجہ حاصل نہیں اس لئے علماء کے نزدیک یہ مسلم ہے کہ ان کی تعداد کا مسئلہ ظنی ہے اعتقادی نہیں۔

جن میں بھی رسول ہوئے یا نہیں، علماء اس میں مختلف ہیں، ضحاک سے جب اس کے متعلق سوال ہوا تو کہنے لگے ہاں، کیا اللہ کو یہ فرماتے ہوئے نہیں سنا یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ (اے جماعت جنوں کی اور آدمیوں کی کیا نہ آئے تھے تمہارے پاس پیغمبر تمہیں میں سے) یعنی انسانوں میں سے پیغمبر اور جنوں میں سے پیغمبر۔ کلبی کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل جن وانس دونوں میں رسول مبعوث ہوتے تھے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جن وانس سب کی طرف معبوث ہوئے۔ ؎۲

علامہ ابن حزم کہتے ہیں حدیث میں آیا ہے وکان النبی یبعث فی قومہ (اور نبی اپنی قوم میں مبعوث ہوتا تھا) اور جن قوم انس میں سے نہیں لہٰذا ثابت ہوا کہ جن کے لیے بھی جن ہی میں انبیاء ہوئے ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ بجز ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ ان کی بعثت جن وانس کے لیے بالاتفاق عام ہے انسانوں میں سے کوئی نبی جن کی طرف مبعوث نہیں ہوا۔ ؎۳

اور اکثر علماء اس طرف گئے ہیں کہ جن میں کوئی رسول نہیں ہوا۔ صرف انسانوں میں رسول ہوئے ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں۔

"جمہور ضحاک کے استدلال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ "رسل انس" وہ رسول ہیں جو انسانوں کی طرف اللہ کی جانب سے بھیجے گئے ہیں اور "رسل جن" کو اللہ نے زمین پر منتشر فرمایا کہ وہ رسل انس کی باتوں کو سن کر اپنی قوم کو تبلیغ کریں۔ اسی لیے ان کا کہنے والا کہتا ہے

؎۱ المنہج الازہر شرح الفقہ الاکبر ص ۱۰۵ ؎۲ معالم التنزیل امام بغوی ج ۲ ص ۱۵۲
؎۳ فتح الباری ج ۶ ص ۲۴۵

اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰى. الآیہ

(ہم نے سنی ایک کتاب جو اتری ہے موسیٰ

کے بعد)" [1]

امام بغوی فرماتے ہیں

"مجاہد کہتے ہیں کہ انسانوں میں رسول

ہوئے ہیں اور جنوں میں نذیر، اور انہوں نے

تلاوت کیا وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ (پھر گئے

اپنی قوم کی طرف ڈراتے ہوئے)" منذرین

وہ ہیں جو پیغمبروں کی باتیں سن کر جو کچھ سنا جنوں

میں جا کر اس کی تبلیغ کرتے ہیں اور جن میں پیغمبر

نہیں ہوتے۔ اس صورت میں ارشاد الٰہی

رُسُلٌ مِّنْكُمْ میں کُمْ کی ضمیر ایک صنف یعنی

صرف انس کی طرف راجع ہوگی، جس طرح

کہ ارشاد ہے يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ

(نکلتا ہے ان سے موتی اور مونگا) حالانکہ

کھاری سے نکلتا ہے شیریں سے نہیں،

اور فرمایا وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا

(اور رکھا چاند ان میں اجالا) حالانکہ وہ صرف

ایک ہی آسمان میں ہے" [2]

واضح رہے کہ قرآن مجید میں رسول سے کہیں

فرشتہ مراد ہے اور کہیں نبی، اس لیے حسب موقع

و محل معنی لیے جائیں گے، نیز لفظ رسول کا اطلاق

واحد اور جمع دونوں کے لیے ہوتا ہے، ارشاد ہے

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (آیا ہے

تمہارے پاس رسول تم میں کا) اور اِنَّا رَسُوْلُ

رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (ہم پیغام لائے ہیں جہان

کے صاحب کا) رَسُوْلٌ کی جمع رُسُلٌ ہے

پ ۱: ۱۱، ۱۲ — پ ۲: ۱، ۱۰ — پ ۳: ۸، ۱۲، ۱۳، ۱۷ — پ ۴: ۵، ۶، ۱۷، ۹، ۱۰

پ ۵: ۳، ۵، ۷، ۸، ۹، ۱۴ — پ ۶: ۲، ۳، ۱۰، ۱۴ — پ ۷: ۱، ۲، ۳، ۴ — پ ۸: ۵، ۶، ۱۴

پ ۹: ۳، ۹، ۱۰، ۱۵، ۱۷ — پ ۱۰: ۱، ۸، ۱۳، ۱۷ — پ ۱۱: ۴، ۵، ۱۰ — پ ۱۲: ۱۷

پ ۱۳: ۱۲، ۱۳ — پ ۱۴: ۱، ۲ — پ ۱۶: ۵، ۱۴ — پ ۱۷: ۲، ۴، ۱۷ — پ ۱۸: ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۹

پ ۱۹: ۱، ۹، ۸، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴ — پ ۲۰: ۱۴ — پ ۲۱: ۱۹ — پ ۲۲: ۲، ۴ — پ ۲۳: ۱

پ ۲۴: ۱۳ — پ ۲۵: ۹، ۱۱، ۱۴ — پ ۲۶: ۸، ۱۰، ۱۲، ۱۸ — پ ۲۷: ۲، ۷، ۱۷ — پ ۲۸: [illegible]

پ ۲۹: ۵، ۶، ۱۲، ۱۳ — پ ۳۰: ۶، ۱۷، ۲۲، ۲۳

رَسُوْلًا: پ ۱: ۱۵

پ ۲: ۲ — پ ۳: ۱۳ — پ ۴: ۸ — پ ۵: ۸ — پ ۱۴: ۱۱ — پ ۱۵: ۲، ۱۰، ۱۱ — پ ۱۶: ۷، ۱۷

پ ۱۸: ۱۲ — پ ۱۹: ۲ — پ ۲۰: ۸، ۹ — پ ۲۲: ۵ — پ ۲۴: ۹ — پ ۲۵: ۴

پ ۲۸: ۱، ۱۱ — پ ۲۹: ۱۳

رَسُوْلًا ۹ دو بھیجے ہوئے، دو رسول،

رَسُوْلٌ کا تثنیہ اصل میں رَسُوْلَانِ تھا

اضافت کے سبب نون تثنیہ حذف ہو گیا

[1] فتح الباری ج ۱ ص ۲۴۵ [2] معالم التنزیل ج ۲ ص ۲۵۲

رَسُوْلُکُمْ تمہارا پیغمبر، تمہارا رسول،
رَسُوْلَ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ

پ ۱/۹ پ ۹/۱۳

رَسُوْلُنَا ہمارا پیغمبر، ہمارا رسول رَسُوْلُ
مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ پ ۶/۷

پ ۷/۲ پ ۲۸/۱۶

رَسُوْلُہٗ اس کا پیغمبر، اس کا رسول، رَسُوْل
مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ

پ ۳/۹ پ ۴/۱ و ۱۳ پ ۵/۱۱ و ۱۷ پ ۶/۹ و ۱۲ پ ۹/۱۰ و ۱۵ و ۱۶ و ۱۷

پ ۱۰/۲ و ۷ و ۸ و ۹ و ۱۰ و ۱۱ و ۱۳ و ۱۴ و ۱۵ و ۱۶ و ۱۷ و ۱۸

پ ۱۱/۱ و ۳ پ ۱۸/۱۲ و ۱۳ و ۱۷ پ ۲۱/۱۸ و ۱۹ و ۲۰ پ ۲۲/۱ و ۲ و ۴ و ۶

پ ۲۶/۹ و ۱۰ و ۱۱ و ۱۲ و ۱۳ و ۱۴ پ ۲۷/۱۷ و ۲۰

پ ۲۸/۱ و ۲ و ۳ و ۴ و ۹ و ۱۰ و ۱۳ و ۱۵ پ ۲۹/۱۲

رَسُوْلُھَا اس کا پیغمبر، اس کا رسول، رَسُوْل
مضاف ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف
الیہ. پ ۱۸/۳

رَسُوْلِہِمْ ان کا پیغمبر، ان کا رسول،
رَسُوْل مضاف ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب
مضاف الیہ، پ ۱۱/۱ پ ۱۸/۴ پ ۲۴/۶

رَسُوْلِیْ میرا پیغمبر، میرا رسول، رَسُوْل
مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ پ ۷/۴

فصل الشین المعجمة

رَشَادِ نیکی، راستی، بھلائی، رَشَدَ
یَرْشُدُ کا مصدر ہے، اس کے معنی راہ راست
اختیار کرنے کے ہیں، پ ۲۴/۹ و ۱۰

رُشْدًا ہدایت، صلاحیت، راہ یابی،
بھلائی، راستی، ہوشیاری، حسنِ تدبیر رَشَدَ
یَرْشُدُ کا مصدر ہے، ہدایت کی جگہ استعمال
ہوتا ہے، آیہ شریفہ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْھُمْ
رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَیْھِمْ اَمْوَالَھُمْ
(پھر اگر دیکھو ان میں ہوشیاری تو حوالے کر دو ان کے
مال) میں رُشْد سے مراد صلاحیت ہے
دین میں اور مال کے تصرف میں، صلاح دینی سے
مراد یہ ہے کہ ان فواحش و معاصی سے مجتنب
رہے جو عدالت کو ساقط کر دیتے ہیں، اور مال
میں صلاح کا یہ مطلب ہے کہ فضول خرچ
نہ ہو یعنی ایسی جگہ مال خرچ نہ کرے کہ جہاں
دنیا کی کوئی خوبی اور آخرت کا کوئی ثواب نہ ہو،
نیز مال کا صرف کرنا جانتا ہو کہ لین دین میں غبن
نہ اٹھائے۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر یتیموں سے

رشد نہ دیکھا جائے تو ان کو مال سپرد نہ کیا جائے امام شافعی، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے، لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک چونکہ اٹھارہ برس سن بلوغ کی آخری حد ہیں اس لیے سات برس زائد یعنی پچیس برس کے سن تک اور انتظار کیا جائے گا۔ کیونکہ سات برس کی مدت تغیرِ احوال کے لیے معتبر ہے طفل کو اس مدت میں تمیز ہو جاتی ہے اور اس پر نماز کا حکم کیا جاتا ہے۔ پس اس قدر انتظار کر کے اس کا مال اس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اگرچہ اس سے رشد نہ دیکھا جائے، اور مفہوم سے استدلال کرنا ہمارے نزدیک ناتمام ہے اور اگر تسلیم بھی کیا جائے تو آیت میں لفظ رشد نکرہ ہے، پس ادنیٰ رشد جس پر بولا جاتا ہے وہ مراد ہوگا اور اس سن پر اس قدر پایا جاتا ہے پ۳ پ۹ پ۲۹

رُشْدًا ۱ پ۴ پ۱۵

رَشَدًا راستی، بھلائی، نیکی، راہ یابی، رَشَدَ یَرْشُدُ کا مصدر ہے اس کے معنی راہ راست پانے کے ہیں۔ امام راغب لکھتے ہیں۔ اخص ہے کیونکہ رُشْد امور دنیویہ اور اخرویہ دونوں میں استعمال ہوتا ہے اور رَشَد صرف امور اخرویہ میں بولا جاتا ہے اور راشِدٌ اور رَشِیْدٌ دونوں کے لیے آتے ہیں ارشاد ہے أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ (وہ لوگ ہی ہیں نیک چال پر) اور مَا أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ (نہیں بات فرعون کی نیک چال رکھتی) پ۱۵ پ۲۹

رَشَدَهٗ اس کی راہ یابی۔ اس کی نیک راہ، اس کی ہدایت رُشْدَ مضاف ہ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ۱۷

رَشِیْدٌ نیک چال والا، بھلائی والا، شائستہ، رُشْدًا سے بر وزن فَعِیْلٌ بمعنی فاعل ہے پ۱۲

فصل الصاد المهملة

رَصَدًا چوکیدار، نگہبان، گھات، رَصَدَ یَرْصُدُ کا مصدر ہے جس کے معنی نگاہ رکھنے اور گھات لگانے کے ہیں، واضح رہے کہ مصدر مذکور اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں کے معنی میں مستعمل ہے نیز واحد تثنیہ

؎ بعض علماء کا بیان ہے کہ رَشَدًا، رُشْدًا سے

اور جمع سب کے لیے آتا ہے، قرآن مجید میں جہاں
لفظ رحمٰن کا استعمال ہوا ہے ان سب معانی
کا احتمال ہے۔ پ ۲۹/۱۱، ۱۲

فصل الضاد المعجمة

رَضَاعَة دودھ پلانا، شیر خوارگی، مصدر
ہے اور اس کا فعل باب ضَرَبَ سَمِعَ اور
فَتَحَ تینوں سے مستعمل ہے۔ لغت میں اس
کے معنی تھن یا پستان سے دودھ پینے کے ہیں
اور شرعاً بچہ کا حقیقتاً یا حکماً وقت مخصوص میں
عورت کے خالص یا ملے ہوئے دودھ کو جب کہ
دودھ غالب ہو پینے کا نام ہے[1]۔ حکماً پینے
کا مطلب حلق میں ڈالنا یا ناک کے ذریعہ پیٹ
میں اتارنا ہے پ ۲/۱۴، ۱۵

رَضُوْا وہ راضی ہوئے، وہ خوش ہوئے،
انہوں نے پسند کیا، رَضِیَ سے ماضی کا صیغہ
جمع مذکر غائب۔ راغب لکھتے ہیں۔
"بندے کا اللہ سے راضی ہونا یہ ہے کہ
جو کچھ اس پر قضاء الٰہی جاری ہو وہ اسے کروہ
نہ سمجھے، اور اللہ کا بندہ سے راضی ہونا یہ کہ اس
کو اپنے حکم کا فرماں بردار اور اپنی نہی سے

(ملاحظہ ہو رَضِیَ) پ ۶/۶ پ ۱۰/۱۳ و ۷ و ۱۰۰ پ ۱۱/۲ و ۴ پ ۲۸/۳ پ ۳۰/۲۲۔

رِضْوَانٌ رضامندی، خوشنودی، مرضی
رضا، رِضِیَ یَرْضٰی کا مصدر ہے، رضا کثیر
یعنی بڑی رضامندی اور نہایت خوشنودی کو
رضوان کہتے ہیں اور چونکہ سب سے بڑی
رضا اللہ کی رضا ہے اس لیے قرآن مجید
میں رضوان کا لفظ جہاں بھی استعمال ہوا ہے
رضاء الٰہی کے لیے مخصوص ہے، پ ۳/۱۰ پ ۴/۸، ۹
پ ۱۰/۹، ۱۵ پ ۱۱/۲ پ ۲۷/۱۹، ۲۰ رضواناً پ ۶/۵ پ ۲۶/۱۲
پ ۲۸/۴۔

رِضْوَانَهٗ اس کی رضا، اس کی خوشنودی
رضوان مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب
مضاف الیہ پ ۶/۷ پ ۲۶

رَضِیَ وہ راضی ہوا، وہ خوش ہوا، اس نے
پسند کیا۔ رَضًی سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر
غائب۔ (ملاحظہ ہو رَضِیَ) پ ۷ پ ۲ پ ۱۶/۱، ۵
پ ۲۶/۱۱ پ ۲۸/۳ پ ۳۰/۱۴

رَضِیًّا پسندیدہ، من مانتا، رَضًی سے
صفت مشبہ کا صیغہ، فَعِیْلٌ بمعنی مَفْعُوْلٌ
ہے پ ۱۶/۴

رَضِیْتُ میں راضی ہوا، میں خوش ہوا

[1] جامع الرموز ص ۲۱۰، طبع نول کشور

میں نے پسند کیا، رِضَیٰ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم۔ (ملاحظہ ہو رَضِی) پ ۶

رَضِیْتُمْ تم راضی ہوئے، تم خوش ہوئے تم نے پسند کیا، رِضَیٰ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر پ ۱۰، ۱۲

فصل الطاء المهملة

رَطْبٍ ہرا، تر، یَابِسٌ کی ضد ہے جس کے معنی سوکھے اور خشک کے ہیں، اور رُطُوبَۃٌ سے جس کے معنی تر ہونے کے ہیں صفت مشبہ کا صیغہ ہے، آیت شریفہ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ (اور نہ ہرا اور نہ سوکھا جو نہیں کھلی کتاب میں) کی تفسیر میں علامہ خازن بغدادی لکھتے ہیں۔

"ابن عباس (رضی اللہ عنہما) کا بیان ہے کہ رطب پانی اور یابس صحرا ہے، اور عطاء کہتے ہیں کہ اگنے والی اور نہ اگنے والی چیزیں مراد ہیں۔ اور بعض کا قول ہے کہ رطب سے زندہ اور یابس سے مردہ مراد ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ ہر شے سے عبارت ہے کیونکہ جمیع اشیاء یا رطب ہیں یا یابس" ۱؎

پ ۱۳

رُطَبًا تازہ خرما، تازی کھوریں، پکی کھوریں، رُطَبَۃٌ واحد، اور رِطَابٌ اور اَرْطَابٌ جمع الجمع۔ پ ۱۶

فصل العين المهملة

رِعَاءُ چرواہے، رَاعِیٌ کی جمع جس کے معنی چرواہے اور گلہ بان کے ہیں، رَاعِیٌ رَعْیٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر۔ (ملاحظہ ہو اِرْعُوْا) پ ۲۰

رِعَایَتِهَا اس کی نگاہ رکھنا، اس کو نباہنا، اس کی نگہداشت کرنا رِعَایَۃٌ رَعٰی یَرْعٰی کا مصدر ہے بمعنے حفاظت اور نگرانی کرنے کے مضاف ہے ھَا ضمیر واحد مونث غائب مضاف الیہ، پ ۲۷

رُعْبَ رعب، ہیبت، دھاک، دہشت خوف، ڈر، رَعَبَ یَرْعَبُ کا مصدر ہے راغب نے اس کے معنے خوف سے بھرپور

۱؎ تفسیر لباب التاویل فی معانی التنزیل ج ۲ ص ۱۱۶

ہونے کے سبب منقطع ہو جانے کے لکھے ہیں۔

پ ۷ ، پ ۹ ، پ ۱۶ ، پ ۲۱ ، پ ۲۵ ، رُعْبًا ۱۵

رَعْدٌ کڑک، گرج، گرجنے والا، یہ اصل میں مصدر ہے بمعنے کڑکنے اور گرجنے کے۔ اس کا فعل باب نَصَرَ و فَتَحَ سے آتا ہے اور ابر کی کڑک اور گرج کے لیے بطور اسم مستعمل ہے امام بغوی نے معالم التنزیل میں تصریح کی ہے کہ اکثر مفسرین کے نزدیک رعد اس فرشتہ کا نام ہے جو ابر کو ہانکتا اور چلاتا ہے۔[1]

جامع ترمذی میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس سلسلہ میں ایک روایت منقول ہے کہ یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ بتایئے رعد کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ایک فرشتہ ہے جو ابر پر متعین ہے۔ ۲ پ ۱۳

رَعَوْهَا انہوں نے اس کو نباہا، انہوں نے اس کی رعایت کی۔ انہوں نے اس کی نگہداشت کی رَعْیٌ اور رِعَایَةٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب،

پ ۲۷

فصل الغین المعجمہ

رَغَبًا رغبت، توقع، رَغِبَ یَرْغَبُ کا مصدر ہے، امام راغب لکھتے ہیں۔

"رَغْبَۃٌ، رَغَبٌ اور رُغْبَی کے معنے ارادہ یعنی خواہش میں وسعت کے ہیں اللہ فرماتا ہے وَیَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا: (اور پکارتے تھے ہم کو توقع اور ڈر سے) پس جب رَغِبَ فِیْہِ اور رَغِبَ اِلَیْہِ کہا گیا تو یہ اس شے پر حرص کو چاہتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا رَاغِبُوْنَ (ہم اپنے رب سے آرزو رکھتے ہیں) اور جب رَغِبَ عَنْہُ کہا گیا تو یہ اس سے بے رغبتی اور بیزاری کا مقتضی ہے، جیسے اللہ کا قول ہے وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّۃِ اِبْرٰھٖمَ (اور کون پسند نہ رکھے دین ابراہیم کا) اور اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِھَتِیْ (کیا تو پھرا ہوا ہے میرے معبودوں سے)" پ ۱۷

---

[1] معالم التنزیل ج ۴ ص [2] الاتقان ج ۲ ص ۱۴۱

رَغَدًا بافراغت، وسیع، خوب، اچھی طرح، یہ اصل میں سَمِعَ کا مصدر ہے بمعنے بہت نعمت ہونے کے اور صفت مشبہ ہو کر مستعمل ہے۔ نیز رَاغِدٌ کی جمع بھی ہے جیسے خَدَمٌ، خَادِمٌ کی، آیت شریفہ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا (اور کھاتے پھرو اس میں جہاں چاہو محظوظ ہو کر) میں رَغَدًا بمعنے صفت بھی ہو سکتا ہے اور جمع بھی بمعنے رَاغِدِيْنَ کے، پ ۱ ع ۴، پ ۱۴ ع ۲۱

فصل الفاء

رُفَاتًا بوسیدہ، گلا ہوا، چورا، جو چیز خشک گھاس کی طرح بوسیدہ ہو کر چورا چورا ہو جائے "رفات" کہلاتی ہے، رَفْتٌ سے مشتق ہے جس کے معنے چورا چورا کرنے اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے کے ہیں، پ ۱۵ ع ۵، ۱۱

رَفَثٌ عورتوں سے اختلاط کرنا، عورتوں سے بے پردہ ہونا، عورتوں کی طرف رغبت کرنا، رَفَثَ يَرْفُثُ کا مصدر ہے اس کے معنے فحش بات کہنے اور جماع کرنے کے ہیں، قاضی بیضاوی "رفث" کے معنے بیان کرتے ہیں۔

هو الإفصاح بما يجب ان يكنى عنه	جس چیز کو کنایہ سے کہنا واجب ہو اس کو کھول کر کہنا۔

ان کا بیان ہے کہ جماع سے کنایہ ہے کیونکہ جماع تقریباً رفث سے خالی نہیں ہوتا[۱]

زجاج نے جو ائمہ لغت میں سے ہیں اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

الرفث كلمة جامعة لكل ما يريد الرجال من النساء[۲]	رفث ایک ایسا کلمہ ہے جو ہر اس چیز پر شامل ہو جس کی مرد عورتوں سے خواہش کرتے ہیں۔

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔

---

[۱] تفسیر انوار التنزیل ج ۱ ص ۵ طبع مصر ۱۳۲۰ھ [۲] تفسیر معالم التنزیل ج ۱ ص ۱۳۶ طبع مصر ۱۳۳۱ھ، حافظ ابن حجر نے بھی ازہری سے یہی نقل کیا ہے الرفث اسم جامع لکل ما یرید الرجل من المراۃ (فتح الباری ج ۳ ص ۳۰۲)

"رفث وہ کلام ہے جو جماع اور دواعیِ جماع یعنی جماع پر برانگیختہ کرنے والی اشیاء کے ذکر پر مشتمل ہو کہ جن کا بیان کرنا قبیح سمجھا جاتا ہے۔ ارشادِ الٰہی اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ (حلال ہوا تم کو روزے کی رات میں بے پردہ ہونا اپنی عورتوں سے) میں رفث کو یہ بتلاتے ہوئے کہ اس طرف عورتوں کو بلانا اور اس معاملہ میں ان سے گفتگو کرنا جائز ہے۔ جماع سے کنایہ قرار دیا گیا ہے، اور بذریعہ الیٰ[1] تعدیہ اس لیے ہوا کہ یہ افضاء[5] کے معنے پر مشتمل ہے اور آیت فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ (تو بے پردہ ہونا نہیں عورت سے اور نہ گناہ کرنا) محتمل ہے کہ جماع کرنے سے ممانعت ہو نیز یہ کہ اس کی گفتگو سے نہی ہو کیونکہ وہ دواعیِ جماع میں داخل ہے اور احتمال اول صحیح ہے"

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ

"حق تعالیٰ حیا والے اور کریم ہیں کنایہ سے کام لیتے ہیں جہاں کہیں قرآن مجید نے مباشرۃ، ملامسۃ، افضاء، دخول اور رفث کا ذکر فرمایا ہے اس سے جماع مراد لیا ہے" [2]

محی السنۃ بغوی آیت شریفہ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ کی تفسیر میں رقم طراز ہیں۔

"رفث" کے بارے میں علماء مختلف ہیں، ابن مسعود، ابن عباس اور ابن عمر (رضی اللہ عنہم) نے اس کو جماع کہا ہے اور یہی قول حسن (بصری) مجاہد، عمرو بن دینار، قتادہ، عکرمہ، ربیع اور ابراہیم نخعی کا ہے، اور علی بن ابی طلحہ ابن عباس سے راوی ہیں کہ "رفث" کے معنے عورتوں سے صحبت کرنے، بوسہ لینے، اشارہ کرنے اور فحش بات کے ذریعہ عورت کو

---

[1] علامہ ابو جعفر بیہقی نے تاج المصادر میں تصریح کی ہے کہ یہ اس اصول کی بنا پر ہے کہ کسی شے کو اس کی نظیر کے قائم مقام کر دیا جائے پس جس طرح افضیت کا تعدیہ الیٰ کے ذریعہ کیا جاتا ہے اسی طرح اس کا بھی تعدیہ الیٰ کے ذریعہ ہوا [5] ملاحظہ ہو أَفْضَىٰ

[2] معالم التنزیل ج ۱ ص ۱۳۶

چھیڑنے کے ہیں حصین بن قیس کا بیان ہے
کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے اونٹ
کی دم پکڑی اسے ہانکنے لگے اور حدی گاتے
ہوئے کہنے لگے۔

وھن یمشین بنا ھمیسا
ان تصدق الطیر ننك لمیسا[1]

میں نے ان سے کہا کہ آپ حالت احرام میں
رفث میں مبتلا ہیں کہنے لگے رفث وہ
ہے جو عورتوں کے سامنے ہو۔ طاؤس کہتے
ہیں رفث عورتوں سے جماع کی چھیڑ چھاڑ
اور ان کے سامنے اس کا ذکر ہے۔ عطاء کا
قول ہے کہ مرد کا حالت احرام میں عورت سے
یہ کہنا کہ جب تو احرام اتارے گی تو میں تجھ سے
صحبت کروں گا "رفث" ہے اور بعض کا
قول ہے کہ رفث کے معنے فحش اور بیہودہ
بات کے ہیں۔[2]

حافظ ابن حجر عسقلانی حدیث من حج للہ فلم
یرفث ولم یفسق رجع کیوم ولدتہ
امہ (جس نے اللہ کے واسطے حج کیا پھر
نہ عورت سے صحبت کی نہ صحبت کی بات
کی اور نہ گناہ کیا تو اس طرح واپس ہوتا ہے
کہ جس دن ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا)
کی شرح میں لکھتے ہیں۔

"آیت میں جمہور کے نزدیک رفث
سے جماع مراد ہے اور جو ظاہر ہوتا ہے
وہ یہ ہے کہ حدیث میں رفث سے اس
سے زیادہ عام مراد ہے، اور اسی کی طرف
قرطبی مائل ہیں، اور یہی اس حدیث سے
مراد ہے جو صیام کے بارے میں وارد ہے
کہ فاذا کان صوم احدکم فلا یرفث
(جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو بیہودہ کلام
نہ کرے")[3] پ ۲ ع ۹

رِفْدٌ بخشش، عطا، انعام، مدد، آزفادہ
اور رُفُوْدٌ جمع۔ پ ۱۲ ع ۹

رَفْرَفٌ قالین، چاندنیاں، تکیے، علامہ
زمخشری، الفائق میں لکھتے ہیں۔

---

[1] ہمیس اونٹ کے قدم اٹھانے کی آواز کا نام ہے اور لمیس محبوبہ کا۔

[2] معالم التنزیل۔ ج۔ ۱ ص ۱۵۲

[3] فتح الباری۔ ج ۴ ص ۳۰۲ و ۳۰۳ طبع میریہ ۱۳۰۰ھ

(الرفرف) ما کان "رفرف" دیبا وغیرہ
من الدیباج وغیرہ کا باریک خوش
رقیقا حسن الصنعۃ[۱] رنگ کپڑا ہے
علامہ موصوف نے اس کی جامع تعریف کی
ہے، اور چونکہ اس کپڑے کے گدے، تکیے چاندنیاں
خیمے اور فرش فروش تیار ہوتے ہیں اس لیے ان
سب معانی میں اس کا استعمال ہوتا ہے چنانچہ
امام بغوی رقم طراز ہیں۔
"سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ رفرف جنت
کے ہرے بھرے باغیچے ہیں، ابن عباس سے
بھی یہی مروی ہے اس کا واحد رفرفۃ ہے
اور جمع الجمع رفارف، اور بعض گدے اور
فرش کو رفرف بتاتے ہیں، حسن (البصری)
مقاتل، اور قرظی کا یہی قول ہے۔ عوفی ابن
عباس سے راوی ہیں کہ رفرف فرشوں
اور گدوں کا زائد حصہ ہے (عالیہ جھالر یا کپڑے
کا کنارہ مراد ہے جو تخت کے چاروں طرف
لٹکا رہتا ہے) ضحاک اور قتادہ کا بیان ہے
کہ یہ فرش کے اوپر کی سبز چاندنیاں ہیں، ابن
کیسان کہتے ہیں کہ یہ گل تکیے (جن پر رخسار
رکھتے ہیں) ہیں۔ (ابن عیینہ نہالچے بتاتے
ہیں، اور ان کے علاوہ دیگر علماء کی تصریح
ہے کہ عرب کے نزدیک ہر چوڑے عرض
کا کپڑا رفرف ہے"[۲]

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔
"رفرف بکھرے ہوئے پتے
ہیں، اللہ تعالیٰ نے جو عَلٰی رَفْرَفٍ
خُضْرٍ (سبز چاندنیوں پر) فرمایا سو یہ
ایک خاص قسم کے کپڑے ہیں جن کو
(سبزی میں) باغات سے تشبیہ دی گئی
ہے اور بعض کا قول ہے کہ رفرف
میخوں اور طنابوں کے علاوہ خیمہ اور
شامیانہ کے وہ کنارے ہیں جو زمین پر
لٹکے رہتے ہیں۔ اور حسن (بصری) سے
یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ گل تکیے ہیں۔" ۲۷/۱۲

رَفَعَ اس نے بلند کیا۔ اس نے اونچا کیا،
اس نے چڑھایا، (فتح) رَفَعَ سے ماضی
کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو رَفَعَ)
پ ۳/۱ پ ۸/۲ پ ۱۳/۵ پ ۳۰/۴

رُفِعَتْ وہ بلند کی گئی، رَفَعَ سے ماضی

۱۔ الفائق فی غریب الحدیث ج ۱ ص ۴۹۴ طبع دائرۃ المعارف، ۲۔ معالم التنزیل ج ۷۔ ص ۱۲

مجہول کا صیغہ واحد مونث غائب، عربی
میں لفظ سماء (آسمان) مونث مستعمل ہوتا ہے
پ ۳۰/۱۳

رَفَعْنَا ہم نے بلند کیا، ہم نے اونچا کیا، ہم نے
اٹھایا، رَفَعَ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم ہے پ ۱/۱۸
پ ۶/۲ پ ۲۵/۹ پ ۳/۱۹

رَفَعْنٰهُ ہم نے اس کو بلند کیا، اس میں
ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، پ ۹/۱۲

رَفَعَهُ اس کو اٹھالیا۔ اس میں ہٗ ضمیر واحد
مذکر غائب ہے، یہاں رفع سے رفع حقیقی
جسمانی مراد ہے کیونکہ آیت میں اس کا تعدیہ
بذریعہ الیٰ ہے، نیز سیاق اسی معنے کو بتلا
رہا ہے اس معنی کا انکار بجز مکابرہ اور جہالت
کے اور کوئی معنے نہیں رکھتا (ملاحظہ ہو رَفَعَ
رَافِعُكَ) پ ۶/۲

رَفَعَهَا اس کو بلند کیا، اس کو اونچا کیا، اس میں
ھَا ضمیر واحد مونث غائب ہے، پ ۲۴/۱۱

رَفِيعُ بلند کرنے والا، بلند ہونے والا، رَفْعٌ
سے بر وزن فَعِيْلٌ بمعنے فاعل یعنی رَافِعٌ بھی
ہوسکتا ہے بمعنی بلند ہونے والے اور بلند
کرنے والے کے اور بمعنی مَفْعُوْلٌ
یعنی مَرْفُوْعٌ بھی بمعنی بلند کئے ہوئے
کے، رَفِيعُ الدَّرَجٰتِ اسماء
حسنےٰ میں سے ہے اس کے دونوں
معنے ہوسکتے ہیں، بلند مرتبوں والے
کے بھی اور درجوں کے بلند کرنے والے
کے بھی، پ ۲۴

رَفِيقًا رفیق، رَفَاقَةٌ سے جس کے
معنے رفیق ہونے اور بلطف پیش آنے
کے ہیں بر وزن فَعِيْلٌ صفت مشبہ کا
صیغہ ہے، رُفَقَاءُ جمع، خازن بغدادی
لکھتے ہیں۔

" رفیق کے معنے صاحب (ساتھی)
کے ہیں، صاحب کا نام رفیق اس لیے
پڑا کہ ہم اس سے اور اس کی صحبت سے
نفع اندوز ہوتے ہیں، اور رفیقًا حالانکہ
جمع کی صفت واقع ہے مگر اس کو
واحد لایا گیا کیونکہ عرب اسے واحد
اور جمع دونوں میں استعمال کرتے ہیں" [5]
پ ۵/۶

---

[5] لباب التاویل۔ ج ۱ ص ۴۰۵

فصل القاف

رَقٌّ کاغذ، ورق، جھلی، راغب کہتے ہیں، کاغذ کی طرح جس میں لکھا جائے اس کا نام "رق" ہے، قاضی بیضاوی نے لکھا ہے کہ رق وہ جھلی ہے جس میں لکھا جاتا ہے[1]۔ رقوق جمع ۲۷ ب ب ۲۶ ب

رِقَابٌ گردنیں، رَقَبَۃٌ کی جمع ۲ پ ۶ ب ۲۶ ب ۵

رَقَبَۃٌ گردن، جان، غلام، "رقبہ" اصل میں گردن کا نام ہے پھر جملہ بدن انسانی کے لیے اس کا استعمال ہونے لگا اور عرف میں یہ غلاموں کا نام پڑگیا جس طرح کہ الفاظ راس اور ظہر کا استعمال سواریوں کے لیے کیا جانے لگا۔ ب ۵ ب ۱۰ ۷ پ ۴ ۲۸ پ ۱ ۳۰ پ ۱۵

رُقُوْدٌ خفتہ، سونے والے، رَاقِدٌ کی جمع ہے جیسے سَاجِدٌ کی سُجُوْدٌ، رَاقِد، رُقُوْدٌ سے جس کے معنے سونے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ہے ۱۵ پ ۱۵

رَقِیْبٌ نگہبان، خبر رکھنے والا، محافظ، مطلع، منتظر، راہ دیکھنے والا، رُقُوْبٌ سے جس کے معنے نگاہ رکھنے اور نگرانی کرنے کے ہیں۔ بر وزن فَعِیْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ، راغب لکھتے ہیں۔

"رقیب حافظ یعنی نگران کو کہتے ہیں یا تو اس لیے کہ وہ شخص محفوظ کی گردن کی حفاظت کرتا ہے اور یا اس لیے کہ وہ اپنی گردن اٹھائے رہتا ہے"

نیز رقیب حق تعالیٰ کے اسمار حسنیٰ میں سے ہے، جب یہ ذات باری کی صفت واقع ہو تو اس کے معنی ہیں۔

"رقیب" وہ ذات ہے	ھو الذی لا یغفل
جو اپنی مخلوق سے	عما خلق فیلحقہ
غافل نہیں ہوتی اسے	نقص او یدخل
نقصان پہنچے یا اس کی	علیہ خلل من
غفلت کی بنا پر اس میں	قبل غفلتہ عنہ
خلل	
واقع ہو جائے۔	

یہ امام حلیمی کا بیان ہے، زجاج کہتے ہیں۔

[1] تفسیر انوار التنزیل ج ۲ ص ۲۸۵، امام بغوی نے بھی یہی لکھا ہے ملاحظ ہو معالم التنزیل ج ۶ ص ۲۰۶

"رقیب" وہ نگراں ہے جس سے کوئی چیز غائب نہ ہو ارشاد الٰہی ہے مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۔ (نہیں بولتا کوئی بات مگر نزدیک اس کے نگہبان ہیں تیار) اسی سے ماخوذ ہے"

امام بیہقی نے ان دونوں اقوال کو کتاب الاسماء والصفات میں نقل کیا ہے [1] پ ۷/۹ پ ۱۲/۸ پ ۲۶/۱۶

رَقِيْبًا پ ۴/۱۲ پ ۱۱/۳

رُقِيِّكَ تیرا چڑھنا، رَقِيَ يَرْقٰى کا مصدر ہے، اس کے معنے اوپر چڑھنے کے ہیں مضاف ہے، كَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ پ ۱۵

رَقِيْمٌ نوشتہ، کتبہ، لکھا ہوا، ایک شہر کا نام جو ملک شام کے اطراف میں بجانب شمال واقع تھا، امام راغب مفردات میں لکھتے ہیں۔

"کہا گیا ہے کہ "رقیم" مقام کا نام ہے، اور بعض کا قول ہے کہ یہ (یعنی اصحاب الکہف والرقیم) اس پتھر کی طرف منسوب ہیں جس پر ان کے نام تحریر تھے"۔

امام محی السنۃ ابو محمد حسین فرا بغوی، معالم التنزیل میں فرماتے ہیں۔

"رقیم کے بارے میں مفسرین مختلف ہیں، سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ یہ تختی ہے جس میں "اصحاب الکہف" کے نام اور ان کے حالات لکھے گئے (بغوی کہتے ہیں) یہ سب اقوال میں ظاہر تر ہے، پھر اس تختی کو لوگوں نے کہف کے دروازہ پر نصب کر دیا، یہ تختی سیسہ کی تھی اور بعض کا قول ہے کہ پتھر کی تھی، اس صورت میں رقیم بمعنے مرقوم یعنی مکتوب (نوشتہ) ہے اور رقم کے معنے کتابت کے ہیں، اور ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے مروی ہے کہ انہوں نے اسے اس وادی کا نام بتایا ہے جس میں اصحاب الکہف ہیں، اس صورت میں یہ رقمۃ الوادی سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنے وادی کے کنارہ اور جانب کے ہیں۔ اور کعب احبار کا بیان ہے کہ یہ اس بستی کا نام ہے جہاں سے "اصحاب کہف نکلے تھے اور بعض کا قول ہے کہ اس پہاڑ کا نام ہے جس میں کہف تھا" [2]

[1] ملاحظہ ہو کتاب الاسماء والصفات ص ۹۵ طبع انوار احمدی الٰہ آباد

[2] معالم التنزیل ج ۴۔ ص ۱۵۶ برحاشیہ خازن۔

واضح رہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس سلسلہ میں تین اقوال مروی ہیں، ایک تو یہی جس کو امام بغوی نے ذکر کیا اور ابن ابی حاتم بطریق عوفی ان سے راوی ہیں کہ "رقیم" فلسطین سے ورے عقبان وایلہ کے درمیان ایک وادی ہے[1]۔ دوسرا وہ جس کو عبد بن حمید نے بطریق سعید بن جبیر ان سے روایت کیا ہے کہ رقیم سیسہ کی تختی تھی جس میں ان کے حکمران نے ان لوگوں کے نام لکھ کر اس کو اپنے خزانہ میں داخل کر لیا تھا، امام بخاری نے بھی اس روایت کو اپنی صحیح میں تعلیقاً ذکر کیا ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس روایت کی اسناد کو بخاری کی شرط پر صحیح بتایا ہے[2]، تیسرا وہ جس کو ابن مردویہ نے بطریق عکرمہ ان سے نقل کیا ہے کہ میں رقیم سے واقف نہ تھا پھر میں نے اس کے متعلق دریافت کیا تو مجھ بتایا گیا کہ یہ وہ بستی تھی جس سے وہ لوگ نکلے ہیں۔ حافظ ابن حجر اس روایت کی اسناد کو ضعیف بتاتے ہیں[3]۔ طبری نے قتادہ اور عطیہ عوفی سے روایت کیا ہے کہ رقیم اس وادی کا نام ہے جس میں کہف واقع تھا، ابو عبیدہ کا بھی یہی قول ہے، ابن ابی حاتم حضرت انس رضی اللہ عنہ اور سعید بن جبیر سے راوی ہیں کہ "رقیم" کتے کا نام ہے[3]، اور علامہ سیوطی نے الاتقان میں ابن ابی حاتم ہی کے حوالہ سے ان ہی سعید بن جبیر سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ ایک وادی ہے[4]، واللہ اعلم۔

واضح رہے کہ اس بارے میں صحیح تر قول حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول اول ہے، انہوں نے جو اس کا جائے وقوع فلسطین سے ورے عقبہ وایلہ کے درمیان بیان فرمایا ہے، موجودہ اکتشافاتِ اثریہ نے اس کی حرف بحرف تصدیق کی ہے، ہم سابق میں "اصحاب الکہف والرقیم" کی بحث میں لکھ چکے ہیں کہ رقیم اس شہر کا نام ہے جہاں یہ واقعہ پیش آیا۔ مفسرین سلف کی اکثریت اسی طرف گئی ہے، اور چونکہ کہف یعنی غار اسی "رقیم" میں واقع تھا اس لیے قرآن مجید نے

---

[1] الاتقان ج ۲ ص ۱۴۲ طبع مصر [2] ملاحظہ ہو فتح الباری ج ۸ ص ۳۰۸ [3] ایضاً ج ۶ ص ۳۶۵ [4] الاتقان ج ۲ ص ۱۴۲ طبع مصر

ان لوگوں کا ذکر اصحٰب الکہف و الرقیم کے الفاظ میں کیا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، کعب احبار، قتادہ، عطیہ عوفی اور ابو عبیدہ کی تصریحات ابھی آپ کی نظر سے گذریں کہ وہ سب اس کو ایک مقام کا نام بتاتے ہیں، فرق اتنا ہے کہ کوئی اسے بستی اور شہر کا نام قرار دیتا ہے اور کوئی وادی کا، لیکن درحقیقت یہ کوئی فرق نہیں کیونکہ شہر اور اس کی وادی یعنی حوالی شہر سب ایک ہی نام سے موسوم ہوتے ہیں، مگر چونکہ اس شہر کا نام بدل کر بعد میں دوسرا رکھ دیا گیا اور اس کا اصلی نام مشہور نہ رہا اس لیے بعض اہل تفسیر کا ذہن اس جانب منتقل نہ ہو سکا کہ یہ کسی شہر کا نام ہے اور انہوں نے رقیم سے اس کے لغوی معنے نوشتہ اور کتبہ کے مراد لیے، یا پھر محض قیاس سے کام لے کر اسے "اصحاب الکہف" کا کتا سمجھ لیا، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی فرماتے ہیں۔

"الرقیم، اس کو عبرانی میں "سلاع" اور یونانی میں "پٹرا" کہتے ہیں، یہ شمالی عرب میں پہلے مدیانی حکومت کے ماتحت ایک دارالامارت تھا، پھر نبطی عربوں کا دارالحکومت ہوا، رومیوں کے عہد میں بھی اس کو خاص اہمیت ملی، [1]

اور مولانا ابو الکلام آزاد، ترجمان القرآن میں رقم طراز ہیں۔

"قرآن نے "کہف" کے ساتھ الرقیم کا لفظ بھی بولا ہے اور بعض ائمہ تابعین نے اس کا یہی مطلب سمجھا تھا کہ یہ ایک شہر کا نام ہے، لیکن چونکہ اس نام کا کوئی شہر عام طور پر مشہور نہ تھا، اس لیے اکثر مفسرین اس طرف چلے گئے کہ یہاں "رقیم" کے معنے کتابت کے ہیں یعنی ان کے غار پر کوئی کتبہ لگا یا تھا اس لیے کتبہ والے مشہور ہو گئے۔

لیکن اگر انہوں نے تورات کی طرف رجوع کیا ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ "رقیم" وہی لفظ ہے جسے تورات میں "راقیم" کہا گیا ہے، اور یہ فی الحقیقت

[1] ارض القرآن ج ۱، ص ۴۴، طبع معارف اعظم گڑھ ۱۳۴۲ھ

ایک شہر کا نام تھا جو آگے چل کر "پیٹرا" کے نام سے مشہور ہوا، اور عرب اسے "بطرا" کہنے لگے۔

عالم گیر جنگ کے بعد آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کے جو نئے نئے گوشے کھلے ہیں ان میں ایک "پیٹرا" بھی ہے اور اس کے انکشافات نے بحث و نظر کا ایک نیا میدان مہیا کر دیا ہے جزیرہ نمائے سینا اور خلیج عقبہ سے سیدھے شمال کی طرف بڑھیں تو دو پہاڑی سلسلے متوازی شروع ہو جاتے ہیں اور سطح زمین بلندی کی طرف اٹھنے لگتی ہے، یہ علاقہ نبطی قبائل کا علاقہ تھا۔ اور اسی کی ایک پہاڑی سطح پر "راقیم" نامی شہر آباد تھا، دوسری صدی عیسوی میں جب رومیوں نے شام اور فلسطین کا الحاق کر لیا تو یہاں کے دوسرے شہروں کی طرح "راقیم" نے بھی ایک رومی نوآبادی کی حیثیت اختیار کر لی، اور یہی زمانہ ہے جب "پیٹرا" کے نام سے اس کے عظیم الشان مندروں اور تھیٹروں کی شہرت دور دور تک پہنچی، سنہ ۶۴۰ء میں جب مسلمانوں نے یہ علاقہ فتح کیا تو "راقیم" کا نام بہت کم زبانوں پر رہا تھا، یہ رومیوں کا "پیٹرا" اور عربوں کا "بطرا" تھا۔

جنگ کے بعد سے اس علاقہ کی از سر نو اثری پیمائش کی جا رہی ہے، اور نئی نئی باتیں روشنی میں آ رہی ہیں، از اں جملہ اس علاقہ کے عجیب و غریب غار ہیں جو دور دور تک چلے گئے ہیں اور نہایت وسیع ہیں، نیز اپنی نوعیت میں ایسے واقع ہوئے ہیں کہ دن کی روشنی کسی طرح بھی ان کے اندر نہیں پہنچ سکتی، ایک غار ایسا بھی ملا ہے جس کے دہانہ کے پاس قدیم عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں اور بے شمار ستونوں کی کرسیاں شناخت کی گئی ہیں، خیال کیا گیا ہے کہ یہ کوئی معبد ہوگا جو یہاں تعمیر کیا گیا تھا۔

اس انکشاف کے بعد قدرتی طور پر یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ "اصحاب کہف" کا واقعہ اسی شہر میں پیش آیا تھا، اور قرآن نے صاف صاف اس کا نام "الرقیم" بتلا دیا ہے، اور جب اس نام کا ایک شہر موجود تھا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ "رقیم"

کے معنی میں تکلفات کیے جائیں، اور بغیر کسی بنیاد کے اسے کتبہ پر محمول کیا جائے۔

علاوہ بریں دوسرے قرائن بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔

قرآن نے جس طرح اس واقعہ کا ذکر کیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی عرب میں شہرت تھی، لوگ اس بارے میں بحثیں کیا کرتے تھے اور اسے ایک نہایت ہی عجیب وغریب بات تصور کرتے تھے۔

اب یہ ظاہر ہے کہ مشرکین عرب کے وسائلِ معلومات محدود تھے، بہت کم امکان ہے کہ دور کی بحثیں ان کے علم میں آئی ہوں، پس ضروری ہے کہ یہ قرب وجوار ہی کی کوئی بات ہو، اور ان لوگوں کی زبانی سنی جا سکے جن سے عربوں کا ملنا جلنا رہتا ہو، ایسے لوگ کون ہو سکتے تھے؟ اگر اسے "پیٹرا" کا واقعہ قرار دیا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے اول تو خود یہ مقام عرب سے قریب تھا یعنی عرب کی سرحد سے ساٹھ ستر میل کے فاصلہ پر، ثانیاً نبطیوں کی وہاں آبادی تھی، اور نبطیوں کے تجارتی قافلے برابر حجاز آتے رہتے تھے، یقیناً نبطیوں میں اس واقعہ کی شہرت ہوگی، اور ان ہی سے عربوں نے سنا ہوگا۔

خود قریشِ مکہ کے تجارتی قافلے بھی ہر سال شام جایا کرتے تھے، اور سفر کا ذریعہ وہی شاہ راہ تھی جو رومیوں نے ساحلِ خلیج سے لے کر ساحل مارمورا تک تعمیر کر دی تھی، [1] "پیٹرا" اسی شاہ راہ پر واقع تھا، بلکہ اس نواح کی سب سے پہلی تجارتی منڈی تھی، اس لیے اس سے زیادہ قدرتی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ واقعہ ان کے علم میں آگیا ہو [2]

(مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو

أَصْحَابَ الْكَهْفِ

وَالرَّقِيمِ) پ ۱۵/۱۴

[1] جنگ کے بعد اس شاہ راہ کا سراغ لگایا گیا تو پوری طرح نمایاں ہو گئی، اب یہ اپنے اصلی خط پر دوبارہ تعمیر کی جا رہی ہے، اور عقبہ سے عمان تک تعمیر ہو چکی ہے۔ آج کل جہاں عقبہ ہے وہاں پہلے ترسیس آباد تھا، جہاں سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے جہاز ہندوستان جایا کرتے تھے اور بحر احمر کے تجارتی بیڑے کا مرکز تھا، (حاشیہ ترجمان القرآن) [2] ترجمان القرآن ج ۲۔ ص ۳۹۳ و ۳۹۴ طبع مدینہ پریس بجنور

فصل الکاف

رِکَاب اونٹ، سواری، رُکُوب سے
اسم ہے، قاضی بیضاوی نے تصریح کی ہے
کہ رِکاب اونٹ کی سواری ہے جس طرح
راکب کا استعمال شتر سوار کے لیے غالب
ہے، اسی طرح اس کا استعمال اونٹ کے
معنی میں غالب ہے، لہ اس کا واحد
رَاحِلَۃٌ ہے (علی غیر لفظہ) اور رُکُبٌ،
رِکَابَاتٌ اور رَکَائِبُ جمع ہے، (ملاحظہ
ہو رَکِبَ) ۲۸/۴

رُکَامًا توبرتو، تہ بتہ، رَکْمٌ سے جس کے
معنے تہ برتہ اکٹھا کرنے کے ہیں اسم ہے، ۱۸/۱۲

رَکْبٌ کارواں، قافلہ، سوار رَاکِبٌ کی جمع
جس کے معنے سوار کے ہیں، رَاکِبٌ رُکُوبٌ
سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ہے، عرف
میں اس کا استعمال شتر سوار کے لیے مخصوص
ہے، عرب کا قافلہ چونکہ بیشتر شتر سواروں
پر مشتمل ہوتا ہے، اس لیے کارواں کے معنی
میں بھی مستعمل ہے، ۱۰/۱

رَکِبَا وہ دونوں سوار ہوئے رُکُوبٌ
سے ماضی کا صیغہ تثنیہ مذکر غائب،
(ملاحظہ ہو رَکِبَ) ۱۵/۲۲

رُکْبَانًا سوار، رَاکِبٌ کی جمع ہے۔
یہاں عام سوار مراد ہیں شتر سوار مخصوص
نہیں، ۲/۱۵

رَکَّبَکَ اس نے تجھے
جوڑ دیا، اس نے تیری ترکیب دی،
رَکَّبَ تَرْکِیْبٌ سے جس کے معنے
ترکیب دینے، ملانے اور جوڑ دینے کے
ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب،
کَ ضمیر واحد مذکر حاضر، ۳۰/۶

رَکِبُوْا وہ سوار ہوئے رُکُوْبٌ سے
ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، (ملاحظہ
ہو رَکِبَ) ۲۱/۳

رِکْزًا بھنک، کھٹکا، پوشیدہ آواز،
اسم ہے، ۱۶/۹

رُکَّعِ رکوع کرنے والے، رَاکِعٌ کی
جمع (ملاحظہ ہو رَاکِعًا) ۱/۱۵ ۱۷/۱۱

رُکَّعًا ۲۶/۱۲

لہ انوار التنزیل ج ۲ ص ۳۱۲ طبع مصر

رُکْنٍ آسرا، زور، قوت، کسی شے کی وہ جانب
جس کا آسرا لیا جائے "رکن" کہلاتی ہے، استعارتاً
زور و قوت کے لیے اس کا استعمال ہوتا ہے
یہاں رکن سے مراد محکم قلعہ یا زوردار قبیلہ
ہے، پ ۱۲/۷

رُکْنِهٖ اس کی قوت، اس کا زور، رُکْنِ
مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف
الیہ، پ ۲۷

رُکُوْبُهُمْ ان کا سوار ہونا، رُکُوْبٌ
مضاف، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف
الیہ، (ملاحظہ ہو رَکِبَ) پ ۲۳/۴

فصل المیم

رِمَاحُكُمْ تمہارے نیزے، رِمَاحُ مضاف
كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، رِمَاحُ
رُمْحٌ کی جمع ہے جس کے معنے نیزے کے
ہیں، پ ۷

رَمَادٍ راکھ، خاکستر، اسم ہے اَرْمِدَۃٌ
جمع، پ ۱۳

رُمَّانٌ انار، رُمَّانَۃٌ مؤنث پ ۸ پ ۲۷

رَمْزًا اشارہ، ایما، رُمُوْزٌ جمع،
راغب لکھتے ہیں:

"رمز کے معنے ہیں لبوں سے
اشارہ کرنے، مخفی آواز، اور ابرو کے ذریعہ
ایماء کے، نیز ہر وہ بات جو اشارہ کی طرح ہو
اسے "رمز" سے تعبیر کیا گیا ہے جس طرح
کہ شکایت کی تعبیر غمز سے کی گئی ہے"
پ ۳/۱۲

رَمَضَانَ، رمضان، مشہور مبارک مہینہ
کا نام، جو قمری سال کا نواں مہینہ ہے، جس میں
روزے رکھے جاتے ہیں، ابوالخیر طالقانی
نے اپنی کتاب حظائر القدس میں اس ماہ
کے ساٹھ نام ذکر کیے ہیں[1]، مجاہد کا قول
ہے کہ "رمضان" اسماء الٰہی میں سے ہے
جس طرح شہر اللہ کہتے ہیں اسی طرح
شہر رمضان کہا جاتا ہے لیکن صحیح یہ ہے
کہ "رمضان" مہینہ کا نام ہے[2]، قاضی
بیضاوی لکھتے ہیں:

"رمضان، رَمِضَ کا مصدر ہے
جو جلنے اور سوختہ ہونے کے لیے

---

[1] فتح الباری ج ۴ ص ۸۷ [2] معالم التنزیل ج ۱ ص ۱۳۰ برحاشیہ خازن۔

آتا ہے پھر اس کی طرف شہر کی اضافت کی
گئی اور اسے علم قرار دیا گیا، اور بر بنائے
علیت و الف نون غیر منصرف ہوا جس طرح
کہ ابن دایۃ میں جو کوے کا نام ہے لفظ
دایۃ بر بنائے علیت و تانیث غیر منصرف
ہے ....
اور اس ماہ کو "رمضان" سے یا تو اس لیے موسوم
کیا گیا کہ اس ماہ میں بھوک پیاس کی سوزش سے سوختہ
ہوتے تھے، یا اس لیے کہ گناہ اس میں جل
جاتے ہیں، اور یا اس لیے کہ جب ان لوگوں
نے قدیم زبان سے مہینوں کے نام منتقل
کیے تو یہ مہینہ گرمی کی سخت تمازت کے زمانہ
میں واقع ہوا" [1] ب ۲ / ۲

رَمٰی اس نے پھینکا، رَمْیٌ سے ماضی کا صیغہ
واحد مذکر غائب۔ (ملاحظہ ہو رَمَیْتَ) ب ۹ / ۱۴

رَمَیْتَ تو نے پھینکا، رَمْیٌ سے ماضی
کا صیغہ واحد مذکر حاضر، ب ۹ / ۱۴

رَمِیْمٌ استخوان بوسیدہ، گلی ہوئی ہڈی،
رِمَّۃٌ سے جس کے معنی ہڈیوں کے بوسیدہ
ہو جانے کے ہیں، صفت مشبہ کا صیغہ، اَرِمَّاءُ

اور رمام جمع، ب ۲۳ / ۴ ، ب ۲۷ / ۱

فصل الواو

رَوَاحُهَا اس کی شام کی سیر، اس
کی شام کی منزل، رَوَاحٌ رَاحَ یَرُوْحُ
کا مصدر ہے جس کے معنے شام کرنے
اور شام کے وقت چلنے کے ہیں، راغب
نے لکھا ہے کہ "رَوَاحٌ کے معنی سہولت
اور آسانی کے ہیں اور بطور استعارہ اس
کا استعمال نصف النہار کے بعد سے
اس وقت کے لیے ہوتا ہے جس میں انسان
چلتا ہے" بہر حال یہ غُدُوٌّ اور صَبَاحٌ
کا مقابل ہے اور اس کا استعمال سر شام
یا زوال سے لے کر رات تک کے لیے
ہوتا ہے، یہاں رَوَاحٌ سے شام کی منزل
یعنی زوال سے لے کر غروب آفتاب
تک چلنا مراد ہے، ب ۲۲ / ۸

رَوَاسِیَ بوجھ، پہاڑ، رَاسِیَۃٌ
کی جمع، "رواسی" کا استعمال ٹھیرے ہوئے
پہاڑوں کے لیے ہوتا ہے (ملاحظہ ہو

[1] انوار التنزیل ج ۱ ص ۴۷

رَسِیۡتٍ) ۳۴ ب ۱۲ ۲ ۱ ۱۲ ۱۵

۲۹ ب ۱۲

رَوَاکِدَ ایستادہ، ٹھیری ہوئیں، تھمی ہوئیں

رَاکِدٌ کی جمع جو رُکُوۡدٌ سے جس کے معنی اپنی جگہ پر برقرار رہنے اور اپنے مقام پر ٹھیر جانے کے ہیں۔ اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ہے" رکودٗ" کا استعمال عام طور پر کشتی، ہوا، پانی، ترازو اور آفتاب کے لیے ہوتا ہے۔ ۲۵ ب ۵

رَوۡحٌ فیض، رحمت، راحت، مصدر ہے۔ اس کا فعل نَصَرَ اور سَمِعَ سے آتا ہے راغب نے اس کے معنے تنفس یعنی سانس لینے کے بیان کیے ہیں اور لکھا ہے کہ "رَوۡحٌ" سے وسعت کا تصور پیدا کیا گیا چنانچہ کہا گیا قصعۃ رَوحاء یعنی وسیع پیالہ اور ارشاد الٰہی ہے لَا تَيۡاَسُوۡا مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰہِ (مت ناامید ہو اللہ کے فیض سے) یعنی اللہ کی کشائش اور رحمت سے کیونکہ یہ بھی رَوۡحٌ کا ایک جزو ہے وجہ بات یہ ہے کہ چونکہ تنفس باعث فرحت و راحت اور سبب رحمت ہے اور اسی کے ذریعہ خوشبو کا احساس ہوتا ہے، اس لیے فرحت تازگی، آسائش، خوشبو، نسیم کی خنکی، اور خوش آیند ہوا کے لیے اس کا استعمال عام ہے چنانچہ امام بغوی نے مجاہد سے راحت کے اور سعید بن جبیر سے فرحت کے اور ضحاک سے مغفرت و رحمت کے معنے نقل کیے ہیں۔[۱] اور بیہقی شعب الایمان میں مجاہد سے رَوۡحٌ کے معنے جنت اور ہوائے خوش آیند کے روایت کرتے ہیں ۵ ب ۱۳ ب ۱۴ ۲۶ ب ۱۲

رُوۡحٌ روح، جان، بھید کی بات، فیض غیبی، وحی، قرآن، فرشتہ، امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔

"رَوۡحٌ اور رُوۡحٌ اصل میں ایک ہیں، اور "روح" کو نفس یعنی سانس کا نام قرار دیا گیا ہے۔ شاعر آگ کے بارے میں کہتا ہے

نقلت لہ ارفعہا الیک واحیہا
بروحک اجعلہا لہا قیتۃ قدرا

(میں نے اس سے کہا کہ اس آگ کو اپنی طرف اٹھا کر اپنے سانس سے اس کو زندہ کر دے اور اس کی مقررہ غذا اسے بہم پہنچا دے)

---

[۱] ملاحظہ ہو معالم التنزیل ج ۷، ص ۲۳

[۲] فتح الباری ج ۶ ص ۲۲۸

یہ اس بنا پر ہے کہ سانس بھی روح ہی کا ایک جزء
ہے۔ یہ تسمیہ ایسا ہی ہے جس طرح پر کہ نوع کو
اسم جنس سے موسوم کر دینا جیسے انسان کو حیوان
کہہ دینا۔ نیز روح کو اس جزء کا بھی نام قرار دیا گیا
جس کے ذریعہ زندگی، حرکت، منفعتوں کا حصول،
اور مضرتوں کا دفاع حاصل ہوتا ہے۔ ارشاد الٰہی
وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ
أَمْرِ رَبِّي (اور تجھ سے پوچھتے ہیں روح کو تو کہہ
روح ہے میرے رب کے حکم سے) اور نَفَخْتُ
فِيهِ مِنْ رُوحِي (اور پھونک دوں اس میں
اپنی جان سے) میں اسی "روح" کا ذکر ہے۔ اور
اپنی ذات کی طرف اس کی نسبت باعتبار ملکیت
ہے، اور اس نسبت سے تخصیص اس کی شرافت
وعظمت کے لیے ہے جس طرح ارشاد ہے وَطَهِّرْ
بَيْتِيَ (اور میرے گھر کو پاک رکھ) اور يَا عِبَادِي
(اے میرے بندو) نیز اشراف ملائکہ ارواح
سے موسوم کیے گئے جیسے يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ
وَالْمَلَائِكَةُ (جس دن کھڑا ہو فرشتہ روح نامی
اور سب فرشتے صف باندھ کر) اور تَعْرُجُ
الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ (چڑھیں گے فرشتے اور
روح) یعنی جبریل اور نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ
الْأَمِينُ (اس کو روح الامین لے کر
اترا ہے) جبریل اس نام سے موسوم
ہیں اور قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ
(تو کہہ اس کو اتارا ہے پاک فرشتہ نے)
اور أَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ (اور
ہم نے زور دیا اس کو روح پاک سے)
میں ان کا نام "روح القدس" لیا۔ اور
ارشاد الٰہی وَرُوحٌ مِنْهُ (اور روح
ہے اس کے ہاں کی) میں حضرت عیسیٰ
علیہ السلام "روح" سے موسوم ہوئے
کیونکہ وہ مردوں کو جلاتے تھے اور آیت
شریفہ وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا
مِنْ أَمْرِنَا (اور اسی طرح ہم نے وحی
کی تمہاری طرف قرآن کی، اپنے حکم سے)
میں قرآن کا نام "روح" رکھا گیا کیونکہ قرآن
اس حیات اخروی کا سبب ہے جس کا بیان
آیت وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ
(اور پچھلا گھر جو ہے سو وہی ہے زندگانی) میں
ہے"
. . . .

. . . .

شیخ جلال الدین سیوطی تحریر فرماتے ہیں

"لفظ "روح" متعدد معانی کے لیے استعمال ہوا ہے (۱) امر وَرُوحٌ مِّنْهُ (اور اس کا امر ہے) (۲) وحی یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوحِ (اتارتا ہے فرشتے وحی لے کر) (۳) قرآن۔ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ اَمْرِنَا (ہم نے وحی کی تیری طرف قرآن کی اپنے حکم سے) (۴) رحمت، وَاَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِّنْهُ (اور ان کی مدد کی اپنی رحمت سے) (۵) حیات فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ[1] (پس زندگی ہے اور روزی ہے۔) (۶) جبریل، فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوحَنَا (پھر بھیجا ہم نے اس کی طرف اپنا فرشتہ) نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْاَمِيْنُ (اس کو فرشتہ معتبر لے کر اترتا ہے) (۷) ایک عظیم المرتبت فرشتہ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ (جس دن کھڑا ہو فرشتہ روح نامی) (۸) ایک خاص فرشتوں کا لشکر تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ فِيْهَا (اترتے ہیں فرشتے اور ان کا خاص لشکر اس میں) (۹) روح بدن وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوحِ (اور تجھ سے پوچھتے ہیں جان کے متعلق)[2]۔

امام ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی، کتاب الاسماء والصفات میں بعض مفسرین سے ناقل ہیں۔

"روح" کبھی بمعنی رحمت آتی ہے۔ فرمایا اللہ عزوجل نے وَاَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِّنْهُ یعنی اپنی رحمت سے ان کو تقویت دی، اور ارشاد ہے فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوحِنَا (پھر اس میں ہم نے اپنی روح پھونک دی) یعنی اپنی رحمت، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "روح اللہ" کہا جاتا ہے یعنی جو ان پر ایمان لائے ان کے لیے رحمت الٰہی ہیں، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کبھی "روح" بمعنے وحی ہوتی ہے۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (اتارتا ہے وحی اپنے حکم سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں) اور فرمایا وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ اَمْرِنَا (اور اسی طرح وحی کی ہم نے تیری طرف روح کی اپنی طرف سے) نیز ارشاد ہے يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ اَمْرِهٖ (اتارتا ہے فرشتے وحی لے کر اپنے حکم سے) کہ یہاں (روح سے) وحی مراد ہے، اور وحی "روح" سے اس لیے موسوم ہے کہ وہ لوگ)

---

[1] بعض قراء نے روح بالضم پڑھا ہے

[2] ملاحظہ ہو الاتقان ج ۱ ص ۱۴۲ طبع مصر

جہالت کی حیات ہے، اور اسی لیے حضرت مسیح عیسےٰ بن مریم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا نام روح ہوا کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ ان کے متبعین کو ہدایت فرماکر کفر وضلالت (کی موت) سے زندگی بخشتا ہے، اور فرمایا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُّوحِنَا یعنی وہ ہمارے ایک کن کے کہہ دینے سے بغیر باپ کے بشر بن گیا، نیز حضرت جبریل علیہ السلام کو روح سے موسوم کیا گیا ارشاد ہے قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ، نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ، أَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ، فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا کہ سب جگہ جبریل علیہ السلام مراد ہیں اور فرمایا تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا (اترتے ہیں فرشتے اور روح اس میں) بعض کا قول ہے کہ اس سے جبریل علیہ السلام مراد ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ وہ فرشتہ معظم مراد ہے جو آیہ شریفہ يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا میں مراد ہے" ص ۲۶۴

آیت شریفہ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي کی تفسیر میں امام بیہقی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں کہ یہ ایک فرشتہ ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ یہ فرشتوں میں ایسا فرشتہ ہے جس کے ستر ہزار منہ ہیں ہر منہ میں ستر ہزار زبانیں ہیں ہر زبان کی ستر ہزار بولیاں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتا رہتا ہے حق تعالیٰ ہر تسبیح سے ایک فرشتہ پیدا کرتے ہیں جو قیامت تک فرشتوں کے ہمراہ اترتا رہتا ہے،[۱] امام خطابی فرماتے ہیں

"ارواح میں سے جس روح کے متعلق سوال ہوا اس کے بارے میں علماء مختلف ہیں، بعض کہتے ہیں یہاں جبریل علیہ السلام مراد ہیں، اور بعض کا قول ہے کہ وہ فرشتوں میں ایک خاص صفت کا فرشتہ ہے جس کے متعلق ان کا بیان ہے کہ وہ عظیم الخلقت ہے اور اکثر اہل تاویل اس طرف گئے ہیں کہ سوال اس روح کے متعلق کیا تھا جس سے حیات جسم وابستہ ہے، اور ان میں اہل نظر کا یہ بیان ہے کہ روح کی کیفیت کو دریافت کیا تھا کہ کس طرح بدن میں چلتی ہے اور جسم میں اس کے امتزاج اور حیات کے اس سے وابستہ

[۱] الاسماء والصفات ص ۲۶۵

ہونے کی کیا صورت ہے" [1]

امام قرطبی لکھتے ہیں۔

"راجح یہی ہے کہ انہوں نے روح انسانی کے متعلق سوال کیا تھا کیونکہ یہود حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے روح اللہ ہونے کے قائل نہیں اور اس سے ناواقف نہیں کہ جبریل ایک فرشتہ ہے اور ملائکہ ارواح ہیں" [2]

علامہ ابن القیم نے کتاب الروح میں اس کو ترجیح دی ہے جس کا آیت شریفہ یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا میں مذکور ہے ان کا بیان ہے کہ ارواح بنی آدم کو قرآن میں نفس کے علاوہ اور کسی نام سے موسوم نہیں کیا گیا۔ لیکن حافظ ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں کہ یہ چیز ان کے مدعا پر دلالت نہیں کرتی بلکہ راجح قول اول ہی ہے کیونکہ طبری بطریق عوفی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس قصہ میں راوی ہیں کہ انہوں نے روح کے متعلق کہا تھا کہ اسے جسم میں کس طرح عذاب کیا جائے گا۔ [3] یہ واضح رہے کہ تورات اور انجیل میں "روح" کا لفظ فرشتہ کے لیے آیا ہے اور قرآن مجید میں اس کا استعمال جیسا کہ سابق میں گذرا مختلف معانی میں ہوا ہے، اب یہاں "الروح" سے مراد جسم انسانی کی روح ہو یا فرشتہ یا وحی، جواب کی جامعیت ہر ایک پر حاوی ہے کہ جو کچھ تمہیں بتلایا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کا حکم کام کر رہا ہے اس سے زیادہ بتلانے کی تمہاری تنگنائے علم میں وسعت نہیں کہ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا (تمہیں جو کچھ علم دیا گیا ہے وہ تھوڑا ہے)

آیۂ کریمہ یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا کی تفسیر میں ابن ابی حاتم بطریق علی بن ابی طلحہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ یہ ایک فرشتہ ہے جو خلقت کے اعتبار سے سب فرشتوں سے بڑا ہے۔ [4] اور بیہقی بطریق عطیہ عوفی، ابن عباس سے اس کی تفسیر میں یہ راوی ہیں کہ مراد یہ ہے جب انسانوں کی روحیں فرشتوں کے ساتھ کھڑی ہوں گی یہ دونوں صور کے پھونکے جانے کے درمیان روحوں کو

[1] الاسماء والصفات ص ۲۶۲ [2] فتح الباری ج ۸ ص ۳۰۴ [3] ایضاً ج ۸ ص ۳۰۵

[4] الاتقان ج ۲ ص ۱۴۱ طبع مصر

جسموں کی طرف لوٹائے جانے سے پہلے ہوگا۔
اور ابو صالح سے اسی آیت کی تفسیر میں یہ روایت
کیا ہے کہ روح انسانوں کی طرح ایک مخلوق ہے
پر وہ انسان نہیں ہیں ان کے ہاتھ اور پاؤں ہیں
نیز مجاہد سے ناقل ہیں کہ روح انسانوں کے مانند
ایک مخلوق ہے اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما
سے بطریق مجاہد روایت کی ہے کہ روح اللہ
کا ایک امر اور اس کی ایک مخلوق ہے ان کی
صورتیں انسانوں کی صورتوں پر ہیں، آسمان سے
جب کوئی فرشتہ اترتا ہے تو اس کے ساتھ ایک
روح ہوتی ہے ۱؎

"روح" کیا چیز ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے
اس بارے میں بڑا اختلاف رائے ہے کہا جاتا ہے
کہ اس اختلاف کی تعداد سو اقوال تک جا پہنچی ہے
سلف نے اس قسم کی باتوں میں بحث کرنے سے
سکوت اختیار کیا ہے، حافظ ابن حجر فتح الباری
میں لکھتے ہیں۔

وثبت عن ابن عباس — حضرت ابن عباس سے یہ
انہ کان لا یفسر — ثابت ہو کہ وہ روح کی
الروح ای الذی — تفسیر نہیں کرتے تھے
المراد بہ ۲؎ — یعنی تعیین نہیں کرتے
تھے کہ یہی مراد ہے۔

عبد اللہ بن بریدہ جو ثقات تابعین میں سے
ہیں لکھتے ہیں کہ اللہ نے روح پر نہ کسی ملک
مقرب کو مطلع فرمایا نہ کسی نبی مرسل کو ۳؎

عارف ربانی شیخ عبد الوہاب شعرانی نے
اپنی نفیس کتاب الیواقیت والجواہر فی بیان
عقائد الاکابر میں جس میں انہوں نے ارباب
کشف اور اہل کلام کے عقائد میں مطابقت
کی کوشش کی ہے اور جیسا کہ خود ان کا
بیان ہے اس موضوع پر ان سے پہلے کسی
نے قلم نہیں اٹھایا "روح" پر ایک مستقل بحث
سپرد قلم فرمائی ہے جس کا اقتباس ہدیہ ناظرین
ہے۔

"تریسٹھویں بحث اس امر کے بیان
میں کہ ساری روحیں مخلوق ہیں اور جیسا کہ وارد

۱؎ الاسماء والصفات ص ۲۶۵، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس اخیر روایت کو ابن اسحٰق کی تفسیر سے
نقل کرکے کہا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے ۲؎ فتح الباری ج ۸، ص ۳۰۵ ۳؎ ایضاً ج ۸، ص ۴۰۳
۴؎ معالم التنزیل ج ۴، ص ۱۴۸ طبع مصر

ہے اللہ تعالیٰ کے امر (حکم) سے ہیں اور جس نے بھی اپنی عقل سے اس کی حقیقت کے پہچاننے پر غور کیا ہے وہ اس بارے میں یقین پر نہیں ہے بلکہ جو کچھ ہے اس کا ظنی تخمینہ ہے“۔

اور ہم کو یہ نہیں ملا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حقیقت پر کلام فرمایا ہو باوجودیکہ آپ سے اس کے متعلق سوال ہوا تھا پس ہم بھی ادباً اس سے باز رہتے ہیں۔

”روح“ کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ موجود ہے جیسا کہ ابو القاسم جنید وغیرہ نے کہا ہے چنانچہ جنید رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں۔

الروح شئ استاثر اللہ تعالیٰ بعلمہ ولم یطلع علیہ احداً من خلقہ فلا یجوز لاحد البحث عنہ باکثر من انہ موجود	”روح“ ایک ایسی شے ہے جس کا علم اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے اور اس نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو اس پر مطلع نہیں فرمایا لہٰذا اس کے متعلق کسی کو اس سے زیادہ بحث کرنا جائز نہیں کہ وہ موجود ہے۔

اکثر مفسرین جیسے ثعلبی اور ابن عطیہ بھی اسی طرف گئے ہیں اور جمہور متکلمین کا بیان یہ ہے کہ ”روح“ ایک جسم لطیف ہے جو بدن میں اسی طرح گھسی ہوئی ہے جس طرح کہ شاخ سبز میں پانی ہوتا ہے، اور بہت سے متکلمین کا قول ہے کہ وہ عرض ہے یعنی ایسی حیات کہ جس کے وجود سے بدن انسانی زندہ ہے قاضی ابو بکر باقلانی اسی طرف مائل ہیں، اور احادیث میں جو روح کے اترنے چڑھنے اور برزخ میں چلنے پھرنے کا ذکر آتا ہے وہ قول اول پر دلالت کرتا ہے یہ سہروردی کا بیان ہے اور یہ اجسام کی صفت ہے اعراض کی نہیں کیونکہ عرض ان اوصاف سے موصوف نہیں ہوتا اور بہت سے صوفیہ نے کہا ہے کہ روح نہ جسم ہے نہ عرض بلکہ جوہر[1] مجرد قائم بالذات اور غیر متحیز ہے، بدن کی تدبیر و تحریک کے لیے اس کا بدن سے خاص تعلق ہے وہ نہ بدن میں داخل ہے نہ اس سے خارج، فلاسفہ کی یہی رائے ہے اور یہ ایک گری ہوئی بات ہے۔

[1] جوہر وہ ہے جو بذات خود قائم ہو جیسے کپڑا اور عرض وہ ہے جو بذات خود قائم نہیں ہوتا بلکہ اس کا قیام بواسطہ جوہر ہوتا ہے جیسے رنگ۔

اور نتیجے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ
بالفرض اگر بندہ کو حقیقتِ روح پر مطلع بھی کر دیا جائے
تو وہ اس کی استطاعت نہیں رکھتا کہ اس کو ایسی
عبارت میں بیان کر سکے کہ جو سننے والے کو
اس کی حقیقت کی معرفت تک پہنچا دے کیونکہ
حق تعالیٰ نے اس کو ہمارے لیے ایسے مرتبہ میں
رکھا ہے جو ہمیں عاجز کر دیتا ہے تاکہ ہم میں سے
ہر کوئی اپنے دل میں یہ کہہ اٹھے کہ جب ہم اپنی ذات
کی حقیقت کے پہچاننے سے عاجز ہیں تو ذاتِ
الٰہی کی معرفت میں کس قدر عاجز بلکہ عاجز تر ہوں گے
لہٰذا ہمیں ذاتِ الٰہی کے بارے میں غور و خوض نہ
کرنا چاہیے کیونکہ جب ہم اپنی روح ہی کی معرفت سے
عاجز ہیں حالانکہ وہ مخلوق ہے اور سب چیزوں سے
زیادہ ہم سے قریب ہے تو اپنے خالق کو کیسے
پہچان لیں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کلام
میں وارد ہے من عرف نفسہ فقد عرف
ربہ۔ (جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے
رب کو پہچانا) بعض عرفا نے کہا ہے کہ مطلب یہ
ہے چونکہ کسی کو بھی اپنے نفس کی معرفت کبھی ممکن
نہیں کیونکہ حق تعالےٰ نے نفس کو اس طرح بنایا ہے
کہ وہ ہمارے اور اس کی معرفتِ ذات کے درمیان

ایک عاجز کر دینے والا مقام ہے گویا حق
تعالیٰ یوں فرما رہے ہیں کہ جب انسان اپنے
نفس کی معرفت سے بھی قاصر ہے باوجودیکہ
وہ مخلوق ہے اور سب چیزوں میں انسان سے
زیادہ قریب ہے تو اس ذات کی معرفت
کس طرح حاصل ہو سکتی جس کی نہ شبیہ ہے
نہ نظیر اور نہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ کسی
حد میں جمع ہو سکتا ہے نہ کسی حقیقت میں۔
کمال بن ابی شریف نے اپنے حاشیہ
میں کہا ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ لوگوں نے
روح کی معرفت میں کیوں خوض کیا حالانکہ
شارع نے اس بارے میں خاموشی اختیار
کی ہے تو اس کا جواب دو طرح پر ہے۔
اوّل یہ کہ تفصیلی جواب اس لیے ترک کر دیا
گیا کہ یہود باہم یہ کہتے تھے کہ اگر اس کے
متعلق جواب نہیں دیا تو وہ سچے ہیں کیونکہ
ان کے نزدیک یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی علاماتِ نبوت میں داخل تھی پس آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کا روح کے متعلق جواب نہ
دینا ان کی کتابوں میں جو یہ وصف مذکور تھا
اس کی تصدیق کے لیے تھا، دوم یہ کہ سوال

محض تنگ کرنے اور تغلیط وبدگوئی کے لیے تھا
اور جب سوال اس طرح پر ہو تو اس کا جواب
ضروری نہیں کیونکہ الروح ایک ایسا امر ہے جو
جو روح انسانی، جبریل، اور ایک اور فرشتہ کے
درمیان جس کو الروح کہا جاتا ہے مشترک ہے
نیز فرشتوں کی ایک خاص صنف اور قرآن اور
عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کے لیے بھی اس کا
استعمال ہوتا ہے لہٰذا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی جواب میں
فرماتے تو یہود عیب گیری اور آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کی اذیت کے لیے ضرور کہہ اٹھتے کہ
ہماری تو یہ مراد نہ تھی، یہی سبب ہے کہ جواب
اجمالی طور پر اس طرح آیا کہ روح کے ہر معنی پر
صادق ہے (یہاں تک اہل اصول کا کلام ختم
ہو گیا)

شیخ محی الدین، لوائح الانوار میں فرماتے
ہیں "روح" اللہ کے امر سے یوں ہوئی کہ وہ بغیر
کسی واسطہ کے حق تعالےٰ کے فرمانے سے وجود
میں آئی ہے، اس نے روح سے فرمایا کونی
(ہو جا) وہ ہو گئی، جیسا کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام
کے بارے میں کہا ہے کہ وہ روح اللہ ہیں
کیونکہ بلا واسطہ حق تعالیٰ کے پھونکنے سے
(جیسا پھونکنا کہ اس کے جلال کے لائق ہے)
وجود میں آئے ہیں، اللہ فرماتا ہے اِنَّمَا
الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللّٰهِ
وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ
مِّنْهُ (سوائے اس کے نہیں کہ مسیح جو
ہے عیسےٰ مریم کا بیٹا رسول ہے اللہ کا اور
اس کا کلام جو ڈال دیا مریم کی طرف اور روح
ہے اس کے ہاں کی) اور غزالی اس طرف
گئے ہیں کہ ارشاد خداوندی قُلِ الرُّوحُ
مِنْ أَمْرِ رَبِّي کے معنے من غیب کے ہیں
یعنی روح اس کے غیب سے ہے کیونکہ عالم
امر عالم غیب ہے اور عالم خلق عالم شہادت
ہے۔ ابن عربی[1] کہتے ہیں ہمارے نزدیک
معاملہ اس کے برخلاف ہے جو غزالی نے
کہا ہے کیونکہ ہم کہتے ہیں حق تعالیٰ جس کو
بلا واسطہ ایجاد فرمائیں وہ عالم امر سے ہے
یعنی جس سے وہ کن فرمائیں اور وہ ہو جانے
اس کا بس حق تعالیٰ ہی کی طرف ایک رخ ہوتا ہے

[1] ابن عربی مراد ہیں، یہاں سے اہل کشف کا کلام شروع ہوتا ہے

اور ہر وہ چیز جس کو وہ بالواسطہ ایجاد فرمائیں وہ عالم
خلق سے ہے اور اس کے دو رخ ہوتے ہیں
ایک حق تعالیٰ کی جانب اور دوسرا اس سبب
کی طرف جس سے وہ وجود میں آیا ہے پس کبھی تو
حق تعالیٰ اسے اس خاص رخ سے دعوت دیتے
ہیں اور کبھی تفصیلات اور بالغ حکمتوں کی بنا پر
اس رخ سے دعوت دیتے ہیں جو سبب کا ہے۔
اور فتوحات مکیہ کے بہترویں باب میں
فرماتے ہیں، روح اس لیے امر رب جل وعلا
سے ہے کہ وہ خلق سے وجود میں نہیں آئی بلکہ
اس کو اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ ایجاد فرمایا ہے
اور اس کی حقیقت پر بجز ان اصفیاء کے جن کو
حق تعالیٰ نے چاہا ہے اور کوئی مطلع نہیں ہوتا۔
اور باب ۲۹۹ میں فرمایا ہے کہ روح کے
لیے کمیت نہیں کہ وہ اپنے جوہر ذات میں زیادتی
قبول کرے بلکہ وہ فرد ہے، اور اگر عاقل بالذات
نہ ہوتی تو اخذ میثاق کے وقت اپنے خالق کی ربوبیت
کا اقرار نہ کرتی کیونکہ حق تعالیٰ اسی سے خطاب فرماتے
ہیں جس میں ان کے خطاب کی عقل ہو اور فی نفسہ
انسان کی یہی حقیقت ہے، شیخ نے اس بارے
میں بہت طول سے کام لیا ہے اور پھر فرمایا ہے

کہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے روح کو کامل،
بالغ، عاقل، توحید الٰہی کا عارف اور اپنی ربوبیت
کا معترف پیدا کیا ہے اور یہی وہ فطرت ہے
جس پر اللہ نے لوگوں کو بنایا ہے چنانچہ حدیث
کُلُّ مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ
یھودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ
(ہر بچہ اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے
ماں باپ اسے یہودی بنا لیتے ہیں یا نصرانی
کر لیتے ہیں یا مجوسی کر ڈالتے ہیں) میں اسی
کی طرف اشارہ کیا ہے، یہاں اغلب یعنی
ماں باپ کے وجود کا ذکر کیا اور جو بھی بچہ کی
پرورش کرتا ہے وہ بمنزلہ ماں باپ ہی کے ہے
نیز شیخ باب ۳۲۶ میں رقم طراز ہیں
واضح رہے کہ سارے عالم میں جو بھی کسی
صورت سے مقید ہے اس کے لیے
ایک روح الٰہی ہے جو اس کو لازم ہے اور
اسی سے وہ اللہ عز و جل کی تسبیح کرتا رہتا ہے
پس بعض ارواح تو ایسی ہیں جو اس صورت کی
مدبر ہیں کیونکہ صورت ارواح کی تدبیر کو قبول
کرتی ہے اور یہ وہ ہر صورت ہے جو ظاہری
زندگی اور موت سے متصف ہے اور اگر ظاہری

زندگی اور موت سے متصف نہیں تو اس کی روح روح تسبیح ہے روحِ تدبیر نہیں شیخ نے اس پر طویل بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے ان ارواح میں ان صورتوں کی ارواح سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا کوئی عارف نہیں کہ جو تدبیر سے بے تعلق ہیں یہ ارواح جماد ہیں اور ان سے رتبہ میں کم ارواحِ نبات ہیں اور ان سے کم مرتبہ ارواحِ حیوان ہیں اور سرکش انسانوں کی روحیں ان سے بھی گئی گذری ہیں، لیکن صالحین میں حسب تفاوت طبقات انبیاء، اولیا اور مومنین کی ارواح سے معرفت میں اعلیٰ کوئی نہیں کہ یہ اختصاصِ الٰہی ہے" [1]

علماء راسخین میں ایک مشہور بزرگ ہیں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو کشف وکلام دونوں وادیوں سے یکساں آشنا ہیں، موصوف نے اس سلسلہ میں حجاب حقیقت کے اور چند پردے اٹھائے ہیں بحث یقیناً تشنہ رہے گی اگر موصوف کے گراں قدر افادہ سے قطع نظر کر لی جائے، موصوف نے اپنی سب بے نظیر کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں ایک مستقل عنوان باب حقیقۃ الروح کے نام سے قائم کیا ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا (اور تجھ سے پوچھتے ہیں روح کو تو کہہ روح ہے میرے رب کے حکم سے اور تم کو جو علم دیا گیا ہے وہ تھوڑا سا ہے) اور اعمش نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے وَمَآ اُوْتُوْا مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا (اور ان کو جو علم دیا گیا ہے وہ تھوڑا سا ہے) پڑھا ہے، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خطاب ان یہود سے ہے جنہوں نے روح کے متعلق سوال کیا تھا اور جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے آیت اس بارے میں نص نہیں ہے کہ امتِ مرحومہ میں روح کی حقیقت کا کسی کو علم نہیں، اور یہ بھی نہیں ہے کہ شرع جس سے خاموش ہو اس کی معرفت کبھی ممکن ہی نہ ہو بلکہ بسا اوقات شریعت کسی چیز سے اس لیے سکوت اختیار کرتی ہے کہ اس کی معرفت دقیق ہوتی ہے اور گو بعض کے لیے اس کی معرفت ممکن ہو مگر جمہور امت میں اس کے دریافت کی صلاحیت نہیں ہوتی

[1] الیواقیت والجواہر ج ۲۔ ص ۱۲۲ و ۱۲۳ طبع میمنیہ مصر ۱۳۱۷ھ

واضح رہے کہ سب سے پہلے روح کی جس حقیقت کا ادراک ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ حیوان کے لیے مبدأ حیات ہے کہ اس کے اندر روح پھونکنے سے وہ زندہ اور اس سے مفارقت ہو جانے پر مردہ ہو جاتا ہے پھر جب بغور اس میں تامل کیا جائے تو یہ کھلتا ہے کہ بدن میں ایک بخار لطیف ہے جو قلب کے اندر خلاصۂ اخلاط سے پیدا ہوتا ہے جو قوی و حاسہ و محرکہ اور مدبرہ غذا کا حامل ہوتا ہے، طب کا حکم اسی پر جاری ہوتا ہے اور تجربہ یہ بتاتا ہے کہ رقت، غلظت، صفائی اور کدورت غرض اس بخار کے تمام احوال کا قویٰ میں اور ان تمام افعال میں جو قویٰ سے سرزد ہوتے ہیں ایک خاص اثر ہوتا ہے اور جو آفت کہ کسی عضو پر اور اس عضو کے مناسب بخار کی تولید پر طاری ہوتی ہے وہ اس بخار کو فاسد اور اس کے افعال میں تشویش پیدا کر دیتی ہے، اس بخار کا وجود حیات کو مستلزم ہے اور اس کا تحلیل ہو جانا موت ہے، پس پہلی نظر میں تو یہی "روح" ہے اور نظر غائر کے اعتبار سے یہ روح کا طبقہ سفلی ہے۔ بدن میں اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے گلاب کے پھول میں گلاب کا عرق یا کوئلے کے اندر آگ، پھر جب اور غور سے دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہ روح اس روحِ حقیقی کی سواری اور اس کے تعلق کا مادہ ہے کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں بچہ جوان ہو رہا ہے بوڑھا ہو رہا ہے اس کے بدن کے اخلاط اور وہ روح جس کی تولید ان ہی اخلاط سے ہوتی ہے ہزار دفعہ سے زیادہ بدل جاتی ہے، وہ کبھی چھوٹا ہے اور کبھی بڑا، کبھی سیاہ ہوتا ہے اور کبھی سپید، کبھی جاہل ہوتا ہے اور کبھی عالم، اسی طرح اور اوصاف ہیں، جو بدلتے رہتے ہیں اور شخص وہ کا وہ ہے اور اگر اس سلسلہ میں کسی بات میں مناقشہ کیا جائے تو ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ ہم ان تغیرات اور طفل کو ہو بہو فرض کریں اور کہیں کہ ان اوصاف کے بعینہ باقی رہنے کا ہم کو یقین حاصل نہیں اور اس طفل کے باقی رہنے کا یقین ہے۔ پس وہ طفل ان اوصاف سے علیحدہ ہے اور وہ شئے جس کے ذریعہ وہ وہ ہے نہ یہ روح ہے نہ یہ بدن اور نہ یہ مشخصات جو بہ نظر ظاہر معلوم ہوتے اور دکھائی دیتے ہیں بلکہ روح حقیقت میں ایک حقیقت فردانیہ اور نقطہ نورانیہ ہے جس کا

طور ان تمام تغیر پذیر متغائر اطوار سے کہ جن میں بعض
جواہر ہیں اور بعض اعراض ہیں بڑھ چڑھ کر ہے وہ
جس طرح کبیر کے ساتھ ہے اسی طرح صغیر کے
ساتھ ہے اور جس طرح سپید کے ساتھ ہے اسی
طرح سیاہ کے ساتھ ہے اور اسی طرح دیگر
متقابل اشیاء کے ساتھ، اس کو اولاً تو روحِ
ہوائی کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے اور ثانیاً
بدن کے ساتھ اس حیثیت سے کہ بدن نسمہ
(روح ہوائی) کی سواری ہے اور وہ عالمِ قدس
کا ایک روزن ہے جس سے روح ہوائی پر وہ
تمام باتیں نازل ہوتی رہتی ہیں جن کی اس میں استعداد
ہوتی ہے ایسی امور منتشرہ میں جو کچھ تغیر واقع ہوا
وہ استعدادات ارضیہ کی بنا پر ہوا جس طرح کہ
آفتاب کی دھوپ ہے کہ کپڑے کو سپید کرتی
اور دھوبی کو سیاہ کر دیتی ہے۔

اور ہمارے نزدیک وجدان صحیح سے
یہ تحقق ہو چکا ہے کہ بدن کے روح ہوائی کو پیدا
کرنے کی استعداد کو کھو دینے کے سبب بدن
سے روح ہوائی کے جدا ہو جانے کا نام موت
ہے، اور روحِ ہوائی سے روحِ قدسی کے جدا
ہو جانے کا نام موت نہیں ہے چنانچہ امراض
مہلکہ میں جب روحِ ہوائی تحلیل ہونے لگتی
ہے تو حکمتِ الٰہی میں یہ ضروری ہے کہ
روحِ ہوائی کا اس قدر حصہ باقی رہے کہ روحِ
الٰہی کا ارتباط اس سے قائم رہ سکے جس طرح
کہ شیشی سے تم ہوا کو چوسنے لگو تو ہوا اس میں
سے خالی ہوتی رہے گی یہاں تک کہ اس
حد پر جا پہونچے گی کہ اس کے بعد خالی نہ ہو سکے
اب یا تو چوسنے کی تم میں طاقت نہ رہی گی
یا شیشی پھٹ جائے گی، یہ سب کچھ اس
راز کی بنا پر ہے جو ہوائی طبیعت سے پیدا
ہے، اسی طرح روحِ ہوائی میں ایک راز ہے
اور اس کی ایک حد ہے کہ ان دونوں سے
معاملہ متجاوز نہیں ہو سکتا پھر جب انسان مر گیا
روحِ ہوائی کی نشارت ثانیہ ہوئی اب
روحِ الٰہی کا فیض مابقی حس مشترک میں
ایک خاص قوت پیدا کرے گا جو عالم مثال
(یعنی وہ قوت متوسط جو مجرد و محسوس کے
درمیان افلاک میں شئے واحد کی طرح منتشر
ہے) کی مدد سے سننے دیکھنے اور بولنے
کے لیے کافی ہوگی اور بسا اوقات روحِ
ہوائی اس وقت عالمِ مثال کی مدد سے لباسِ

نورانی یا ظلمانی کے لیے تیار ہو جاتی ہے اور یہیں سے عالمِ برزخ کے عجائبات ظاہر ہونے لگتے ہیں، پھر جب صور پھونکا گیا یعنی باری صُوَر کی طرف سے اسی طرح کا فیضِ عام آیا جیسا کہ ابتدائے آفرینش میں ہوا تھا جب کہ روحیں جسموں میں پھونکی گئی اور عالم موالید کی تاسیس عمل میں آئی تھی تو روحِ الٰہی کا فیض اس کا موجب ہوا کہ لباسِ جسمانی یا ایسے لباس میں کہ جو عالمِ مثال و عالمِ اجسام کے بین بین ہو ملبوس ہو اور اب وہ تمام باتیں پوری ہوں گی جن کے متعلق صادق و مصدوق علیہ افضل الصلوات و اتم التحیات نے مطلع فرمایا ہے اور چونکہ روحِ ہوائی روحِ الٰہی اور بدن ارضی کے درمیان برزخ متوسط ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کا ایک رخ اس طرف ہو اور ایک رخ اس طرف، اب جو رخ کہ عالمِ قدس کی طرف مائل ہے وہ ملکیت ہے اور جو زمین کی طرف مائل ہے وہ بہیمیت ہے

حقیقتِ روح کے متعلق ہم ان ہی مقدمات پر اکتفا کرتے ہیں تاکہ اس علم میں اس کو تسلیم کر لیا جائے اور اس پر تفریعات قائم کی جائیں قبل اس کے کہ اس سے اعلیٰ علم میں حجاب منکشف ہو۔ واللہ اعلم" [1]

شاہ صاحب نے آخر میں جس علم کا حوالہ دیا ہے وہ "علم حقائق" ہے، "الطاف القدس فی لطائف النفس" علم لطائف میں شاہ صاحب کا ایک بے نظیر رسالہ ہے۔ اس کی فصل دوم میں شاہ صاحب نے حقیقت روح پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے، حجۃ اللہ البالغہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس کی تلخیص ہے۔

بحث روح سے پہلے بطور تمہید رقم طراز ہیں۔

"بیان حقیقت این لطائف و خواص آں موقوف بر بیان حقیقت روح ست و آں مسئلہ از علم حقائق ست نہ از علم سلوک، و شارع صلوات اللہ علیہ و سلامہ ہیچ رمزے از علم حقائق اظہار نفرمود و بجز علم سلوک و تہذیب نفس تبلیغ نمود مگر شہوات چند کہ ہیچ طوائف عرب و عجم از اں اجنبی نیست و فرقہ نیست کہ آں علم در زبانش

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱- ص ۱۴، ۱۵ طبع خیریہ مصر- ۱۳۲۲ھ

پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایں علوم مشہورہ را اجمالا بیاد ایشاں دادہ واز خوض در تفصیل و تصویر آں زجر شدید فرمودہ ہمین ست سنۃ انبیاء اللہ اجمعین. نہ پنداری کہ حل ایں علوم مقدور بشر نیست نہ نہ بلکہ اظہار ایں علوم موافق مصلحت جمہور مخاطبان نیست ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

اولی واخری در حق ما مردم نیز ہمین ست کہ ازیں تن زنیم و دیدہ را نادیدہ سازیم لیکن اختلاف صوفیہ دریں مسئلہ بسیار شد وطبائع ایشاں مشوف شدند وعلم لطائف بر ایں مسئلہ مبنی شد پس ضرورت پیش آمد دالقصہ ورۃ تبییع المخدورات"[1]

مزید تفصیل کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کافی ہے حافظ ابن مندہ اور علامہ ابن القیم نے روح کے متعلق مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں روح پر روایات واحادیث کی روشنی میں بحث کی ہے، دونوں کی تصنیف کا نام "کتاب الروح" ہے، ابن مندہ کی تصنیف اس وقت نایاب ہے. حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس کا حوالہ دیا ہے[2]. اور ابن القیم کی کتاب عرصہ ہوا کہ مصر سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

ب ۶/۳ ب ۱۴/۱۶ ب ۱۵/۱۰ ب ۱۹/۱۵ ب ۲۴/۷ ب ۲۸/۳
ب ۲۹/۷ ب ۳۰/۲۲ ر و حا ب ۲۵/۶

رُوحُ الْقُدُس روح پاک، جانِ پاک، پاک فرشتہ، موصوف کی اضافت صفت کی طرف ہے جیسے حاتم الجود اور رَجُلُ صِدْقٍ ہے، امام بغوی آیہ اَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"روح القدس" کے بارے میں علماء مختلف ہیں، ربیع وغیرہ کا بیان ہے کہ وہ روح مراد ہے جو حضرت عیسٰے علیہ السلام میں پھونکی تھی، اور قدس اللہ ہے، حق تعالیٰ نے اس کی اضافت اپنی ذات کی طرف تکریم و تخصیص کے لیے کی ہے یعنی وہ روح جو اللہ نے ان میں پھونکی جیسے بیت اللہ اور ناقۃ اللہ ہے چنانچہ ارشاد ہے فَنَفَخْنَا فِیْہِ مِنْ رُّوْحِنَا (پھر ہم نے اس میں اپنی روح کو پھونک دیا) اور دَرُوْحٌ

[1] الطاف القدس فی لطائف النفس ص ۵ و ۶ طبع احمدی دہلی ۱۳۰۵ھ [2] فتح الباری ج ۸. ص ۳۰۶

مِنْهُ (اور روح ہے اس کے ہاں کی) اور بعض کا قول ہے کہ قدس سے طہارت مرادلی ہے یعنی روح طاہرہ، ان کی روح کو قدس سے اس لیے موسوم کیا کہ وہ نہ مردوں کی پشت میں ہے نہ عورتوں کے رحم میں بلکہ اللہ کے امر میں سے ایک امر تھی (قتادہ، سُدّی)، اور ضحاک کا قول ہے کہ "روح القدس" جبریل علیہ السلام ہیں، بعض نے کہا کہ وہ قدس یعنی طہارت سے اس لیے موسوم ہوئے کہ انہوں نے کبھی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا، اور حسن کہتے ہیں کہ قدس اللہ اور اس کی روح جبریل ہیں۔ اللہ فرماتا ہے قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ (تو کہہ اس کو اتارا ہے پاک فرشتہ نے تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ) اور حضرت عیسے علیہ السلام کی تائید جبریل علیہ السلام کے ذریعہ اس طرح کی گئی کہ ان کو حکم تھا جہاں وہ جائیں ان کے ساتھ رہیں یہاں تک کہ ان کو آسمان پر اٹھا لیا گیا، اور بعض کا قول ہے کہ جبریل علیہ السلام کو جو روح سے موسوم کیا گیا وہ ان کی لطافت کے سبب اور وحی سے ان کے تعلق کی بنا پر کیا گیا کہ جو دلوں کی زندگانی کا باعث ہے اور ابن عباس اور سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ روح القدس اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم تھا جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مُردوں کو جلاتے اور لوگوں کو عجائبات دکھاتے تھے، اور بعض کا قول ہے کہ وہ انجیل ہے جس کو حضرت عیسے علیہ السلام کے لیے روح بنا دیا گیا تھا جس طرح سے کہ قرآن کو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے روح کر دیا گیا تھا کیونکہ وہ قلوب کی زندگانی کا سبب ہے، اللہ فرماتا ہے وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا (اور اسی طرح ہم نے تیری طرف وحی کی قرآن کی اپنے حکم سے)[1]

ابن ابی حاتم نے باسناد ثقات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اور طبری نے محمد بن کعب قرظی سے روایت کیا ہے کہ "روح القدس" جبریل ہیں، ابو عبیدہ اور بہت علماء کا اس پر یقین ہے[2]، امام بخاری نے بھی سورۂ نحل کی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے، واضح رہے کہ آیۂ کریمہ قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ

[1] معالم التنزیل ج ۱۔ ص ۶۸ و ۶۹

[2] فتح الباری ج ۸۔ ص ۲۹۱

تو بالاتفاق روح القدس سے جبریل علیہ السلام
ہی مراد ہیں، اور اَیَّدْتُکَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ اور
اَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ میں اگرچہ اختلاف
اقوال ہے مگر صحیح اور راجح یہی ہے کہ یہاں بھی جبریل
علیہ السلام ہی مراد ہیں پ۱ ع۲ پ۷ پ۱۴ ع۲
رُوْحَنَا ہماری روح، ہمارا فرشتہ، رُوْحِ مضاف
نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ قرآن مجید میں یہ الفاظ
تین جگہ آئے ہیں جہاں رُوْحَنَا ہے وہاں اصح
یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام مراد ہیں اور جہاں
مِنْ رُّوْحِنَا ہے وہاں اصح یہ ہے کہ حضرت
عیسیٰ علیہ السلام کی روح مراد ہے، پ۱۶ ع۵ پ۱۷ ع۶ پ۲۸ ع۲۰
رُوْحِہٖ اس کی روح، رُوْحِ مضاف ہٖ
ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، حضرت
شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ آیہ کریمہ
وَنَفَخَ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِہٖ (اور پھونکی اس میں اپنی جان
میں سے) کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔
" اپنی جان میں سے" جو مخلوق ہے اسکی مال
ہے مگر جس کو عزت دی اس کو اپنا کہا جیسے فرمایا
اِنَّ عِبَادِیْ سو انسان کی جان غیب سے آئی
ہے مٹی پانی سے نہیں بنی اس کو اپنی کہا اور یہ نہ
سمجھے کہ اللہ کی جان، جان ہو تو بدن ہو، بدن ہو
تو ترکیب بھی ہو، ذات پاک کہاں رہی" پ۱۴ ع۲۱
رُوْحِیْ میری روح، میری جان، رُوْحِ
مضاف، ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ حضرت
شاہ عبدالقادر صاحب زیر آیت وَنَفَخْتُ
فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ (اور پھونک دوں اس
میں اپنی جان سے) سورہ حجر میں رقم طراز ہیں۔
" "اپنی جان" یعنی خاص جس میں نمونہ ہے
اللہ کی صفات کا علم اور تدبیر اور یاد حق کی
اور لگاؤ اللہ سے"
اور سورہ ص میں تحت آیہ مذکورہ فرماتے ہیں
" "اپنی ایک جان" یعنی آب و خاک کی
نہیں بنی، غیب سے آئی"
امام بیہقی فرماتے ہیں
"جس روح میں سے آدم علیہ السلام
کے اندر پھونکا گیا وہ اللہ کی مخلوقات میں سے
ایک مخلوق ہے جس سے حق تعالیٰ نے
اجسام کی زندگانی کو قرار دیا ہے اور اپنی
ذات کی طرف اس کی اضافت بسبب
خلق و ملکیت ہے، اس بنا پر نہیں ہے کہ
روح اس کا جزء ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسا
کہ ارشاد عز و جل ہے وَسَخَّرَ لَکُمْ مَا

فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ
(اور مسخر کیا تمہارے واسطے جو کچھ آسمانوں میں ہے
اور جو کچھ زمین میں ہے، سب اسی کی طرف سے
ہے یعنی سب اسی کی مخلوق ہے" لہ پ ۱۴/۳

پ ۲۳/۱۴
رُءُوْسٌ اصل، سر، رَاسٌ کی جمع ہے۔

پ ۳ پ ۲۳/۶
رُءُوْسَكُمْ تمہارے سر، رُءُوْسٌ مضاف
كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، پ ۲/۸ پ ۶

پ ۲۶/۱۲
رُءُوْسِهِمْ اُن کے سر، رُءُوْسٌ مضاف
هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۱۳/۱۹ پ ۱۵/۵

پ ۱۷ پ ۲۱/۱۵ پ ۲۸/۱۳
رَوْضٰتِ باغات، سبزہ زار، رَوْضَةٌ
کی جمع، پ ۲۵/۴

رَوْضَةٍ باغ، سبزہ زار، اس کی جمع
رِيَاضٌ بھی آتی ہے پ ۲۱/۵

رَوْعُ خوف، ڈر، رَاعَ يَرُوْعُ کا مصدر
ہے، پ ۱۲/۷

رَءُوْفٌ مہربان، شفقت کرنے والا، الرَّأْفَةُ
سے بروزن فَعُوْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ،
اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے۔ امام حلیمی
فرماتے ہیں۔

"اس کے معنے ہیں اپنے بندوں سے
نرم برتاؤ کرنے والا، کیونکہ حق تعالیٰ نے ان
پر ایسی عبادتیں مقرر نہیں فرمائیں جن کی وہ
بسبب اپاہج ہوئے یا بیماری یا ضعف کے
باعث طاقت نہیں رکھتے بلکہ جن عبادات
کی ان میں طاقت تھی ان سے بھی بدرجہا زیادہ
کم عبادات کا مکلف فرمایا اور ساتھ ہی شدت
قوت کے زمانے میں اپنے فرائض کو سخت
فرمایا اور ضعف اور قوت کی کمی کے وقت
ان کو ہلکا کر دیا۔ مقیم کو ان باتوں پر پکڑا جن پر
مسافر کو نہ پکڑا اور تندرست کی ان امور پر گرفت
کی جن پر بیمار کی گرفت نہ کی یہ سب کچھ رافت
و رحمت ہے"۔

امام خطابی نے رحمت و رافت کا فرق بیان
کیا ہے کہ
"رحمت تو کسی مصلحت کی بنا پر کبھی ناپسندیدگی
میں بھی ہوتی ہے لیکن رافت ناپسندیدگی میں

لہ کتاب الاسماء والصفات ۲۶۲

تقریباً نہیں ہوتی" لہ

(ملاحظہ ہو رأفۃً) پ ۲ پ ۳ پ ۱۱ پ ۱۴ پ ۱۷ پ ۲۱ پ ۲۷ پ ۲۸

رُومِ قوم روم، رومی، کبھی تو اس لفظ کا استعمال قوم روم کے لیے ہوتا ہے اور کبھی رُومِیٌّ کی جمع کے لیے جس طرح کہ عجمٌ ہے۔ پ ۲۱

رُوَيْدًا تھوڑی سی مہلت، اسم فعل ہے۔ ابن خالویہ کہتے ہیں، یہ اصل میں إِرْوَادًا ہے رُوَيْدٌ، إِرْوَادٌ کی تصغیر ہے، رُوَيْدًا کے معنے مہلت دینے اور ٹھیرنے کے ہیں، کہا جاتا ہے اِمْشِ مَشْيًا رُوَيْدًا یعنی آہستہ چل جلدی نہ کر،[۲] اور سیوطی نے اتقان میں لکھا ہے کہ رُوَید اسم ہے ہمیشہ مصغر اور مامور بہ ہو کر بولا جاتا ہے یہ رَوْدٌ کی تصغیر ہے جس کے معنی مہلت کے ہیں[۳] پ ۳۰

فصل الهاء

رِهٰنٌ گرو، رہن، رِهْنٌ کی جمع ہے بمعنی مَرْهُوْنٌ۔ پ ۳

رَهَبٌ ڈر، رَهِبَ یَرْهَبُ کا مصدر ہے جس کے معنے ڈرنے کے ہیں، بعض کا قول ہے کہ حمیری زبان میں رہب آستین کو کہتے ہیں، اصمعی کا بیان ہے کہ میں نے ایک اعرابی کو کہتے ہوئے سنا اعطنی ما فی رهبك (جو تیری آستین میں ہے مجھے دیدے) اس صورت میں آیت وَاضْمُمْ إِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ کے معنے ہوں گے اپنے ہاتھ کو آستین سے نکال کر اپنی طرف ملالو[۴] اسی طرح مقاتل کہتے ہیں کہ میں لفظ رہب کی تفسیر کی تلاش میں نکلا تو مجھ سے ایک اعرابیہ کی ملاقات ہوئی میں کھانا کھا رہا تھا اس نے کہا اے اللہ کے بندے مجھ پر صدقہ کر، میں نے دونوں لپ بھر کر اسے دینا چاہا تو کہنے لگی ههنا فی رهبی (یہاں ڈال میری آستین میں) لیکن پہلے معنی زیادہ صحیح ہیں۔[۵] پ ۲۰

لہ الاسماء والصفات امام بیہقی ص ۲۴۴ - [۲] اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن العظیم ص ۵۳ طبع دار الکتب المصریہ قاہرہ ۱۳۶۰ھ [۳] الاتقان - ج ۱ - ص ۱۶۳
[۴] معالم التنزیل ج ۵ - ص ۱۴۳ [۵] مفردات راغب

رَهَبًا خوف، ڈر، رَهِبَ یَرْهَبُ کا مصدر ہے، پ۲۸

رُهْبَانِ زاہدانِ اہل کتاب، اہل کتاب کے درویش، بغوی لکھتے ہیں۔

"رہبان عابدان صومعہ نشین ہیں۔ اس کا واحد رَاهِبٌ ہے جیسے فَارِسٌ اور فُرْسَانٌ اور رَاكِبٌ اور رُكْبَانٌ ہیں اور کبھی رُهْبَانٌ واحد ہوتا ہے اور اس کی جمع رَهَابِيْنُ ہے جیسے قُرْبَانٌ اور قَرَابِيْنُ" ؎۱

راغب کہتے ہیں، رُهْبَان واحد اور جمع دونوں ہوتا ہے، جو اس کو واحد قرار دیتے ہیں وہ اس کی جمع رَهَابِيْنُ بناتے ہیں اور رَهَابِنَةٌ جمع کے لیے زیادہ مناسب ہے، پ۱۰

رُهْبَانًا پ۶

رُهْبَانَهُمْ ان کے درویش، رُهْبَان مضاف، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، پ۱۰

رَهْبَانِيَّةً دنیا چھوڑنا، گوشہ نشینی، راغب لکھتے ہیں۔

الرہبانیۃ غلو فی تحمل التعبد من فرط الرھبۃ — فرط خوف سے عبادت کی بجاآوری میں غلو کرنے کا نام رہبانیت ہے

علامہ محمود بن عمر زمخشری کہتے ہیں۔

"راہبوں کا فعل رہبانیت ہے پیاپے بغیر افطار روزے رکھنا، ٹاٹ پہننا، گوشت نہ کھانا وغیرہ وغیرہ، اس کی اصل رھبۃ سے ہے" ؎۲

حضرت شاہ عبد القادر صاحب دہلوی، رہبانیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یہ فقیری اور تارک دنیا بننا نصاریٰ نے رسم نکالی جنگل میں تکیہ بنا کر بیٹھتے نہ جورو رکھتے نہ بیٹا، نہ کماتے نہ جوڑتے محض عبادت میں رہتے، خلق سے نہ ملتے اللہ نے بندوں پر یہ حکم نہیں رکھا" ؎۳

سنن ابی داؤد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی جانوں پر سختی نہ کرو کہ اللہ تم پر سختی کریگا،

؎۱ معالم التنزیل ج ۲- ص ۶۷ دائرۃ المعارف، حیدر آباد دکن، آیہ وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا۔

؎۲ الفائق فی غریب الحدیث ج ۱- ص ۲۶۹- طبع

؎۳ موضح القرآن سورہ حدید تفسیر

بلاشبہ ایک قوم (راہبوں کی جماعت مراد ہے) نے اپنی جانوں پر سختی کی تو اللہ نے ان پر سختی کی چنانچہ یہ گرجاؤں اور دیروں میں ان ہی کے بقایا ہیں رَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ (ایک دنیا چھوڑنا انہوں نے نیا نکالا ہم نے ان پر نہیں لکھا تھا)[1] مسند امام احمد بن حنبل میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم ایک سریہ (چھوٹی لڑائی) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں نکلے۔ پس ایک شخص کا گذر ایک ایسے غار پر ہوا جہاں کچھ پانی اور سبزہ تھا اس نے اپنے دل میں کہا کہ یہاں اقامت گزیں ہو کر دنیا سے کنارہ کش ہو۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں اجازت طلب کی، آپ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے یہودیت یا نصرانیت دے کر نہیں بھیجا گیا میں تو حنیفیت سمحہ (جو تمام کج رویوں سے ہٹ کر توحید کی طرف جھکی ہوئی اور آسان ہے) لے کر مبعوث ہوا ہوں، قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اللہ کی راہ میں ایک صبح نکلنا یا ایک شام نکلنا دنیا اور مافیہا سے بڑھ کر ہے اور تم میں سے کسی ایک کا صف میں قائم رہنا اس کی ساٹھ سالہ نماز سے بڑھ کر ہے[2] بغوی نے اپنی اسناد سے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رہبانیت کی اجازت مانگی تو آپ نے ارشاد فرمایا۔

ترهب امتی	میری امت کی رہبانیت
الجلوس فی المساجد	مسجد میں بیٹھنا اور نماز کا
وانتظار الصلاة[3]	انتظار کرنا ہے۔

واضح رہے کہ حدیث لا رھبانیة فی الاسلام جو زبان زد خاص و عام ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی اس کے متعلق فتح الباری شرح صحیح البخاری میں رقمطراز ہیں۔

واما حدیث لا	اور رہی حدیث لا
رهبانية فی الاسلام	رهبانية فی الاسلام
فلم اره بهذا اللفظ	تو میں نے اس کو ان
لکن فی حدیث	لفظوں نہیں دیکھا۔ لیکن
سعد بن ابی وقاص	طبرانی میں سعد بن ابی
عند الطبرانی ان	وقاص کی حدیث میں
الله قد ابدلنا	یوں ہے کہ اللہ نے
بالرهبانية الحنيفية	رہبانیت کے بدلے ہم کو
السمحة[4]	آسان حنیفیت عطا کی

[1] مشکوۃ المصابیح ص ۳۱ طبع مجتبائی دہلی [2] ایضاً ۳۴ [3] معالم التنزیل ج ۴ ص ۷۰ [4] فتح الباری ج ۹ ص ۹۶

پ ۲۷

رَهْبَةً ڈر، رعب، ایسا خوف جس میں
بچاؤ کا خیال اور اضطراب موجود ہو "رہبت"
کہلاتا ہے رَهِبَ يَرْهَبُ کا مصدر ہے۔ پ ۲۸/۵

رَهْطٌ نفر، شخص، قبیلہ، برادری، بھائی بند
راغب اور زمخشری دونوں نے لکھا ہے کہ
دس سے کم آدمیوں کی جماعت رہط کہلاتی
ہے اور بعض کا قول ہے کہ چالیس تک کے لیے
رہط استعمال ہوتا ہے۔ بیضاوی لکھتے
ہیں کہ رہط اور نفر میں فرق یہ ہے کہ رہط
کا استعمال تین یا سات سے دس تک کے لیے
ہوتا ہے اور نفر کا استعمال تین سے نو تک
کے لیے[1] قرآن نے اس کا استعمال قوم اور
برادری کے معنی میں بھی کیا ہے جس سے اس
قول کی تائید ہوتی ہے کہ چالیس اشخاص تک کی
جماعت کے لیے اس کا استعمال ہوتا ہے
زمخشری نے لکھا ہے کہ اس کی جمع أَرْهُط
آتی ہے جیسے سیبویہ کے نزدیک باطل
کی جمع میں اباطیل آتا ہے اور دوسروں کا بیان
ہے کہ رہط کی جمع أَرْهُط آتی ہے اور اشہاد
میں پیش کیا ہے ع۔ وفاضح منتضح في أراهط
پھر أَرْهُط کی جمع أَرَاهِط ہوگی[2] پ ۱۹/۱۱

رَهْطُكَ تیرا قبیلہ، تیری برادری، تیرے
بھائی بند۔ رَهْطُ مضاف کَ ضمیر واحد مذکر
حاضر مضاف الیہ پ ۱۲/۸

رَهْطِيْ میرا قبیلہ، میری برادری، میرے
بھائی بند۔ رَهْطِ مضاف، ی ضمیر واحد متکلم
مضاف الیہ پ ۱۲/۸

رَهَقًا سرکشی، تکبر، سر چڑھنا، ستم، زیادتی،
زبردستی، رَهِقَ يَرْهَقُ کا مصدر ہے
اصل میں اس کے معنی ایک شئے کے دوسری
شئے پر زبردستی چھا جانے کے ہیں اور چونکہ
اس کا لازمی نتیجہ ہے تباہی، اس لیے تباہ
ہونے کے معنی میں بھی اس کا استعمال ہوتا
ہے مبرد نے تصریح کی ہے کہ جب کسی شخص
کے متعلق کہا جائے فیہ رہق تو اس کا مطلب
یہ ہے کہ اس میں عقل کی کمی ہے جس کی بنا
پر وہ شہوت میں گھرا ہوا ہے اور برائی ہر طرف
سے اس پر چھا رہی ہے[3] آیۂ شریفہ
فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا (پھر ان کو بڑھا سر چڑھنا)

[1] انوار التنزیل ج ۲ ص ۱۲۰ طبع مصر [2] و [3] الفائق ج ۱ ص ۲۵۷

میں سرکشی اور تکبر مراد ہے اور فَلَا يَخَافُ
بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا سو وہ نہ ڈرے گا نقصان
سے نہ زبردستی سے ، میں تباہی کے معنی مراد ہیں
کیونکہ دوسرے کی زبردستی کا نتیجہ اپنی تباہی ہے ،

پ ۲۹ / ۱۱

رَهْوًا خشک ، تھما ہوا ، راغب لکھتے ہیں رھو
کے معنی ہیں ساکن یعنی تھمے ہوئے اور ٹھیرے
ہوئے کے اور بعض نے کہا ہے کہ راہ کی وسعت
مراد ہے اور یہی صحیح ہے" یہ رَهَا يَرْهُو کا
مصدر ہے جس کے معنی دریا کے تھمنے کے آتے ہیں

امام بخاریؒ سورہ حم الدخان کی تفسیر میں فرماتے
ہیں کہ مجاہد نے کہا ہے رھو خشک راستہ ہے
اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رھو کے معنی ساکن کے ہیں
حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں ،

"مجاہد کے قول کو فریابی نے اپنے طریق سے
روایت کیا ہے اور اتنا زیادہ کیا ہے کہ اسی ہیئت
پر جو کہ ضرب کے دن تھی ، (یعنی اللہ یہ فرماتا ہے کہ
سمندر کو یہ حکم نہ دو کہ وہ اصلی حالت پر رجوع کرے
بلکہ اس وقت تک کے لیے چھوڑ دو کہ (لشکرِ
فرعون) کا آخری سپاہی تک داخل ہو جائے اور

عبد بن حمید نے دوسرے طریق سے مجاہد کے
رھوا کے معنی منفرجا یعنی وسیع اور کشادہ کے
نقل کیے ہیں اور عبد الرزاق معمر سے وہ قتادہ سے
راوی ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے رخ کیا کہ
سمندر پر ضرب لگائیں تاکہ وہ باہم مل جائے اور
انہیں ڈر ہوا کہ مبادا فرعون اپنی فوجوں سے ان کا
تعاقب کرے تو ان سے کہا گیا اُتْرُكِ الْبَحْرَ
رَهْوًا (سمندر کو خشک ہی رہنے دو) یہ فرما
رہے ہیں کہ جیسا خشک راستہ بن گیا ہے رہنے دو
کیونکہ یہ لشکر غرق ہونے والا ہے"

اور دوسرا قول ابو عبیدہ کا ہے انہوں نے
وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا کی تفسیر ساکنا سے کی
ہے ، کہا جاتا ہے جاءت الخیل رھوا
یعنی ساکنۃ گھوڑے تھمے ہوئے آئے اور
أَرْبِعْ عَلَى نَفْسِكَ (اپنے اوپر نرمی کر) اور
عیش راہ (سکون کی زندگی)[1]

پ ۲۵ / ۱۴

رَهِينٌ گرو ، گرفتا ، پھنسا ہوا ، رِهْنٌ سے
جس کے معنی گرو ہونے کے ہیں بروزن
فعیل بمعنی مرہون ہے .

پ ۲۹ / ۳

رَهِينَةٌ گرو ، راغب لکھتے ہیں

[1] فتح الباری ج ۸ ص ۴۳۴

"رھینۃ کے متعلق بعض کا قول ہے کہ یہ فعیل ہے بمعنی فاعل یعنی ثابتہ مقیمہ ثابت رہنے والی، قیام کرنے والی اور بعض کا قول ہے کہ بمعنی مفعول ہے یعنی ہر جان اپنے گزشتہ اعمال کی پاداش میں رکی ہوئی ہے"

بیضاوی لکھتے ہیں۔

"کہ یہ مصدر ہے جیسے شکیمۃ، اور شکل رھن کے مفعول کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور اگر صفت ہو تو رھین کہا جاتا" [1] پ ۲۹/۱۶

فصل الیاء المثناۃ

رِءْیًا نمود، منظر، قرآن کے رسم الخط میں یہ ہمزہ ساکن کے ساتھ بغیر مرکز کے خلاف قیاس لکھا جاتا ہے رُؤْیَۃٌ سے مشتق ہے بروزن فِعْلٌ جیسے طحن اور خابز ہیں جو چیز نظر آئے اس کا نام رِءْیٌ ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے طبری نے بطریق علی بن ابی طلحہ اور ابن ابی حاتم نے بطریق ابی ظبیان منظر ہی کے معنے نقل کیے ہیں، نیز ابن ابی حاتم نے ابورزین سے کپڑوں کے اور عبدالرزاق نے بروایت معمر قتادہ سے اور ابن ابی حاتم نے حسن بصری سے صورتوں کے معنے روایت کیے ہیں [2] یہ دونوں مرادی معنے ہیں، پ ۱۶/۸

رِءَآءَ دکھاوا، دکھانا، خودنمائی، باب مفاعلت کا مصدر ہے، اس کے معنی ہیں دوسرے کو دکھانے کے لیے کسی کام کا کرنا۔ یہ لفظ تمام قرآن شریف میں ہمزہ کے ساتھ جو بغیر مرکز کے ہوتی ہے، لکھا جاتا ہے اور یاء کے نیچے نقطے نہیں دیے جاتے، پ ۳/۴ پ ۵/۳ پ ۳۰/۲

رُءْیَا خواب، قرآن مجید میں یہ لفظ بغیر واو کے صرف ہمزہ کے ساتھ بغیر مرکز ہمزہ کے لکھا جاتا ہے رَاَیٰ یَرٰی کا مصدر ہے جس کے معنے خواب دیکھنے کے ہیں، نیز بروزن فعلی خواب کا اسم بھی ہے، بیضاوی لکھتے ہیں۔

"رُؤْیَا رُؤْیَۃ ہی کی طرح ہے مگر وہ خواب میں دیکھنے کے لیے مخصوص ہے ان دونوں میں تانیث کے دو حرفوں کا فرق ہے جیسے کہ قُرْبَۃٌ اور قُرْبٰی ہے" [3]

واحدی نے تصریح کی ہے کہ "یہ اصل میں مصدر ہے

---

[1] انوار التنزیل ج ۲۔ ص ۲۷۴ [2] فتح الباری ج ۸ ص ۳۳۴ و ۳۲۳ [3] انوار التنزیل ج ۱۔ ص ۳۴۰

جیسے یسری پھر جب یہ اس چیز کا نام قرار پایا جو
سونے والے کے تخیل میں ہوتا ہے تو اسمار کی بجائے
استعمال کیا گیا" علامہ قرطبی مفہم شرح مسلم میں
لکھتے ہیں کہ بعض علماء کا بیان ہے "رویا" کبھی بمعنی
رویت بھی آتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے
وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا
فِتْنَةً لِّلنَّاسِ (اور رؤیا جو ہم نے تجھ کو دکھائی
تو اسی لیے دکھائی کہ لوگوں کے لیے ایک آزمائش
ہو) مگر حریری نے اور لوگوں کی اتباع میں اس
سے انکار کیا ہے ان کا بیان ہے کہ "رویا" خواب
کے لیے کہا جاتا ہے اور بیداری میں جو ہو اس
کو "رویت" کہتے ہیں لیکن متنبی ان لوگوں میں
سے ہے جس نے "رؤیا" کا استعمال بیداری
کے لیے کیا ہے، چنانچہ کہتا ہے ع
ورؤیاك احلى فى العيون من الغمض [۲]
(نیم باز آنکھوں کی بہ نسبت تو تیرا نگاہ بھر کر
دیکھنا آنکھوں کو زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے)

• نیز ترجمان القرآن حضرت عبد اللہ بن عباس
رضی اللہ عنہما آیۂ مذکورہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں
ھی رویا عین اریہا رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم لیلۃ اسری بہ [۳] (یہ آنکھ کا دیکھنا
تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شب
اسرا میں دکھایا گیا) حافظ ابن حجر عسقلانی
کہتے ہیں احتمال ہے کہ اس کو رویا سے موسوم
کرنے میں یہ حکمت ہو کہ امور غیب چونکہ رویت
شہادت کے مخالف ہیں اس لیے وہ عالم
خواب کے مشابہ قرار دیے گئے [۴] پ ۱۲ / ۱۶،۱۷

پ ۱۳/۵ پ ۱۵/۶ پ ۲۳/۷ پ ۲۶/۱۳

ریح، ہوائیں، ریاح کی جمع واضح رہے
کہ قرآن مجید میں جہاں "ارسال ریح" کا تذکرہ
ہے اگر لفظ جمع ہے یعنی ریاح کا لفظ استعمال
ہوا ہے تو وہاں عام طور پر رحمت کی ہوائیں
مراد ہیں اور اگر ریح یعنی واحد کا لفظ استعمال
ہوا ہے تو عذاب کے معنے مراد ہیں۔ امام
سیوطی۔ اتقان میں قرآن مجید کے قاعدہ افراد
وجمع کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں
"اور اسی قاعدہ سے ریح ہے کہ وہ جمع ہو کر
بھی مذکور ہے اور مفرد ہو کر بھی پس جہاں وہ

۱ فتح الباری ج ۱۲ ص ۳۰۹ ۲ ایضاح ۸ ص ۳۰۲ طبع میریہ مصر ۱۳۰۰ھ ۳ صحیح بخاری کتاب التفسیر
باب وما جعلنا الرؤیا التی اریناک الا فتنۃ للناس ۴ فتح الباری ج ۱۲ ص ۳۰۹ طبع میریہ مصر

سیاقِ رحمت میں ذکر کی گئی ہے جمع ہو کر مستعمل
ہوئی ہے اور جہاں سیاقِ عذاب میں آئی ہے مفرد
لائی گئی ہے، ابن ابی حاتم وغیرہ نے حضرت ابی بن کعب
رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ قرآن مجید میں
ریاح میں سے ہر شے رحمت اور ریح میں سے
ہر شے عذاب ہے، اور اسی لیے حدیث میں
وارد ہے اَللّٰھُمَّ اجْعَلْھَا رِیَاحًا وَلَا تَجْعَلْھَا
رِیْحًا (اے اللہ اس کو ریاح کر ریح نہ بنا) اور
اس کی حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ رحمت کی ہواؤں
کی صفتیں جنسیں اور منفعتیں مختلف ہیں، اور جب بھی
ان میں سے کوئی ہوا چلتی ہے تو ان کے مقابل کر
ایسی چیز ابھار دی جاتی ہے، جو اس کی تیزی کو توڑ کر
رکھ دے اور پھر ان دونوں کے درمیان سے ایسی
ہوا لطیف اٹھتی ہے جو حیوان و نبات دونوں کو
نفع دیتی ہے پس رحمت میں تو کئی ہوائیں ہوتی ہیں
اور عذاب کے اندر ہوا ایک ہی رخ پر آتی ہے
نہ ان کا کوئی روکنے والا ہوتا ہے نہ دفع کرنے
والا، البتہ سورہ یونس میں جو ارشاد الٰہی وَجَرَیْنَ
بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ (اور لوگوں کو خوش آیند ہوا
کے ساتھ لے کر چلیں) ہے وہ اس قاعدہ سے
خارج ہے، جس کی دو وجہیں ہیں ایک تو لفظی اور

وہ جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ (آیا اس کو آندھی کی
ہوا نے) کے مقابلہ میں آتا ہے، اور بعض اوقات
ایک شے مقابلہ میں جائز ہوتی ہے اور استقلالاً
ناجائز جیسے وَمَکَرُوْا وَمَکَرَ اللّٰهُ اور دوسری
معنوی اور وہ یہ ہے کہ یہاں رحمت تمام وحدتِ
رخ سے حاصل ہوگی نہ کہ اختلافِ ریاح سے
کیونکہ کشتی ایک ہی ہوا سے جو ایک ہی رخ
کی ہو چلتی ہے اور جو اس پر مختلف ہوائیں چلیں
تو تباہی کا سبب ہوں یہاں ایک ہی ہوا
مطلوب ہے اور اسی لیے اس معنی کی طیب
کے وصف سے تاکید کی گئی ہے اور اسی
پر ارشاد الٰہی جاری ہوا ہے اِنْ یَّشَاْ یُسْکِنِ
الرِّیْحَ فَیَظْلَلْنَ رَوَاکِدَ (اگر چاہے تھام دے
ہوا کو تو رہ جائیں سارے دن ٹھیرے) اور ابن
المنیر کا بیان ہے کہ یہ قاعدہ ہی پر ہے کیونکہ
ہوا کا تھم جانا کشتی بانوں کے لیے سختی اور
عذاب ہے" [1] پ ۲/۴ ش ۸/۱۴ پ ۱۴/۲ پ ۱۵/۸
پ ۱۹/۳ پ ۲۰/۱ پ ۲۱/۸ پ ۲۲/۱۴ پ ۲۵/۱۷

رَیْبٌ شک، شبہ، گمان، رَابَ
یَرِیْبُ کا مصدر ہے، اس کے معنے شک
اور گمان میں ڈالنے کے ہیں، راغب اصفہانی

[1] الاتقان ص ۳، ج ۲ طبع احمدی سنہ ۱۲۸۰ھ

لکھتے ہیں

الریب ان توهّم بالشیٔ امرا ما فینکشف عما توهّم ..... ریب یہ ہے کہ کسی شے کے متعلق آپ کو ایک بات کا وہم ہو اور وہ شے آپ کے وہم سے الگ ظاہر ہو

. . . .

غرض "ریب" کا استعمال اس شک یا گمان کے متعلق ہوتا ہے جس کی حقیقت بعد میں اس کے برخلاف منکشف ہو جائے، اور چونکہ زمانہ کی گردشوں کے تعین اوقات میں بھی شک ہوتا ہے کہ خدا جانے کب گردش کا وقت آجائے اس لیے جب زمانہ کے ساتھ ریب کا لفظ مستعمل ہوگا تو گردش کے معنے ہونگے ارشاد ہے نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (ہم راہ دیکھتے ہیں اس پر زمانہ کی گردشوں کی)،

پ۱ (۲و۱۰)، پ۳ (۹و۱۱)، پ۵ (۸)، پ۷ (۸)، پ۱۱ (۹)، پ۱۵ (۱۰و۱۲)، پ۱۷ (۸)، پ۲۱ (۱۴)، پ۲۴ (۱۱)، پ۲۵ (۲و۱۹و۲۵)، پ۲۷ (۴)

رِيْبَةٌ شبہ، شک، رَيْبٌ سے اسم ہے (رِيَبٌ جمع، پ۱۱ (۲)

رَيْبِهِمْ ان کا شک، رَيْب مضاف، هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ پ۱۰ (۱۳)

رِيْحٌ ہوا، بو، ہوا متحرک جو آسمان و زمین کے درمیان مسخر ہے ریح کہلاتی ہے، ریح اصل میں رِوْحٌ تھا اصل یہ کہ اس کی تصغیر رُوَيْحَةٌ آتی ہے لیکن ما قبل کے مکسور ہونے کی بنا پر واو کو یٰ سے بدل لیا گیا ہے اصل کے اعتبار سے اس کی جمع اَرْوَاحٌ اور کسرہ ما قبل کے اعتبار سے رِيَاحٌ آتی ہے، ریح کی چار قسمیں ہیں (۱) شمال (شمالی ہوا) یہ شام کی طرف سے چلتی ہے موسم گرما میں گرم ہوتی اور خاک اڑاتی ہے (۲) جنوب (جنوبی ہوا) جو اس کے بالمقابل ہے یہی ریح یمانی ہے۔ (۳) صبا (پروا ہوا) مشرق کی طرف سے چلتی ہے اسی کو قبول بھی کہتے ہیں (۴) دبور (پچھوا ہوا) مغرب کی سمت سے چلتی ہے، ریح کا استعمال بیشتر تو مونث ہی ہو کر ہے مگر کبھی کبھی مذکر بھی بولا جاتا ہے، یہ ابو زید نے نقل کیا ہے اور ابن الانباری کا بیان ہے کہ ریح بلا کسی علامت کے مؤنث ہے اور بجز ایک اِعْصَارٌ (بگولا) کے کہ وہ تو البتہ مذکر ہے اس کے دوسرے تمام اسماء بھی اسی کی طرح سے ہیں [1]

[1] ملاحظہ ہو المصباح المنیر فی غریب الشرح الکبیر از احمد بن محمد فیومی ج ۱ الراء مع الواو طبع خیریہ مصر ۱۳۰۵ھ

نیز ریح کا استعمال بو کے معنے میں ہوتا ہی کیونکہ
کسی چیز کی بو جو ناک میں پہنچتی ہے وہ ہوا ہی کے ذریعہ
پہنچتی ہے حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبانی
قرآن مجید میں منقول ہے اِنِّی لَاَجِدُ رِیْحَ
یُوْسُفَ (میں پاتا ہوں بو یوسف کی) اور کبھی
کبھی بطور استعارہ غلبہ کے لیے بھی ریح کا
استعمال ہوتا ہے ارشاد ہے وَتَذْهَبَ
رِیْحُکُمْ (اور جاتی رہے گی تمہاری ہوا یعنی
غلبہ ختم ہو جائے گا، پ ۴/۳، پ ۱۱/۸، پ ۱۳/۵ و ۱۴، پ ۱۵/۷
پ ۱۷/۶ و ۱۱، پ ۲۲/۸، پ ۲۳/۱۲، پ ۲۵/۵، پ ۲۶/۳، پ ۲۷/۱، پ ۲۹/۵
رِیْحًا پ ۲۱/۸ و ۱۸، پ ۲۴/۱۶، پ ۲۷/۸

رَیْحَانٌ خوشبودار پھول، روزی، احمد فیومی،
المصباح المنیر میں لکھتے ہیں

"ریحان ہر اگنے والی خوشبودار شے ہے لیکن
عام لوگوں میں جب یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے
تو مخصوص نبات کی طرف پلٹتا ہے، نیز اس کے
متعلق اختلاف ہے بہت سے یہ کہتے ہیں
کہ یہ واوی ہے اور اس کی اصل ریوحان
ہے بیا ساکنہ اور بہ واو مفتوح لیکن اس میں
ادغام کرکے تخفیف کر لی گئی ہے باین دلیل
کہ اس کی تصغیر رُیَیْحَان پر ہے اور ایک
جماعت کا یہ بیان ہے کہ یہ یائی ہے بروزن
شیطان اور اس میں تغیر نہیں ہوا ہے باین
دلیل کہ اس کی جمع ریاحین پر ہے جیسے شیطان
اور شیاطین ہیں" ؎۱

امام راغب فرماتے ہیں

"اور فرمان ایزدی فَرَوْحٌ وَّرَیْحَانٌ میں
ریحان تو وہ ہے جس میں رائحہ (بو) ہو اور
روزی کو بھی کہا گیا ہے، پھر ارشاد الٰہی وَالْحَبُّ
ذُوالْعَصْفِ وَالرَّیْحَانُ میں کھانے کے اناج
کو ریحان بتایا جاتا ہے، ایک اعرابی سے کہا
گیا کہ کہاں چلے جواب دیا اطلب من
ریحان اللہ میں اللہ کے رزق کی تلاش
میں ہوں"

محی السنہ بغوی سورہ الرحمٰن میں ریحان کی تفسیر
کرتے ہوئے رقم طراز ہیں

"اکثر کے قول میں وہ رزق ہے ابن عباس
رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ قرآن میں جہاں
ریحان ہے رزق ہی کے معنے ہیں حسن (البصری)
اور ابن زید کہتے ہیں کہ یہ وہی تمہارا ریحان ہے

؎۱ ملاحظہ ہو المصباح المنیر فی غریب الشرح الکبیر از احمد بن محمد فیومی ج ۱ - الرا، مع الواو مطبع خیریہ مصر سنہ ۱۳۵۰ھ

جسے سونگھا جاتا ہے، ضحاک کا قول ہے کہ
عصف بھس اور ریحان اس کا پھل ہے[1]
اور سورہ واقعہ میں ارقام فرماتے ہیں۔
"ریحان استراحت ہے، اور مجاہد اور سعید
بن جبیر نے رزق کہا ہے، مقاتل کہتے ہیں کہ
حمیری زبان میں یہی معنی ہیں۔ بولا جاتا ہے خرجت
اطلب من ریحان اللہ یعنی میں اللہ کے
رزق کو طلب کرنے نکلا ہوں، اور دوسروں کا
بیان ہے کہ "ریحان" سے وہی ریحان مراد ہے جو
سونگھا جاتا ہے، ابو العالیہ کا قول ہے کہ مقربین
میں کوئی دنیا سے اس وقت تک رخصت
نہیں ہوتا جب تک کہ ریحان جنت کی شاخ
لاکر اس کو سونگھا نہ دی جائے اس کے بعد اس
کی روح قبض کی جاتی ہے"[2]

علامہ ابن الجوزی نے فنون الافنان میں تصریح
کی ہے کہ قرآن میں ہمدان کی زبان میں ریحان
بمعنے رزق ہے[3]

پ ۲۷ / ۱۱ و ۱۶

۱۳ **ریحکم** تمہاری ہوا، ریح مضاف کم
ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، امام بغوی نے
اس کی تفسیر میں حسب ذیل اقوال نقل کیے ہیں۔

"مجاہد کا قول ہے تمہاری نصرت، سدی نے کہا
تمہاری جرأت و کوشش، مقاتل کہتے ہیں تمہاری
حدت، نضر بن شمیل کا بیان ہے تمہاری قوت
اخفش فرماتے ہیں تمہاری دولت یعنی حکومت"
اس کے بعد لکھتے ہیں
"اور ریح اس مقام پر حکم کے نافذ ہونے اور اس کے
مقصد کے مطابق جاری ہونے سے کنایہ ہے، جب
کسی شخص کا معاملہ اس کی مراد کے مطابق آگے بڑھنے
لگے تو عرب والے بولتے ہیں هبت ریحہ
(فلاں فلانے کی ہوا آگئی) قتادہ اور ابن زید
نے کہا ہے کہ یہ ریح نصر یعنی مدد کی ہوا ہے
کبھی کوئی مدد بغیر اس ہوا کے نہیں ہوئی جس کو حق
تعالیٰ اس لیے بھیجتا ہے کہ دشمن کے چہروں پر
ضرب لگائے اور اسی سے آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ نصرت بالصبا و
اهلكت عاد بالدبور (مجھے پروا کے ذریعہ مدد
دی گئی اور عاد کچھوا کے ذریعہ ہلاک کیے گئے)
اور نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ میں
رہا ہوں تو جب کبھی آپ دن کے ابتدائی حصہ میں

[1] تفسیر معالم التنزیل ج ۴ ص ۲۱۱ طبع صاوی ۱۳۴۶ [2] ایضاً ج ۴ ص ۱۲۴ [3] الاتقان از سیوطی ص ۱۸۹ طبع احمدی

قتال نہ فرماتے تو انتظار کرتے کہ ہوائیں چلنے لگیں
اور نمازوں کا وقت آ گئے، اور ایک روایت میں
یوں ہے کہ یہاں تک انتظار فرماتے کہ آفتاب
ڈھل جائے اور ہوائیں چلنے لگیں اور مدد اترنے
لگے" ؎۱ ب ۱/۲

رِیشًا رونق، لباسِ زینت، مال، ریش اصل
میں پرندوں کے پروں کو کہتے ہیں اس کا واحد
رِیشَۃٌ ہے اور چونکہ پرندوں کی پروں سے
رونق ہے اور وہ ان کے لیے ایسے ہی ہیں جیسے
انسان کے لیے کپڑے اس لیے بطورِ استعارہ
اس کا استعمال رونق، زیب و زینت اور کپڑوں
کے لیے ہوتا ہے، نیز رونق اور لباسِ زینت
لازمہ ہے مال کا اس لیے اس کے معنے مال
کے بھی آتے ہیں، خازن بغدادی لکھتے ہیں
"آیت میں جو لفظ ریش مذکور ہے اس کے
معنی میں علما مختلف ہیں پس حضرت ابن عباس
رضی اللہ عنہما تو مال کے معنے بیان فرماتے ہیں
اور یہی قول مجاہد، ضحاک اور سدی کا ہے کیونکہ
مال ان چیزوں میں سے ہے جس کے ذریعہ زینت
حاصل کی جاتی ہے چنانچہ جب کوئی شخص مالدار
ہو تو کہا جاتا ہے تریش الرجل (وہ مرد مالدار بن
گیا) اور ابن زید کا قول ہے کہ ریش جمال ہے اور
یہ معنی بھی زینت ہی کی طرف لوٹتے ہیں اور بیان
کیا گیا ہے کہ ریاش عربی زبان میں اثاثہ گھر
اور وہ کپڑے اور سامان کہ جس کو ظاہر میں پہنا جاتا
یا بچھایا جاتا ہے اور ریش بھی ان کے نزدیک
متاع اور اموال کو کہتے ہیں، اور بسا اوقات اہل
عرب تمام مال کو چھوڑ کر اس کا استعمال صرف لباس
اور کسوت (پہننے کے کپڑے) ہی میں کرتے ہیں
چنانچہ کہا جاتا ہے انہ لحسن الریش (یعنی
اس کے کپڑے عمدہ ہیں) اور یہ بھی بیان کیا گیا
ہے کہ ریش اور ریاش کا استعمال فراخی اور
خوش عیشی کے لیے بھی ہوتا ہے" ؎۲

ب ۸/۱۰

رِیْعٌ ٹیلا، وہ مکان مرتفع جو دور سے ظاہر ہو
"ریع" کہلاتا ہے اس کا واحد رِیعَۃٌ ہے اور
جمع رُیُوعٌ اور اَرْیَاعٌ ہے ب ۱۹/۱۱

؎۱ معالم التنزیل ج-۲ ص ۲۵ طبع بمبئی ؎۲ تفسیر لباب التاویل از خازن ج-۲ ص ۱۸۰ طبع میمنیہ مصر ۱۳۱۷ھ

بابُ الزاءِ المعجمہ

مد ۸۰

فصل الالف

زَاجِرَاتِ ڈانٹنے والیاں، زَجْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مونث، زَاجِرَۃٌ واحد۔ اکثر مفسرین کے نزدیک یہ فرشتوں کی صفت ہے جو بادل کو ڈانٹ کر ہنکاتے اور شیطانوں کو جھڑکتے رہتے ہیں، چونکہ لفظ ملائکہ مونث ہے اس مناسبت سے صفت بھی مونث ہوئی، اور بعض مفسرین کے نزدیک "زاجرات" سے وہ نواہی مراد ہیں جن سے قرآن مجید نے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے (ملاحظہ ہو زَجْرًا) پ ۲۳ ع ۵

زَادِ توشہ، خرچ راہ، فی الوقت جس کی احتیاج ہو اس سے زائد ذخیرہ کو "زاد" کہتے ہیں اَزْوَادٌ جمع، پ ۲ ع ۹

زَادَتْہُ اس نے اس کو زیادہ کیا، اس نے اس کو بڑھایا، زَادَتْ زِیَادَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مونث غائب، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو اَزِیْدُ) پ ۱۱ ع ۵

زَادَھُمْ اس نے ان کو زیادہ کیا، اس نے ان کو بڑھایا، اس میں ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، پ ۹ ع ۱۵، پ ۱۱ ع ۵

زَادَکُمْ اس نے تم کو زیادہ دیا، اس نے تم کو بڑھایا، زَادَ زِیَادَۃٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، پ ۸ ع ۱۶

زَادُوْکُمْ انہوں نے تم کو زیادہ دیا، انہوں نے تم کو بڑھایا، زَادُوْا زِیَادَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، پ ۱۰ ع ۱۲

زَادُوْھُمْ انہوں نے ان کو زیادہ دیا، انہوں نے ان کو بڑھایا۔ اس میں ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے پ ۱۲ ع ۹، پ ۲۹ ع ۱۱

زَادَهٗ اس نے اس کو زیادہ دیا، اس نے اس کو بڑھایا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے (ملاحظہ ہو زَادَکُمْ) پ ۲/۱۶

زَادَهُمْ اس نے ان کو زیادہ دیا، اس نے ان کو بڑھایا، اس میں ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب کا ہے، پ ۱/۲ پ ۴/۹ پ ۱۹/۳ پ ۲۱/۱۹ پ ۲۲/۱۷ پ ۲۶/۹

زَارِعُوْنَ کھیتی کرنے والے، زَرْعٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، زَارِعٌ واحد (ملاحظہ ہو زَرَعُوْنَ) پ ۲۷/۱۵

زَاغَ وہ بہکا، وہ کج ہوا، (ضَرَبَ) زَیْغٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو زَیْغٌ) پ ۲۷/۵

زَاغَتْ وہ چوک گئی، وہ بہک گئی، وہ پھری، وہ کج ہوئی، زَیْغٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مونث غائب، پ ۲۱/۱۸ پ ۲۳/۱۳

زَاغُوْا وہ پھر گئے، وہ کج ہو گئے، زَیْغٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ ۲۸/۹

زَالَتْ وہ زائل ہوئی، زَیَالٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مونث غائب، مَا زَالَتْ وہی رہی متواتر رہی، افعال ناقصہ میں سے ہے، فاعل کے ساتھ استمرار فعل کے معنے ہوں گے (ملاحظہ ہو زَالَ) پ ۱۷/۲

زَالَتَا وہ دونوں ٹل گئیں، وہ دونوں اپنے مقام سے ہٹ گئیں، زَوَالٌ سے ماضی کا صیغہ تثنیہ مونث غائب (ملاحظہ ہو زَوَالٌ) پ ۲۲/۱۷

زَانٍ زنا کرنے والا مرد، زِنَا سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، اصل میں زَانِیٌ تھا چونکہ اسم منقوص ہے اس لیے رفع اور جر کی حالت میں ی جو حرف علت تھی ساقط ہو جاتی ہے (ملاحظہ ہو زِنَا) پ ۱۸/۷

زَانِیْ زنا کرنے والا مرد، زِنَا سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، پ ۱۸/۷

زَانِیَةٌ زنا کرنے والی عورت، زِنَا سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مونث، پ ۱۸/۷

زَاهِدِیْنَ بیزار، زُهْدٌ اور زَهَادَةٌ سے جس کے معنی بے رغبت اور بیزار ہونے اور تھوڑے سے پر راضی ہو جانے کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، زَاهِدٌ واحد پ ۱۲/۱۲

زَاهِقٌ مٹ جانے والا، مٹ جانے والا، زائل ہو جانے والا، زَهْقٌ اور زُهُوْقٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو زَهَقَ) پ ۱۷/۲

فصل الباء الموحدہ

زَبَانِيَة سیاست کے پیادے، دوزخ کے فرشتے
"زبانیہ" عربی زبان میں سیاست کے پیادے یعنی پولیس
کے سپاہی کو کہتے ہیں، فریابی نے مجاہد سے اور ابن
ابی حاتم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرشتگان
دوزخ کے معنے نقل کیے ہیں[1] بغوی لکھتے ہیں
یہ زَبْنِيّ کی جمع ہے جو زَبْنٌ سے ماخوذ ہے جس
کے معنے دفع کرنے کے ہیں، حضرت ابن عباس
رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں "زبانیہ جہنم" مراد ہیں، یہ
اس نام سے اس لیے موسوم ہوئے کہ دوزخیوں
کو دوزخ کی طرف دھکیلیں گے[2] جرمی کے نزدیک
اس کا واحد زِبْنِيَة ہے[3] پ ۳۰ ع ۲۱

زَبَدٌ جھاگ، اسم ہے، پ ۱۳ ع ۸

زَبَدًا پ ۱۳

زُبَر لوہے کے تختے، لوہے کے بڑے بڑے
ٹکڑے، زُبْرَة کی جمع ہے جیسے کہ غُرْفَة کی
جمع غُرَف ہے، لوہے کے بڑے ٹکڑے
کو زُبْرَة کہتے ہیں، پ ۱۶ ع ۲

زُبُر کتابیں، اوراق، زَبُور کی جمع، پ ۴ ع ۱۰، پ ۱۴ ع ۱۲، پ ۱۹ ع ۱۵، پ ۲۲ ع ۱۰، پ ۲۷ ع ۱۵

زُبُرًا ٹکڑے ٹکڑے، پارہ پارہ، امام راغب
لکھتے ہیں، کبھی زُبْرَة بالوں کے گچھے کے لیے
بولا جاتا ہے، اور مجازاً اس کا استعمال ٹکڑے
ٹکڑے ہو جانے کے لیے ہوتا ہے ارشاد ہے
فَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا (پھر پھوٹ
کر کر لیا اپنا کام آپس میں ٹکڑے ٹکڑے) علامہ
زمخشری نے لکھا ہے کہ یہ زُبَر الفضة
والحدید (چاندی اور لوہے کے ٹکڑے)
سے مستعار ہے[4] قتادہ اور مجاہد نے زُبُرًا
کے معنے کتابوں کے بیان کیے ہیں یعنی ہر
فریق نے اپنا دین اس کتاب کو ٹھیرایا جس کو
دوسرے نے دین نہ بنایا،[5] اس صورت
میں زَبُور کی جمع ہوگا، پ ۱۸ ع ۴

زَبُور زبور، وہ آسمانی کتاب جو حضرت
داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ زَبَرَ سے
جس کے معنی لکھنے کے ہیں بروزن فَعُولٌ ہے
بمعنے مَفْعُولٌ یعنی مکتوب کے جیسے رسول ہے

---

۱ فتح الباری کتاب التفسیر تفسیر سورہ علق ۲ معالم التنزیل تفسیر سورہ علق ۳ کتاب اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن العظیم از ابن خالویہ ص ۱۴۱ ۴ تفسیر کشاف ج ۲۔ ص ۶۶ طبع بولاق مصر ۱۳۱۸ھ
۵ معالم التنزیل امام بغوی ج ۳ ص ۵۲ طبع بمبئی ۱۲۶۹ھ

زبر کی جمع ہے، ابن دُرَید لغوی نے لکھا ہے کہ اصل میں زبر کے معنی چٹان میں کندہ کرنے کو کہتے ہیں، اور اہل یمن ہر کتاب کو زبر بولتے ہیں، وہ لوگ شاخ خرما پر لکھا کرتے تھے[1] علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔

"ہر وہ کتاب جس کی کتابت گاڑھی ہو اس کو زبور کہا جاتا ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ "زبور" کتب الٰہیہ میں سے ہر وہ کتاب ہے جس پر آیت دشوار ہو ارشاد ہے وَاِنَّہٗ لَفِیۡ زُبُرِ الۡاَوَّلِیۡنَ (اور یہ لکھا ہے پہلوں کی کتابوں میں) اور فرمایا وَالزُّبُرِ وَالۡکِتٰبِ الۡمُنِیۡرِ (اور نوشتے اور چمکتی کتاب) اور اَمۡ لَکُمۡ بَرَآءَۃٌ فِی الزُّبُرِ (یا تم کو فارغ خطی لکھی گئی ورقوں میں) اور بعض کا قول ہے کہ زبور اس کتاب کا نام ہے جس میں صرف عقلی حکمتیں ہوں، احکام شرعیہ نہوں، اور کتاب اس کو کہتے ہیں جو احکام و حکم دونوں پر مشتمل ہو اور اس امر پر یہ چیز بھی دلالت کرتی ہے کہ حضرت داود علیہ السلام کی زبور میں احکام میں سے کوئی چیز نہیں ہے"

امام بغوی لکھتے ہیں

"ذلبور وہ کتاب ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو تعلیم فرمایا تھا یہ ایک سو پچاس سورتوں پر مشتمل ہے جو تمام تر دعا و تحمید و تمجید اور حق تعالیٰ کی ثنا میں ہیں ان میں حلال و حرام اور فرائض و حدود نہیں ہیں" [2]

ابن مردویہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا زبور رمضان کی بارہ تاریخ کو نازل ہوئی ہے، [3]

یہ واضح رہے کہ موجودہ زبور کے بھی ایک سو پچاس ہی حصے ہیں جن کو اصطلاحِ اہل کتاب میں مزمور کہا جاتا ہے مگر یہ وہ اصلی زبور نہیں ہے جو حضرت داود علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ بلکہ محرفین اہل کتاب نے اس کو بہت کچھ بدل ڈالا ہے چنانچہ موجودہ زبور خود اس امر کی زندہ شہادت ہے کہ یہ سب مزبور حضرت داؤد علیہ السلام کے نہیں ہیں کیونکہ ان میں اگر بعض پر حضرت داود علیہ السلام کا نام مذکور ہے تو بعض پر قورح کا جو نغمہ سراؤں کا استاد تھا اور بعض پر شوشینم کے

---

[1] جمہرۃ اللغۃ ج ۱ ص ۲۵۴ طبع دائرۃ المعارف

[2] معالم التنزیل ج ۲ ص ۱۹۶ طبع بمبئی ۱۲۶۹ھ

[3] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۲۱۶ طبع مصر ۱۳۵۶ھ

سروں پر آصف کا اور بعض پر کتبیت کا اور بعض پر کسی کا نام نہیں ہے، نیز بعض مزبوروں میں ایسے واقعات کا تذکرہ ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام سے صدیوں بعد پیش آئے ہیں لے
زَبُوْرًا آپ ۶ پ

فصل الجیم الموحدہ

زُجَاجَةٌ شیشہ، زُجَاجٌ جمع، پ ۱۸/۱۱

زَجْرًا جھڑکنا، ڈانٹنا، زجر کرنا، (نصر) زَجَرَ يَزْجُرُ کا مصدر ہے، پ ۲۳/۵

زَجْرَةٌ جھڑکی، ڈانٹ، تہدید، پ ۲۳/۵ پ ۳۰/۳

فصل الحاء المهملة

زُحْزِحَ وہ سرکا دیا گیا، وہ ہٹا دیا گیا، وہ دور کر دیا گیا، زَحْزَحَةٌ سے جس کے معنے دور کرنے کے ہیں ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے، پ ۴/۱

زَحْفًا میدان جنگ، گھمسان، لشکر کثیر (فتح) زَحَفَ يَزْحَفُ کا مصدر ہے، راغب اصفہانی لکھتے ہیں

"اصل میں زَحْفٌ کے معنی پاؤں کھینچ کر گھسٹنے کے ہیں جس طرح کہ بچہ چلنے کے قابل ہونے سے پہلے گھسٹتا ہے اور اونٹ تھک کر اپنے پاؤں گھسیٹنے لگتا ہے اور لشکر جب زیادہ ہو تو اس کا چلنا دشوار ہوتا ہے"

اور علامہ زمخشری رقم طراز ہیں

"زحف وہ انبوہ در انبوہ لشکر ہے کہ جو اپنی کثرت کی بنا پر ایسا معلوم ہونے لگے کہ گویا گھسٹ رہا ہے یہ زحف الصبی سے ہے جس کا استعمال بچہ کے سرین کے بل ذرا ذرا گھسٹنے کے لیے ہوتا ہے اور مصدر ہی اسم ہو کر مستعمل ہے زحوف جمع ہے" لے پ ۹/۱۶

فصل الخاء المعجمة

زُخْرُفٌ ملمع، سنہری، سونا، آراستہ، زینت اور کسی شئے کے کمال حسن کو زخرف کہتے ہیں، اور اسی اعتبار سے سونے کو "زخرف" کہا جاتا ہے لیکن قول کے لیے جب اس کا استعمال ہو تو جھوٹ سے آراستہ کرنے اور ملمع کی باتیں کرنے کے معنے ہوں گے، ارشاد ہے زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (ملمع کی باتیں فریب کی) پ ۸/۱

لے تفسیر کشاف ج ۱ ص ۲۹۹ طبع بولاق مصر ۱۲۸۱ھ

زُخْرُفًا پ۱۵ ع ۹ ، پ۲۵ ع ۹

زُخْرُفَهَا اس کی رونق، اس کی چمک، اس کا سنگار، زُخْرُف مضاف۔ هَا ضمیر واحد مونث غائب مضاف الیہ، پ۱۱ ع ۸

فصل الدال المهملة

زِدْ تو زیادہ کر، زِیَادَةٌ سے امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر، (ملاحظہ ہو اَزِیْدَ اور زِیَادَةٌ) پ۲۹ ع ۱۳

زِدْنٰهُمْ ہم نے ان کو بڑھایا، ہم نے ان کو زیادہ دیا، زِدْنَا زِیَادَةٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، پ۱۴ ع ۱۸، پ۱۵ ع ۱۱ و ۱۴

زِدْنِیْ مجھے زیادہ دے، مجھے بڑھتی دے، اس میں زِدْ صیغہ امر واحد مذکر حاضر ن وقایہ اور ی ضمیر واحد متکلم ہے، پ۱۶ ع ۱۵

زِدْهُ اس کو بڑھتی دے، اس کو زیادہ دے، اس میں هُ ضمیر واحد مذکر حاضر ہے، پ۲۳ ع ۱۳

فصل الزاء المعجمة

زَرَابِیُّ مخمل کے نہالچے، زِرْبٌ کی جمع ہے جو ایک قسم کا آراستہ کپڑا ہے اور ایک موضع کی طرف منسوب ہے، قرآن مجید میں اس کا استعمال بطور تشبیہ و استعارہ ہوا ہے، مجدالدین فیروز آبادی قاموس میں لکھتے ہیں

"زَرَابِیُّ قالیچے اور فرش ہیں، یا ہر وہ چیز جو بچھائی جائے اور اس پر تکیہ لگایا جائے، اس کا واحد زِرْبِیٌّ ہے، زیر کے ساتھ اور کبھی پیش بھی دیدیتے ہیں" پ۳۰ ع ۱۳

زُرَّاعٌ کاشت کار، کھیتی والے، زُرَّاعٌ کی جمع ہے جو زَرْعٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ہے جس کے معنے کسان اور کاشتکار کے ہیں، پ۲۶ ع ۱۲

زُرْتُمْ تم نے جا دیکھا، تم نے زیارت کی (نَصَرَ) زِیَارَةٌ سے جس کے معنی زیارت کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، اصل میں زَوْرٌ سینہ کے بالائی حصہ کو کہتے ہیں، اس اعتبار سے زیارت کے معنے سینہ سے کسی کے سامنے ہونے یا کسی کے سینہ کی طرف رخ کرنے کے ہوتے ہیں، پ۳۰ ع ۲۷

زَرْعٌ کھیتی، کھیتی کرنا، اُگانا، (فَتَحَ) زَرَعَ یَزْرَعُ کا مصدر ہے امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں

"زرع کے معنی اگانے کے ہیں اور اس کی حقیقت

امورِ الٰہیہ کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتی ہے امورِ بشریہ کے ذریعہ نہیں، ارشاد ہے أَفَرَءَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُۥٓ أَمْ نَحْنُ ٱلزَّٰرِعُونَ (بھلا دیکھو تو جو تم بوتے ہو کیا تم اس کو اگاتے ہو یا ہم ہیں اگانے والے) پس بونے کو ان کی طرف منسوب کیا اور اگانے کی ان سے نفی کر کے اس کو اپنی ذات کی طرف نسبت دی، اور جب بندے کی طرف اس کو نسبت دی جاتی ہے تو اس بنا پر کہ بندہ ان اسباب کو سرانجام دیتا ہے جو اگانے کا سبب ہیں، چنانچہ جب تم کسی چیز کے اگنے کا باعث ہو تو کہتے ہو، میں نے یہ اگایا۔ زرع اصل میں مصدر ہے اور مزروع یعنی کھیتی اس سے مراد لی گئی ہے جیسے ارشاد ہے نُخْرِجُ بِهِۦ زَرْعًا (ہم نکالتے ہیں اس سے کھیتی) اور فرمایا وَزُرُوعٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ (اور کھیتیاں اور عمدہ مکانات)"

پ ۲۶/۱۲، پ ۱۴/۸، پ ۱۲/۸

زَرْعًا پ ۱۵/۱۷، پ ۲۱/۱۶، پ ۲۳/۱۶

زُرْقًا نیلی چشم، کبود چشم، اَزْرَقُ کی جمع جو زُرْقَتٌ سے ہے جس کے معنے نیلگوں ہونے کے ہیں صفت مشبہ کا صیغہ ہے، جس کی آنکھ کی سیاہی نیلاہٹ یا سبزی یا زردی کی طرف مائل ہو اسے اَزْرَقُ کہا جاتا ہے، علامہ زمخشری لکھتے ہیں

"زُرْقًا کے بارے میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ کبود رنگ عرب کے نزدیک آنکھوں کے بارے میں سب سے مبغوض ترین رنگ ہے، کیونکہ رومی جو ان کے دشمن ہیں گربہ چشم ہی ہوتے ہیں، اسی لیے انہوں نے دشمن کی صفت یہ بیان کی ہے اسود الکبد اصہب السبال ازرق العین (سیاہ جگر، بھوری مونچھوں والا، کبود چشم) دوسرے یہ کہ اندھے مراد ہیں کیونکہ جس کی آنکھ کی روشنی جاتی رہتی ہے اس کی پتلی نیلی ہو جاتی ہے"[1]

زُرُوعٍ پ ۱۶/۱۴ کھیتیاں، زَرْعٌ کی جمع ہے، پ ۱۹/۱۲، پ ۲۵/۱۴

فصل العین المہملۃ

زَعَمَ اس نے دعویٰ کیا، زَعْمٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو تَزْعُمُونَ)

زَعَمْتَ پ ۲۸/۱۵ تو نے کہا، تو نے خبر دی، زَعْمٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر پ ۱۵

[1] تفسیر کشاف ادارہ ۲ طبع دار ذی مصر

زَعَمْتُمْ تم نے بتایا، تم نے سمجھا، تم نے دعویٰ کیا
زَعَمْتُمْ ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، پ ۷ ع ۱۴، پ ۱۵ ع ۶

پ ۱۵ ع ۱۸ و ۱۹، پ ۲۲ ع ۹، پ ۲۸ ع ۱۱
زَعْمِهِمْ ان کا خیال، ان کا گمان، زَعَمَ، زَعَمَ
یَزْعَمُ کا مصدر ہے جو مضاف ہے اور ھِمْ
ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ ہے۔ علامہ
احمد فیومی، المصباح المنیر میں لکھتے ہیں
"زَعَمَ میں تین لغتیں ہیں، اہل حجاز کے نزدیک زاء
کا زبر ہے، قبیلہ اسد کے نزدیک پیش ہے اور
قبیلہ قیس کے بعض افراد کے نزدیک زیر ہے،
اسی سے ہے زعمت الحنفیہ (حنفیہ نے کہا)
زعم سیبویہ (سیبویہ نے کہا) ارشاد الٰہی اَوْ
تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ (یا گرادے آسمان ہم پر
جیسا کہ کہا کرتا ہے) بھی اسی معنے میں ہے، نیز
ظن یعنی گمان کے لیے بھی بولتے ہیں، فی زعمی
کذا (میرا گمان یہ ہے) اور اعتقاد کے لیے بھی
استعمال ہوتا ہے زَعَمَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ لَّنْ
یُّبْعَثُوْا (جو لوگ کافر ہیں ان کا یہ اعتقاد ہے کہ ہرگز
اٹھائے نہ جائیں گے) ازہری نے یہ کہا ہے کہ زَعْم
بیشتر اس شے میں ہوتا ہے جس میں شک کیا جاتا ہو
اور متحقق نہ ہو اور بعض کا قول ہے کہ یہ کذب سے
کنایہ ہے اور مرزوقی کا بیان ہے کہ اس کا استعمال
اکثر اس شے کے لیے ہوتا ہے جو باطل ہو یا جس
میں شبہ ہو۔ اور ابن القوطیہ کہتے ہیں زعم زعما
کے معنے ہیں ایسی بات کہی جس کے متعلق پتہ نہیں
کہ صحیح ہے یا غلط" پ ۳

زَعِیْمٌ ذمہ دار، ضامن، کہنے والا، قائل
اول معنی کے اعتبار سے زَعَامَةٌ سے جس کے
معنے ضامن اور کفیل ہونے کے ہیں اور دوسرے
معنے کے لحاظ سے زَعَمَ سے بروزن فعیل
بمعنے اسم فاعل ہے، راغب لکھتے ہیں
"بذریعہ قول یا بسبب ریاست ضمانت دینے
کو زَعَامَةٌ کہا جاتا ہے چنانچہ متکفل اور رئیس
کو زَعِیْم بولتے ہیں، کیونکہ ان دونوں کے
قول میں مظنۂ کذب ہونے کا یقین موجود ہے
ارشاد ہے وَاَنَا بِهٖ زَعِیْمٌ (اور میں ہوں
اس کا ضامن) اور اَیُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِیْمٌ
(کون ان میں اس کا ذمہ لیتا ہے) یہ یا زَعَامَةٌ
سے بمعنے کفالت ہے، یا زعم بالقول سے بمعنی
زبان سے کہنے کے ہے"

کلبی کا بیان ہے کہ زعیم اہل یمن کی زبان
میں کفیل کو کہتے ہیں[1] مفسرین نے اس کے

---
[1] لباب التاویل از علامہ خازن بغدادی ج ۳ ص ۲۲ طبع میمنیہ مصر ۱۳۱۷ھ

معنی ضامن ہی کے بیان کیے ہیں۔ س ۱۳/۲ پ ۲۹/۴

فصل الفاء

زَفِیْرٌ چلانا، زَفَرَ یَزْفِرُ کا مصدر ہے، علامہ خازن بغدادی رقم طراز ہیں۔

"زفیر کی اصل سانس کی انتہائی آمد و شد ہے کہ پسلیاں اس سے پھولنے لگیں اور شہیق سینہ کی طرف سانس کا لوٹانا ہے یا زفیر سانس کھینچ کر اس کو سینہ سے نکالنا ہے، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں زفیر زور کی آواز ہے اور شہیق پست آواز، ضحاک و مقاتل کا بیان ہے کہ زفیر گدھے کی پہلی آواز ہے اور شہیق اس کی آخری جب کہ وہ اس کو سینہ کی طرف لوٹاتا ہے اور ابو العالیہ کہتے ہیں کہ زفیر حلق میں ہوتی ہے اور شہیق پیٹ میں"۔[1] پ ۱۲/۹ س ۱۷/۱۵ زَفِیْرًا ۱۸/۱۷

فصل القاف

زَقُّوْمٌ سینہنڈ، تھوہر، جہنم کے ایک درخت کا نام ہے جو دوزخیوں کی غذا بنے گا جب اس کو کھائیں گے گلے میں پھنسے گا ایک عذاب یہ بھی ہوگا، ابن ابی حاتم، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ سے اسی طرح ڈرتے رہو جس طرح کہ ڈرنے کا حق ہے کیونکہ اگر زقوم کا ایک قطرہ بھی دنیا کے سمندروں میں ڈال دیا جائے تو زمین پر بسنے والوں کی زندگیاں خراب کر ڈالے، پھر جس کی یہ غذا ہو اس کا تو پوچھنا ہی کیا، امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے۔[2] پ ۲۳/۶ پ ۲۵/۱۶ پ ۲۷/۱۵

فصل الکاف

زَکَرِیَّا علیہ الصلوٰۃ والسلام، انبیاء بنی اسرائیل میں مشہور عظیم المرتبت نبی گذرے ہیں، حضرت یحییٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے والد ماجد تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی والدہ ماجدہ حضرت مریم علیہا السلام

[1] لباب التاویل از علامہ خازن بغدادی ج ۲ ص ۳۴۹ و ۳۵۰
[2] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۱۱ طبع مصر ۱۳۵۶ھ

کی کفالت آپ ہی نے فرمائی تھی۔ مسند احمد بن حنبل، صحیح مسلم، اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت زکریا علیہ السلام نجار یعنی بڑھئی تھے [1] تعجب ہے کہ حاکم نے مستدرک میں اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد یہ لکھا ہے

هذا حديث صحيح على شرط مسلم ولم يخرجاه — یہ حدیث مسلم کی شرط پر صحیح ہے حالانکہ بخاری و مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا،

اور امام ذہبی نے بھی تلخیص المستدرک میں اس پر کچھ نہیں کہا [2] حالانکہ صحیح مسلم میں یہ روایت بعینہ باب فضائل زکریا صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے [3] اسی طرح حافظ ابن کثیر نے تفسیر سورہ مریم میں صحیح بخاری کے حوالہ سے اس روایت کو نقل کر ڈالا [4] حالانکہ امام بخاری نے سرے سے اس حدیث کی تخریج ہی نہیں کی ہے چنانچہ علامہ عبدالرؤف مناوی نے صاف تصریح کی ہے ولم يخرجه البخاري (اور بخاری نے اس کو روایت نہیں کیا ہے) [5]

اور حافظ بدرالدین عینی لکھتے ہیں انفرد باخراجه مسلم [6] (صرف مسلم نے اس کی روایت کی ہے)

واضح رہے کہ زکریا عجمی نام ہے اور قرات مشہورہ میں مد و قصر دونوں آئے ہیں اور ممدود ہو یا مقصور دونوں صورتوں میں غیر منصرف ہے، پ۳ ع۱۲، پ۷ ع۱۴، پ۱۶ ع۴، پ۱۷ ع۶

زکوٰۃ

ستھرائی، پاکیزگی، زکوٰۃ، تزکیہ سے اسم ہے، علامہ زمخشری تفسیر سورہ مومنون میں لکھتے ہیں۔

"زکوٰۃ ذات اور معنے دونوں کے درمیان مشترک اسم ہے پس ذات تو نصاب کی وہ مقدار ہے جس کو زکوٰۃ دہندہ فقیر کو نکال کر

---

[1] البدایہ والنہایہ ج۲ ص ۴۹ طبع مصر ۱۳۵۱ھ [2] ملاحظہ ہو المستدرک علی الصحیحین مع تلخیص المستدرک ج۲ ص ۵۹۰ طبع دائرۃ المعارف ۱۳۴۰ھ [3] صحیح مسلم ج۲ ص ۲۶۸ طبع اصح المطابع دہلی ۱۳۴۹ھ [4] ان کے الفاظ یہ ہیں وفی صحیح البخاری انہ کان نجارا یاکل من عمل یدہ فی النجارۃ (تفسیر ابن کثیر ج۳ ص ۱۱۰) [5] فیض القدیر شرح جامع الصغیر للمناوی ج۴ ص ۵۴۵ طبع مصر ۱۳۵۶ھ [6] عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری ج۷ ص ۴۳۴ طبع دار الطباعۃ العامرۃ مصر

دیتا ہے اور معنے زکوٰۃ دہندہ کا فعل ہے جس کا نام تزکیہ ہے" [1]

اور سورہ کہف کی تفسیر میں زکوٰۃ کے معنے گناہوں سے پاک صاف ہونے کے بیان کیے ہیں، [2] اور خلیفہ زمخشری علامہ ناصر بن عبد السید مطرزی، المغرب فی ترتیب المعرب میں رقم طراز ہیں

"زکوٰۃ کے معنے تزکیہ کے ہیں ارشاد ہے وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ (اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں) پھر "زکوٰۃ" مال کی اس مقدار کا نام پڑ گیا کہ جو فقیروں کے لیے نکالی جاتی ہے اور ترکیب (الفاظ) طہارت کو بتلا رہی ہے، اور بعض کا قول ہے کہ زیادتی اور نمو پر دلالت کرتی ہے اور یہی ظاہر ہے" [3]

اور امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں۔

"اصل میں زکوٰۃ وہ افزونی ہے، جو اللہ تعالےٰ کی برکت سے حاصل ہوتی ہے اور اس کا امور دنیویہ و اخرویہ کے ذریعہ اعتبار کیا جاتا ہے، چنانچہ جب کھیتی میں افزونی و برکت حاصل ہو تو کہا جاتا ہے زکا الزرع ۔ یزکو۔ ارشاد الٰہی اَيُّهَا اَزْكٰى طَعَامًا (کون سا ستھرا کھانا ہے) میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو حلال ہو اور انجام کار بدہضمی نہ پیدا کرے اور اسی سے زکوٰۃ اس شے کو کہتے ہیں جسے انسان اللہ تعالیٰ کے حق میں سے فقیروں کو نکالتا ہے اور یہ نام اس لیے ہوا کہ اس میں برکت کی امید ہوتی ہے یا اس لیے کہ نفس کا تزکیہ ہوتا ہے، یعنی خیرات و برکات سے نفس اس کا نمو ہوتا ہے یا دونوں سبب سے کیونکہ دونوں خوبیاں اس میں موجود ہیں حق تعالیٰ شانہ نے قرآن مجید میں زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ ساتھ رکھا ہے ارشاد ہے وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (اور نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو) نفس کی پاکیزگی اور طہارت کی بدولت انسان اس حیثیت میں ہوتا ہے کہ دنیا میں اوصاف حمیدہ کا مستحق ہوتا ہے اور آخرت میں اجر و ثواب کا اور اس کی صورت یہ ہے کہ انسان اس چیز کی کوشش میں لگ جائے جس میں اس کی پاکیزگی ہے تزکیہ کی نسبت کبھی تو بندہ کی طرف ہوتی ہے کیونکہ وہ اس کا اکتساب کرتا ہے جیسے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (مراد کو پہونچا جس نے اس کو درست کیا) اور کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف اس کو نسبت دی جاتی ہے کیونکہ حقیقت میں وہی اس کا فاعل ہے جیسے بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۤءُ (بلکہ اللہ پاکیزہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے) اور کبھی نبی کی طرف کیونکہ وہی لوگوں کی طرف تزکیہ کے پہنچنے میں

[1] کشاف ج ۲ ص ۶۱ طبع مصر ۱۲۸۱ھ [2] ایضاً ج ۱ ص ۹ ۔ ۳ [3] ملاحظہ ہو المغرب طبع دائرۃ المعارف ، الزای مع الکاف

واسطہ ہوتا ہے جیسے تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا الٰہ ام
کو اس کے ذریعہ پاک کرے اور تربیت دے) او یَتْلُوا
عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ (پڑھتا ہے تمہارے پاس
ہماری آیتیں اور تم کو سنوارتا ہے) اور کبھی عبادت کی
طرف کہ جو اس کا ذریعہ ہے جیسے وَحَنَانًا مِّن لَّدُنَّا وَزَكَاةً
(اور شوق دیا اپنے پاس سے اور ستھرائی)"
(ملاحظہ ہو تُزَكُّونَ) پ ۱/ ۲ و ۱۰ و ۱۳، پ ۲/ ۶، پ ۳/ ۶، پ ۵/ ۸،
پ ۶/ ۲ و ۷ و ۱۲، پ ۹/ ۹، پ ۱۰/ ۷ و ۸ و ۹ و ۱۵، پ ۱۶/ ۱ و ۴ و ۵ و ۷، پ ۱۷/ ۵ و ۱۳ و ۱۶،
پ ۱۸/ ۱ و ۱۱ و ۱۳، پ ۱۹/ ۱۶، پ ۲۱/ ۷ و ۱۰، پ ۲۲/ ۱، پ ۲۴/ ۱۵، پ ۲۸/ ۲، پ ۲۹/ ۱۴،
پ ۳۰/ ۲۲

زَكَىٰ وہ سنورا، وہ پاک ہوا، وہ درست ہوا،
(نَصَرَ) زَكَاءٌ سے جس کے معنے درست ہونے،
سنورنے اور زیادہ ہونے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد
مذکر غائب، پ ۱۸/ ۹

زَكِيًّا ستھرا، زَكَاءٌ سے بروزن فَعِيلٌ صفت
مشبہ کا صیغہ واحد مذکر ہے، یعنے گناہوں سے
پاک کے یا خیر و برکت پر پرورش پانے والے کے
أَزْكِيَاءُ جمع۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔
"زَكِيًّا یعنی مزکّی بالخلقت کہ جس کی خلقت ہی
کو سنوار دیا گیا ہو، اور یہ جیسا کہ ہم نے بتایا اعتبار
کے طریق پر ہوتا ہے کہ حق تعالےٰ اپنے کسی بندہ
کو عالم اور پاکیزہ اخلاق بنا دیں، سیکھنے اور
کوشش کرنے سے نہیں بلکہ محض توفیق الٰہی
سے جس طرح کہ تمام پیغمبروں اور رسولوں کے
ساتھ ہوتا ہے نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مزکّا
سے موسوم کرنا مستقبل میں ہونے کے اعتبار
سے ہو نہ کہ فی الحال اور معنے یہ ہوں کہ جو
مزکّی ہونے والا ہے" پ ۱۶/ ۵

زَكِيَّةً ستھری، گناہوں سے پاک صاف
زَكَاءٌ سے بروزن فَعِيلَةٌ صفت مشبہ کا
صیغہ واحد مونث ہے، پ ۱۵/ ۲۲

زَكّٰهَا اس کو سنوارا، زَكّٰى تَزْكِيَةً سے ماضی
کا صیغہ واحد مذکر غائب، هَا ضمیر واحد مونث
غائب ہے (ملاحظہ ہو تُزَكُّونَ) پ ۳۰/ ۱۶

فصل اللام

زِلْتُمْ تم الگ رہے، تم علیحدہ رہے،
زَيْلٌ سے ماضی کا جمع مذکر حاضر، مَا زِلْتُمْ
(تم برابر رہے، تم مسلسل رہے) افعال ناقصہ
میں سے ہے اس کا استعمال کسی شے کے
مسلسل اور دائمی حالت میں رہنے کے لیے
ہوتا ہے (ملاحظہ ہو تَزَالُ) پ ۲۴/ ۹

زِلْزَالًا جھڑجھڑانا، لرزا دینا، ہلا ڈالنا، زَلْزَلَ یُزَلْزِلُ کا مصدر ہے جس کے معنے ہلانے اور جھڑجھڑا دینے کے ہیں، راغب نے لکھا ہے کہ اس میں تکرار حروف تکرار معنے کو بتانے کے لیے ہے یعنی بار بار جھڑجھڑانا اور ہلا ڈالنا، پ ۲۱/۱۴

زِلْزَالَهَا اس کا بھونچال، اس کا زلزلہ، اس کا ہلا دینا، زِلْزَالٌ مصدر مضاف، هَا ضمیر واحد مونث غائب مضاف الیہ، پ ۳۰/۱۴

زُلْزِلَتْ وہ ہلائی گئی، اس کو لرزایا گیا، اس کو زلزلہ میں ڈالا گیا، زَلْزَلَةٌ اور زِلْزَالٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مونث غائب ہے، پ ۳۰/۱۴

زُلْزِلُوا وہ جھڑجھڑائے گئے، وہ زلزلے میں آگئے، وہ ہلا ڈالے گئے، زَلْزَلَةٌ اور زِلْزَالٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ ۲، پ ۲۱/۱۸

زَلْزَلَةٌ بھونچال، زلزلہ، ہلا ڈالنا، زِلْزَالٌ کی طرح یہ بھی زَلْزَلَ یُزَلْزِلُ کا مصدر ہے، پ ۱۷/۸

زُلَفَات رات کی گھڑیاں، ساعاتِ شب، ابوعبیدہ کہتے ہیں زُلَفُ اللَّیْلِ کے معنے رات کی ساعتوں کے ہیں، اس کا واحد زُلْفَةٌ ہے جس کے معنی ساعت منزلت اور قربت کے ہیں[1] پ ۱۲/۱۰

زُلْفَةً نزدیک، پاس، قریب، درجہ، منزلت، امام بغوی لکھتے ہیں، یہ اسم ہے بوصف مصدر اس میں مذکر، مونث، واحد، تثنیہ، جمع سب برابر ہیں[2] امام راغب فرماتے ہیں
"زُلْفَہ کے معنے مرتبہ اور قدم کے ہیں ارشاد الٰہی فَلَمَّا رَأَوْهُ زُلْفَةً (جب دیکھیں گے وہ پاس آلگا) کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں جب وہ مومنوں کے مرتبہ کو دیکھیں گے جس سے وہ محروم ہو گئے اور بعض کا قول ہے کہ زُلْفَہ کا استعمال عذاب کی جگہ میں اسی طرح ہے جیسے کہ بشارت وغیرہ الفاظ کا استعمال ہوتا ہے" پ ۲۹/۲

زُلْفٰی درجہ، مرتبہ، مصدر ہے، مثل قُرْبٰی کے جو زُلْفَةٌ کے معنے ہیں وہی اس کے ہیں پ ۲۲/۱۱

پ ۲۳/۱۱، ۱۲، ۱۵
زَلَقًا تیز، ایسا صاف کہ جس پر پیر پھسلنے لگے، زَلِقَ یَزْلَقُ کا مصدر ہے پ ۱۵/۵

زَلَلْتُمْ تم ڈگمگائے، تم نے لغزش کی، تم نے ٹھوکر کھائی، زَلَّ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر (ملاحظہ ہو زَلَّ) پ ۲/۹

---

۱ عمدۃ القاری ج ۸ ص ۶۷۳ ۲ معالم التنزیل ج ۴ ص ۱۶۹ طبع بمبئی

فصل المیم

زُمَرًا جتھے جتھے، گروہ در گروہ، جوق، جوق، زُمْرَۃٌ کی جمع جس کے معنے تھوڑی جماعت کے ہیں، پ ۲۴

پ ۵ **زَمْھَرِیْرًا** ٹھر، سخت ٹھنڈ، چاند، آیت شریفہ لَا یَرَوْنَ فِیْھَا شَمْسًا وَّلَا زَمْھَرِیْرًا (نہیں دیکھتے وہاں دھوپ، نہ ٹھر) کی تفسیر میں علامہ زمخشری رقم طراز ہیں۔

"یعنی جنت کی ہوا معتدل ہے نہ وہاں آفتاب کی دھوپ تمازت پہنچاتی ہے نہ سردی کی ٹھر ستاتی ہے حدیث میں ہے ھواء الجنۃ سجسج لا حرّ ولا قرّ (جنت کی ہوا خوش گوار ہے نہ گرم ہے نہ سرد) اور زمھریر کا ترجمہ ماہتاب بھی کیا گیا ہے ثعلب کا بیان ہے کہ یہ قبیلہ طے کی لغت میں ہے چنانچہ یہ شعر پیش کیا ہے

ولیلۃ ظلامھا قد اعتکر
قطعتھا والزمھریر ما زھر

(ایسی رات کہ جس کی اندھیاری چھائی ہوئی تھی اس کو میں نے قطع کیا اور چاند روشن نہ تھا) اور معنی یہ یہ ہوں گے کہ جنت تاباں و درخشاں ہے، وہاں نہ آفتاب کی حاجت ہے نہ ماہتاب کی"[1]

پ ۲۹/۱۹

فصل النون

زَنْجَبِیْلًا سونٹھ، امام سیوطی الاتقان میں جوالیقی اور ثعالبی سے ناقل ہیں کہ یہ فارسی لفظ ہے[2] اور مولوی غیاث الدین رام پوری، غیاث اللغات میں لکھتے ہیں

"زنجبیل بالفتح چشمہ است در بہشت و نام دارو یے معروف و بایں معنی معرب زنگویر است از سروری در رسالہ معربات"

علامہ ابن درید لغوی، جمہرۃ اللغۃ میں رقم طراز ہیں

"زنجبیل معرب ہے اور ایک قوم کا بیان ہے کہ زنجبیل کے معنی خمر یعنی شراب کے ہیں"[3]

امام بغوی فرماتے ہیں

"سونٹھ ان چیزوں میں سے ہے جن کو عرب گرم ہونے کے اعتبار سے پسند کرتے ہیں، اس لیے حق تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا کہ جنت میں ان کو وہ پیالے

---

[1] تفسیر کشاف ج ۴ ص ۲۹۴ طبع مصر ۱۲۸۱ھ [2] الاتقان ص ۱۹۳ طبع احمدی ۱۲۸۰ھ [3] جمہرہ ج ۳ ص ۴۰۲ طبع دائرۃ المعارف ۱۳۴۵ھ

پلائے جائیں گے جن میں جنت کی سونٹھ کی ملونی ہوگی، مقاتل کہتے ہیں یہ دنیا کی سونٹھ جیسی نہ ہوگی، ابن عباسؓ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جنت کی جس چیز کا بھی ذکر کیا اور نام لیا ہے دنیا میں اس کی مثل نہیں ہے اور کہا گیا ہے کہ "زنجبیل" جنت کا ایک چشمہ ہے جس میں سونٹھ کا مزہ پایا جائے گا، قتادہ کہتے ہیں مقربین تو خالص پییں گے اور تمام اہل جنت کے لیے اس کی ملونی ہوگی" [1]

زِنُوا پ۲۹/۱۹ تم تولو (ضرب) وَزَنَ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر (ملاحظہ ہو وَزَنَ) پ۱۵/۱۴ پ۱۹/۱۴

زِنیٰ زنا، بدکاری، زَنیٰ یَزْنِیْ کا مصدر ہے بغیر عقد شرعی کے عورت سے وطی کرنے کا نام زنا ہے، پ۱۵/۱۴

زَنِیْم بدنام، جو کسی بری علامت سے مشہور ہو، وہ شخص جو کسی قوم میں اپنے کو ملائے لیکن نہ ان کے ساتھ ہو نہ ان میں سے ہو، ابن درید نے جو لغت وعربیت کے امام ہیں جمہرۃ اللغۃ میں یہی دونوں معانی نقل کیے ہیں [2]، شاہ عبدالقادرؒ صاحبؒ نے موضح القرآن میں پہلے معنے اختیار فرمائے ہیں چنانچہ زنیم کا ترجمہ لکھتے ہیں "بدنام یعنی بدی کر کے مشہور" اور شیخ نور الحق صاحبؒ محدث دہلوی نے دوسرے، چنانچہ تیسیر القاری شرح فارسی صحیح بخاری میں رقم طراز ہیں

"زنیم بمعنی آنکہ نسبت کردہ شدہ است بقومے کہ از آنہا نباشد ماخوذ است از زنمتی الشاۃ کہ گوش بریدہ گلوئے آں را پارہ می برند و آویزاں باں می گذارند" [3]

حافظ ابن کثیرؒ نے سلف صحابہ وتابعین کے متعدد اقوال اس کی تفسیر میں نقل کرنے کے بعد ان سب کا خلاصہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

والاقوال فی ھذا کثیرۃ وترجع الی ما قلناہ وھو ان الزنیم ھو المشھور بالشر الذی یعرف بہ بین الناس غالبا	اور اس میں اقوال بہت ہیں اور سب اسی طرف لوٹتے ہیں جو ہم نے بیان کیا کہ زنیم وہ شخص ہے جو برائی میں اتنا مشہور ہو کہ اسی کے ذریعہ لوگوں میں اکثر

[1] معالم التنزیل ج ۴ ص ۱۹۶ طبع مبئی [2] ملاحظہ ہو جمہرہ ج ۳ ص ۱۹ [3] تیسیر القاری ج ۴ ص ۶۲۵ طبع علوی لکھنو ۱۳۰۵ھ

يكون دعيا ولد زنا اذان يہچانا جاے اور اکثر ایسا شخص
فهو زانا اب يتسلط نسب میں متہم اور حرام زادہ
الشيطان عليه ما ہوتا ہے کیونکہ بیشتر پر شیطان جتنا
لا يتسلط على غيره اس پر مسلط ہوتا ہے دوسرے
كما جاء فی الحدیث پر نہیں ہوتا جیسا کہ حدیث میں
لا يدخل الجنة ولد زنا آیا ہے کہ ولد الزنا جنت میں نہیں
وفی الحدیث الآخر جائے گا اور دوسری حدیث
ولد الزنا شر الثلاثة میں ہے کہ ولد الزنا تینوں میں
اذا عمل بعمل ابويه[1] برا ہے جب کہ اپنے ماں باپ
کے سے عمل کرے

امام فخر الدین رازی، تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں
"زنیم کے بارے میں متعدد اقوال ہیں
(۱) فراء کا بیان ہے کہ زنیم وہ ہے جس کے نسب میں
تہمت ہو، قوم میں ملحق ہو اور ان میں سے نہ ہو، حضرت حسان
کہتے ہیں

وانت زنیم نیط فی آل هاشم
كما نيط خلف الراكب القدح الفرد

(اور تو حرام زادہ ہے آل ہاشم کے ساتھ میں لٹکایا ہوا
جس طرح کہ سوار کے پیچھے اکیلا تیر لٹکایا گیا ہو)
اور ہر چیز میں جو زیادتی (یعنی فالتو) ہو وہ زنمہ ہے اور
زنمت الشاۃ بھی اس وقت بولتے ہیں جب کہ
بکری کے کان چیرے جائیں اور وہ لٹک کر خشک
ہو جائیں اور ایک معلق شئے کی طرح باقی رہ جائیں
حاصل یہ کہ زنیم وہ ولد الزنا ہے جو نسب میں قوم
کے ساتھ ملحق ہو اور ان میں سے ہو نہیں، ولید
قریش میں نسب کے اندر متہم تھا اور ان کی اصل
میں سے نہ تھا، اس کے باپ نے اس کی پیدائش
کے اٹھارہ سال کے بعد اس کے متعلق دعوی
کیا تھا، اور بعض کا قول ہے کہ اس کی ماں نے
زنا کیا تھا مگر مشہور نہ تھا یہاں تک کہ آیت نازل
ہوئی۔

(۲) شعبی کا قول ہے کہ زنیم وہ ہے جو برائی اور
ملامت میں اسی طرح مشہور ہو جیسے کہ بکری
اپنے زنمہ یعنی کان کے لٹکے ہوئے زائد گوشت
سے پہچانی جاتی ہے۔

(۳) عکرمہ، ابن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں
کہ زنیم ہونے کے یہ معنے ہیں کہ اس کے گلے
میں بھی زائد گوشت تھا جس سے وہ مشہور تھا اور
مقاتل نے کہا کہ اس کے کان کی جڑ میں اسی طرح تھا
جیسا کہ بکری کے کان کا کٹا ہوا گوشت لٹکا ہوتا ہے[2] ۲۹ ب ۳

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۰۵ طبع مصر ۱۳۵۶ھ
[2] تفسیر کبیر ج ۸ ص ۱۹۸ طبع خیریہ مصر ۱۳۰۸ھ

فصل الواو

زَوَال زائل ہونا، زَالَ یَزُوْلُ کا مصدر ہے
زوال کا استعمال اس شئے کے متعلق ہوتا ہے
جو پہلے سے قائم ہو. پ ۱۳/۱۹

زَوْج خاوند، بیوی، جوڑا، بھانت بھانت قسم
قسم، علامہ احمد بن علی الفیومی، المصباح المنیر میں
رقم طراز ہیں۔

"زوج وہ شکل ہے جس کی کوئی نظیر ہو جیسے کہ اصناف و
الوان یعنی مختلف قسمیں اور رنگ ہیں اور یا اس کی کوئی نقیض
ہو جیسے خشک و تر، نر و مادہ، شب و روز، شیریں و تلخ، ابن
درید کہتے ہیں زوج ہر دو کو کہتے ہیں فرد کی ضد ہے، جوہری
کا بھی ان کے اتباع میں یہی بیان ہے کہ ان دو کو جو جفت
ہوں زوجان کہا جاتا ہے اور زوج بھی، چنانچہ عندی
زوجہ نعال کہو گے تو دو جوتے مراد لوگے اور زوجان
ہوگا تو چار مراد ہوں گے، اور ابن قتیبہ کا قول ہے کہ زوج
ایک بھی ہوتا ہے اور دو بھی، ارشاد الہی مِن کُلٍّ
زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ میں زوج یہاں واحد ہی ہے،
ابو عبیدہ اور ابن فارس نے بھی یہی کہا ہے۔

اور ازہری کہتے ہیں کہ نحویوں نے دو کے "زوج"
ہونے سے انکار کیا ہے، زوج ان کے نزدیک نر ہے
اور یہی درست ہے، ابن الانباری کا بیان ہے کہ
عوام خطا کرتے ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ زوج دو
ہیں حالانکہ یہ عرب کا مذہب نہیں ہے کیونکہ وہ
مثلاً زوج حمام (کبوتر کا جوڑا) کہتے وقت زوج
کو واحد نہیں بولیں گے بلکہ کہیں گے زوجان من
حمام (کبوتر کا ایک جوڑا) زوجان من خفاف
(موزوں کا ایک جوڑا) اور پرندوں سے کسی ایک کو
زوج نہیں بولتے بلکہ نر کو فرد اور مادہ کو فردۃ کہتے
ہیں اور سجستانی کا قول ہے کہ دو کو زوج نہیں کہا
جاتا نہ پرندوں سے نہ پرندے کے علاوہ کیونکہ یہ جاہلوں کا
کلام ہے لیکن ہر دو زوجان ہیں، اور بعض نے
اس کے لیے خَلَقَ الزَّوْجَیْنِ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی
(اس نے بنایا جوڑا نر اور مادہ) سے استدلال کیا
ہے کیونکہ اگر "زوج" دو کے لیے آتا تو زوجین نہ
لایا جاتا) ہاں واحد کو زوج کے ساتھ موسوم کرنا
اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اس کے ساتھ
دوسرا اس کی جنس کا ہو"

اَزْوَاج جمع پ ۴/۱۴ پ ۱۴/۸ پ ۱۹/۵ پ ۲۱/۱۰ پ ۲۶/۱۵

زَوْجَات پ ۲/۱۴ (ملاحظہ ہو اَزْوَاج)

زَوْجَیْنِ قسم قسم وہ دو شکلیں جن میں سے ہر ایک
دوسرے کا نظیر ہو یا نقیض ہو زَوْج کا تثنیہ

بحالت رفع، پ ۲۷ ۱۳

زُوِّجَتْ اس کا جوڑ ملا دیا گیا، تَزْوِیْجٌ سے جس کے معنے ایک شئے کے دوسری شئے کے جفت وقرین کرنے اور اسی اعتبار سے مرد و عورت میں عقد کرنے کے معنے آتے ہیں ماضی مجہول کا صیغہ واحد مونث غائب آیت شریفہ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (اور جب جیوں کی جوڑ بندھیں) کی تفسیر میں امام راغب نے تین قول نقل کیے ہیں (۱) ہر گروہ کو اس کے گروہ کے ساتھ جنت یا دوزخ میں ملا دیا جائے۔ (۲) ارواح کو اجساد کے ساتھ ملا دیا جائے۔ (۳) نفوس کو اپنے اعمال کے ساتھ ملا دیا جائے۔ پ ۳۰

زَوْجُكَ تیری بیوی، تیری جورو، تیری عورت، زَوْج مضاف، كَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ، پ ۱ ۹ پ ۱۶ پ ۲۲ ۲

زَوَّجْنٰكَهَا ہم نے وہ تیرے نکاح میں دی، زَوَّجْنَا تَزْوِیْجٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم كَ ضمیر واحد مذکر حاضر، هَا ضمیر واحد مونث غائب پ ۲۲ ۲

زَوَّجْنٰهُمْ ہم نے ان کو بیاہ دیں، اس میں هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے، پ ۲۵ ۱۶ پ ۲۷ ۱۳

زَوْجَهٗ اس کی عورت، اس کی بیوی، زَوْج مضاف، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۱ ۱۲ پ ۶

زَوْجَهَا اس کا جوڑا، اس کا خاوند، زَوْج مضاف، هَا ضمیر واحد مونث غائب مضاف الیہ، پ ۴ ۱۲ پ ۹ ۱۴ پ ۲۳ ۱۵ پ ۲۸ ۱

زَوْجَیْنِ وہ دو شکلیں جن میں سے ہر ایک دوسرے کا نظیر ہو یا نقیض ہو، جوڑا، زَوْجٌ کا تثنیہ بحالت نصب وجر، آیہ شریفہ وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ (اور ہر چیز کے بنائے ہم نے جوڑے) میں بعض نے زوجین کے معنے نر اور مادہ کے لیے ہیں اور بعض نے مرکب کے اور صحیح و راجح صنفوں اور قسموں کے ہیں یعنی ہر شئے کی ہم نے دو قسمیں کی ہیں اور قسم سے مراد مقابل ہے یعنی ہر شئے میں کوئی نہ کوئی صفت ذاتی یا عرضی ایسی ہے جس سے دوسری شئے جس میں اس صفت کی ضد اور نقیض ملحوظ ہے اس کے مقابل شمار کی جاتی ہے جیسے آسمان و زمین، جوہر و عرض، گرمی و سردی، چھوٹی بڑی، خوشنما و بدنما، سفیدی و سیاہی، روشنی و تاریکی،

وغیرہ وغیرہ، پ ۱۲/۴، پ ۱۳/۷، پ ۱۶/۲، پ ۲۷/۲ و ۷، پ ۱۹/۱۸

زُوْرٌ جھوٹ، علامہ زمخشری لکھتے ہیں

"زُوْر، زَوْرٌ اور اِزْوِرَارٌ سے ہے جس کے معنی انحراف کے ہیں" [۱]

چونکہ جھوٹ حق سے منحرف ہوتا ہے، اس لیے اس کو زور کہا جاتا ہے، پ ۱۷/۱۱، پ ۱۹/۴، زُوْرًا پ ۲۸/۱، پ ۲۸/۱۲

فصل الھاء

زَھْرَةَ رونق، خوبی، تازگی، سرسبزی، زینت بہار، اصل میں کلی جب کھل جاتی ہے تو زَھْرَةٌ کہلاتی ہے اور دنیا کی بہار اور زیب و زینت کے لیے بھی اسی مناسبت سے زھرۃ بولا جاتا ہے، پ ۱۶/۱۷

زَھَقَ وہ نکل بھاگا، وہ مٹ گیا، زُھُوْقٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب۔ (ملاحظہ ہو تَزْھَقُ) پ ۱۵/۹

زَھُوْقًا نکل بھاگنے والا، مٹ جانے والا، زُھُوْقٌ سے بروزن فَعُوْلٌ بمعنے اسم فاعل صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ پ ۱۵/۹

فصل الیاء المثناۃ

زِیَادَةٌ زیادتی، بڑھتی، زیادہ ہونا، زیادہ کرنا، زَادَ یَزِیْدُ کا مصدر ہے، امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں

"زیادت کبھی تو مذموم ہوتی ہے جیسے زیادت علی الکفایت یعنی کافی سے زائد ہونا مثلاً انگلیوں کا زائد ہونا، .... اور کبھی محمود جیسے ارشادِ ربانی ہے لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَةٌ (جنھوں نے کی بھلائی ان کو ہے بھلائی اور بڑھتی) مختلف طرق سے مروی ہے کہ زیادت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے رخِ انور کی طرف نظر کرنا ہے یہ ان انعامات اور حالات کی جانب اشارہ ہے جن کا دنیا میں تصور کرنا ناممکن ہے، اور زَادَہٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (اور زیادہ کشائش دی عقل میں اور بدن میں) یعنی ان کے اہل زمانہ کو جو کچھ عطا کیا تھا اس سے زائد مقدار میں ان کو علم اور جسم میں سے عطا فرمایا، اور "زیادت مکروہ" کے سلسلہ میں ارشاد ہے مَا زَادَھُمْ اِلَّا نُفُوْرًا (اور زیادہ ہوا ان کا بدکنا) اور زِدْنٰھُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ (ان کو ہم نے بڑھائی مار پر مار) اور فَمَا تَزِیْدُوْنَنِیْ غَیْرَ تَخْسِیْرٍ (سو تم کچھ نہیں بڑھاتے میرا سوائے نقصان) اور یہ جو فرمایا

[۱] تفسیر کشاف ج ۲ ص ۴۰۵ طبع بولاق، مصر ۱۲۸۱ھ

فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا (پھر زیادہ دیا اللہ نے ان کو آزار) تو یہ وہ زیادتی ہے جس پر انسان کی سرشت بنائی گئی ہے کہ جو شخص کسی عمل کو انجام دیتا ہے خواہ خیر ہو یا شر تو اس کو انجام دہی سے قوت محسوس کرکے دم بدم بڑھتا رہتا ہے" پ۱ ب۱۱

زَيْتُوْنَ زیتون، ایک مشہور درخت کا نام ہے پ۸ پ۱۴ پ۱۸ پ۳۰ **زَيْتُوْنًا** پ۳۰ (ملاحظہ ہو تین)

زَيْتُوْنَةٍ درخت زیتون، اس میں تا وحدت کی ہے جیسے شَجَرٌ اور شَجَرَةٌ پ۱۸

زَيْتُهَا اس کا تیل، زَيْتُ مضاف، هَا ضمیر واحد مونث غائب مضاف الیہ، روغن زیتون یعنی زیتون کے تیل کو زَیْت کہتے ہیں. پ۱۸

زَيْدٌ رضی اللہ عنہ، ایک مشہور صحابی کا اسم گرامی ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی نے الاصابہ میں ان کا مفصل تذکرہ قلم بند کیا ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے،

"زید بن حارثہ بن شراحیل الکلبی.....

.........ابن سعد کا بیان ہے کہ ان کی ماں سُعدیٰ تھیں ثعلبہ بن عبد عامر کی بیٹی جو بنی معن بن طے میں سے ہے حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ ہم زید بن حارثہ کو زید بن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہی کہا کرتے تھے یہاں تک یہ آیت نازل ہوئی اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ (پکارو لے پالکوں کو ان کے باپ کا کرکر) اس کو بخاری نے روایت کیا ہے، ہشام بن محمد بن السائب الکلبی اپنے باپ نیز حمید بن مرثد الطائی وغیرہ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ زید بن حارثہ کی والدہ سعدی اپنی قوم میں ملنے آئیں، زید ان کے ساتھ تھے، زمانہ جاہلیت کی بات ہے، بنی القین بن الجسر کے سواروں نے بنی معن کے گھروں پر غارت گری کی اور زید کو اٹھا کر لے گئے، یہ اس وقت نوخیز بچہ تھے، پھر انہیں بازار عکاظ میں لے کر آئے اور فروخت ہونے کے لیے پیش کیا چنانچہ حکیم بن حزام (رضی اللہ عنہ) نے اپنی پھوپھی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے لیے چار سو درم میں انہیں خرید لیا، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تو انہوں نے انہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بخش دیا۔

ادھر جب یہ گم ہوئے تو ان کے باپ حارثہ بن شراحیل نے (ان کے فراق میں دردناک اشعار کہے جن میں) کہا

بکیت علی زید ولم ادر ما فعل

احی فیرجی ام اتی دونہ الاجل

(میں زید پر رو دیا حالانکہ مجھے معلوم نہیں اس نے کیا کیا، آیا وہ
زندہ ہے کہ اس کی آس لگائی جائے یا اس کو موت آگئی ہے)

ان ہی اشعار کے سلسلہ میں یہ بھی ہے۔

اوصی بہ عمرا و قیسا کلاھما
واوصی یزید اثم بعدھم جبل

(میں اس کے متعلق عمرو اور قیس دونوں کو وصیت کرتا ہوں
نیز یزید کو اور ان سب کے بعد جبل کو کہتا ہوں)

عمرو اور قیس سے اس کے دونوں بھائی مراد ہیں، اور یزید
زید کا ماں شریکی بھائی ہے، یہ یزید بن کعب بن شراحیل
ہے اور جبل سے ان کا بڑا بیٹا مراد ہے، راوی کہتا ہے
کہ پھر بنی کلب کے کچھ لوگ حج کرنے آئے تو انہوں نے
زید کو دیکھا، زید انہیں پہچان گئے اور انہوں نے زید کو پہچان
لیا، تب زید نے کہا کہ میرے گھر والوں کو یہ اشعار پہنچا دینا

احن الی قومی وان کنت نائیا
بانی قطین البیت عند المشاعر

(میں اپنی قوم کا مشتاق ہوں اگرچہ دور پڑا ہوا ہوں کیونکہ
میں شعائر اللہ کے پاس بیت اللہ میں مقیم ہوں)

پھر جب یہ لوگ واپس ہوئے تو انہوں نے ان کے باپ کو
اطلاع دی، اور ان کے جائے قیام کو بتلا دیا، چنانچہ حارثہ
اور ان کا بھائی کعب دونوں زر فدیہ لے کر چل پڑے اور مکہ
آکر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دریافت کیا، کسی نے
کہہ دیا آپ مسجد الحرام میں تشریف فرما ہیں، بس دونوں
آپ کے پاس حاضر ہوئے اور یوں گفتگو شروع کی،

اے ابن عبد المطلب، اے سردار قوم کے صاحبزادے
تم لوگ حرم الہی کے رہنے والے ہو مصیبت زدہ کو
چھڑاتے ہو، قیدی کو کھانا کھلاتے ہو، ہم تمہارے
پاس اپنے لڑکے کے معاملہ میں حاضر ہوئے ہیں جو
تمہارا غلام ہے لہٰذا آپ ہم پر احسان فرمائیں اور
اس کے زر فدیہ کے بارے میں جو ہم ابھی آپ کے
سامنے پیش کیے دیتے ہیں اچھا معاملہ فرمائیں، آپ
نے فرمایا وہ کون ہے کہنے لگے زید بن حارثہ
اس پر آپ نے ارشاد فرمایا یا اس کے علاوہ کوئی
اور (اچھا) اس کو بلالو اور اختیار دیدو اگر وہ تمہیں
اختیار کرے تو بغیر فدیہ دیے وہ تمہارا ہے اور
اگر اس نے مجھے اختیار کیا تو اللہ کی قسم جو مجھے اختیار
کرے میں اس پر زر فدیہ پسند کرنے والا نہیں،
انہوں نے عرض کیا آپ نے ہمارے ساتھ مزید
انصاف فرمایا، پھر حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے
زید کو بلوا کر فرمایا تم ان لوگوں کو جانتے ہو؟ انہوں نے
عرض کیا جی ہاں یہ میرے والد ہیں اور وہ میرے
چچا، تب حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا اور
میں جو ہوں تم جانتے ہی ہو اور میری صحبت کو تم

دیکھ ہی چکے ہو اب یا تو مجھے اختیار کر لو یا ان دونوں کو، زید نے عرض کیا میں آپ پر کسی کو اختیار کرنے والا نہیں ہوں، آپ میرے لیے باپ بھی ہیں اور چچا بھی، اس پر وہ دونوں بول اٹھے زید تجھ پر افسوس تو آزادی کے مقابلہ میں غلامی کو اور باپ، چچا اور خاندان کے مقابلہ میں انہیں اختیار کرتا ہے، زید نے کہا ہاں میں نے اس ذات میں وہ بات پائی ہے جس کی بنا پر میں اس پر کسی کو پسند نہیں کر سکتا، اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب یہ دیکھا تو ان کو حطیم میں لے کر آئے اور ارشاد فرمایا گواہ رہنا کہ زید میرا بیٹا ہے، یہ میرا وارث ہوگا، اور میں اس کا وارث، (یہ نبوت سے قبل کا واقعہ ہے) ان کے باپ اور چچا نے جب یہ کیفیت دیکھی تو ان کے جی راضی ہو گئے اور واپس لوٹ گئے، جب سے زید بن محمدؐ ہی کہا جاتا تھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو بھیج دیا، اور ابن اسحٰق نے بھی زید کے والد حارثہ کا ان کی طلب میں آنے کا قصہ اسی کے قریب قریب بیان کیا ہے۔

اور ابن الکلبی اپنے باپ سے وہ ابوصالح سے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کو متبنیٰ کیا تو زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے، ان کا نکاح کر دیا جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پھوپھی حضرت امیمہ بنت عبد المطلب کی صاحبزادی تھیں اور اس سے قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی باندی ام ایمن رضی اللہ عنہا سے ان کا عقد کر دیا تھا چنانچہ حضرت زید سے ام ایمن رضی اللہ عنہا کے بطن سے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے پھر جب انہوں نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دیدی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ام کلثوم بنت عقبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کر دیا، ام کلثوم کی والدہ اروی بنت کریز ہیں اور اروی کی ماں بیضا ہیں جو عبد المطلب کی صاحبزادی ہیں، چنانچہ اروی کے بطن سے زید بن زید اور رقیہ پیدا ہوئے پھر انہوں نے ام کلثوم کو طلاق دے کر درہ بنت ابی لہب بن عبد المطلب رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا، پھر ان کو بھی طلاق دیدی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی بہن ہند بنت العوام سے عقد کیا، ....

.... عبد الرزاق معمر سے وہ زہری سے روایت کرتے ہیں کہ ہمیں نہیں معلوم کوئی زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے پہلے اسلام لایا ہو عبد الرزاق کا بیان ہے کہ زہری کے علاوہ اور

کسی نے یہ ذکر نہیں کیا، حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ واقدی نے اپنی اسناد کے ساتھ سلیمان بن یسار سے اس کو جزم کے ساتھ بیان کیا ہے، نیز زائدہ کا بھی یہی قول ہے، حضرت زید بن حارثہ، بدر اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے ہیں اور غزوہ موتہ میں شہید ہوئے ہیں، یہ اس وقت امیر لشکر تھے، بعض سفروں میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کو مدینہ میں اپنا خلیفہ کیا ہے، حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت زید بن حارثہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا تھا یا رسول اللہ آپ نے میرے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے درمیان رشتہ مواخات (بھائی چارہ) قائم فرمایا ہے، اس کو ابو یعلی نے روایت کیا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کو جس سریہ میں بھی بھیجا لوگوں کا امیر بنا کر ہی بھیجا اور اگر وہ زندہ رہتے تو آپ ان کو خلیفہ بناتے، اس کو ابو بکر بن ابی شیبہ نے قوی اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے، حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں سات غزووں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا اور سات غزوات میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان ہی کو ہم پر امیر کرتے رہے، یہ بخاری کی روایت ہے واقدی نے کہا ہے کہ زید کا پہلا سریہ قردہ کی طرف ہوا پھر علی الترتیب جموم، عیص، طرف، جشمی اور ام قرفہ کی طرف پھر غزوہ موتہ پھر ان کو امیر بنایا گیا اور اسی میں شہید ہوگئے، اس وقت ان کی عمر ۵۵ سال کی تھی، قرآن مجید میں ان کے سوا بالاتفاق (صحابہ میں سے) کسی کا ذکر بھی اس کے نام کے ساتھ نہیں ہوا ہے اور اگر ثابت ہوسکے تو پھر سجل ہیں[1] محمد بن اسامہ بن زید اپنے والد سے راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا یا زید انت مولای و منی والی و احب الناس الی (اے زید تو میرا آزاد کردہ ہے مجھ سے ہے اور میری طرف سے اور مجھ کو سب لوگوں میں زیادہ محبوب ہے) اس کو ابن سعد نے اسناد حسن سے روایت کیا ہے اور امام احمدؒ کے ہاں یہ طویل روایت ہے، اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی قسم وہ امارت کے لائق ہے یعنی زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

[1] ملاحظہ ہو سجل

اور مجھے سب لوگوں میں زیادہ محبوب ہے، اس کو
بخاری نے روایت کیا ہے، اور ترمذی وغیرہ نے
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے نقل
کیا ہے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ مدینہ آئے تو
اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر
میں تشریف فرما تھے، جب انہوں نے آپ کی خدمت
میں حاضر ہو کر دروازہ پر دستک دی تو حضور علیہ
الصلوٰۃ والسلام ان کی طرف کھڑے ہو گئے تا آنکہ
انہیں گلے لگایا اور بوسہ دیا، اور حضرت عبد اللہ بن عمر
رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ
نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا اس سے زیادہ مقرر
کیا جتنا میرے لیے مقرر کیا تھا، چنانچہ میں نے ان سے
اس کے متعلق دریافت کیا تو فرمانے لگے وہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھ سے زیادہ محبوب تھے اور ان کے
والد تیرے باپ سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کو پیارے تھے، یہ صحیح روایت ہے۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ سے صحیح میں
روایت ہے جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کے
واسطے سے ان سے مروی ہے، یہ زینب بنت
جحش کے واقعہ میں ہے جس کو ان سے انس،
براء ابن عازب، ابن عباس، اور ان کے
صاحبزادے اسامہ بن زید رضی اللہ
عنہم نے روایت کیا ہے اور تابعین کی
ایک جماعت نے مرسلاً روایت کیا ہے[۵]

ب ۲۲/۲ د ۶

زَیْغ کجی، اعتدال سے ہٹنا، زَاغَ
یَزِیْغُ کا مصدر ہے، امام راغب نے
اس کے معنے اعتدال سے ہٹنے کے بیان
کیے ہیں، ب ۳/۹

زَیَّلْنَا ہم نے جدا کر دیا، ہم نے تفریق کر دی
تَزْیِیْلٌ سے جس کے معنے متفرق اور پراگندہ
کرنے کے ہیں ماضی کا صیغہ جمع متکلم، ب ۱۱/۸

زَیَّنَ اس نے سنوارا، اس نے زینت
دی، اس نے بھلا کر کے دکھلایا، تَزْیِیْنٌ
سے جس کے معنے آراستہ کرنے اور زینت
دینے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب
ب ۲/۱۱ ب ۳/۳ ب ۱۰/۲ ب ۱۴/۱۴ ب ۱۹/۱۷ ب ۲۰/۱۶

زُیِّنَ وہ سنوارا گیا، مزین کیا گیا، اچھا
دکھلایا گیا، تَزْیِیْنٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ
واحد مذکر غائب، ب ۲/۳ ب ۳/۱۰ ب ۵/۲ ب ۱۰/۱۱ ب ۱۱/۷

---

۵ ملاحظہ ہو الاصابہ فی تمییز الصحابہ ج۔ ۱ ص ۵۶۳ و ۵۶۴ طبع السعادہ مصر ۱۳۲۸ھ

پ۱۳ پ۲۲ پ۲۳ پ۲۶
زَیَّنَّا ہم نے زینت دی، ہم نے سنوارا، ہم
نے رونق دی، تزیینٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم
پ۷ پ۱۹ پ۲۳ پ۲۴ پ۲۹
زَیَّنّٰھَا ہم نے اس کو رونق دی، ہم نے اس
کو زینت دی، اس میں ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب
ہے، پ۸ پ۱۴ پ۲۶
زِیْنَتَکُمْ تمہاری زینت، تمہاری رونق،
زِیْنَۃَ مضاف، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف
الیہ، یہاں زینت سے لباس مراد ہے، پ۸
زِیْنَتِہٖ اس کی زینت، اس کی آراستگی،
زِیْنَۃَ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب
مضاف الیہ، پ۲۰
زِیْنَتِھَا اس کی رونق، اس کی آرائش، زِیْنَۃَ
مضاف، ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف
الیہ، پ۱۸ پ۲۰ پ۲۱
زِیْنَتَھُنَّ ان کا سنگار، ان کی زینت،
زِیْنَۃَ مضاف، ھُنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب
مضاف الیہ، پ۸
زَیَّنُوْا انہوں نے مزین کر دیا، انہوں نے
سنوارا، انہوں نے اچھا کر کے دکھلایا تزیینٌ

سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب۔
زَیَّنَہٗ اس نے اسے آراستہ کیا اس نے
اسے زینت دی، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر
غائب ہے، (ملاحظہ ہو زَیَّنَ) پ۲۶
زِیْنَۃٌ زینت زیبائش، آرائش
سنگار، گہنا، اسم ہے، امام راغب اصفہانی
فرماتے ہیں

"زینت حقیقی وہ ہے جو انسان کو کسی حالت
میں بھی معیوب نہ ہو، نہ دنیا میں نہ آخرت میں،
لیکن جو چیز ایک حالت میں تو انسان کو رونق
دے اور دوسری حالت میں نہ دے وہ
ایک حیثیت سے معیوب ہے۔

مختصر الفاظ میں زینت کی تین قسمیں
ہیں (۱) زینت نفسی جیسے علم اور عمدہ
عقائد (۲) زینت بدنی جیسے قوی و بلند و بالا
ہونا (۳) زینت خارجیہ جیسے مال و جاہ، آیت
کریمہ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیْ
قُلُوْبِکُمْ (اس نے محبت ڈالی تمہارے دل
میں ایمان کی اور اچھا دکھایا اس کو تمہارے
دلوں میں) زینت نفسی سے متعلق ہے، اور
مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ (کس نے منع کی ہے

رونق اللہ کی) کو زینت خارجی پر محمول کیا گیا ہے ۔
کیونکہ مروی ہے کہ ایک قوم بیت اللہ کا برہنہ طواف
کیا کرتی تھی اس آیت کے ذریعہ ان لوگوں کو منع کیا گیا
ہے اور بعض نے کہا ہے کہ نہیں بلکہ زینت مذکورہ
سے اس آیت میں کرم مراد ہے جو آیت کریمہ اِنَّ
اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (تم میں عزت اللہ
کے ہاں اسی کو بڑی ہے جس کا ادب بڑا) میں مذکور
ہے اور اسی کو شاعر نے کہا ہے ع وزینۃ المرء
حسن الادب (ادب کی خوبی انسان کی زینت
ہے) اور ارشاد الٰہی فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِہٖ فِیْ زِیْنَتِہٖ
(پھر نکلا اپنی قوم کے سامنے اپنی طیاری سے) میں
زینت دنیوی یعنی مال، اثاثہ اور جاہ مراد ہیں۔
آیات کریمات زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ
(ہم نے رونق دی ورلے آسمان کو چراغوں سے) اور
اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَۃِ نِ الْکَوَاکِبِ
(ہم نے رونق دی آسمان دنیا کو ستاروں کی زیبائش کا

اور زَیَّنّٰھَا لِلنّٰظِرِیْنَ (اس کو رونق دی دیکھنے والوں
کے لیے) میں اس زینت کی طرف بھی اشارہ ہے جو
نگاہ سے محسوس ہو رہی ہے اور عام و خاص سب
اس کو جانتے ہیں اور اس زینت معقولہ کی طرف
بھی جس کی معرفت خواص کے ساتھ ہی مخصوص ہے
یعنی ستاروں کے احکام اور ان کی رفتار،
اللہ تعالیٰ کا اشیاء کو زینت دینا کبھی
ان کے مزین کرکے ابداع فرمانے اور اسی
طرح پھر ان کے ایجاد کرنے سے ہوتا ہے، اور
لوگوں کا کسی شئے کو مزین کرنا یا تو ان کے
آراستہ کرنے سے ہوتا ہے اور یا ان کے
قول سے کہ اس کی مدح کرنے لگیں اور بڑھا
چڑھا کر اس کا ذکر کریں"
یَوْمَ الزِّیْنَۃِ کے معنے روز عید، اور جشن
کے دن کے ہیں، پ۸/۱۱ پ۱۱/۱۴ پ۱۴/۷ پ۱۵/۱۳و
پ۱۵/۱۶و۱۸ پ۱۶/۱۲و۱۳ پ۱۸/۱۴ پ۲۳/۵ پ۲۷/۱۹

بَابُ السِّین المہملۃ

س اب، ابھی، قریب، عن قریب،

علامہ سیوطی، الاتقان میں لکھتے ہیں

"سین حرف ہے جو مضارع کے ساتھ مخصوص ہے، اور اس کو استقبال کے لیے خاص کر دیتا ہے، اور مضارع کے بمنزلہ جزء کے ہے اسی لیے اس میں عمل نہیں کیا ہے۔ اہل بصرہ اس طرف گئے ہیں کہ سوف کی بہ نسبت مضارع کے ساتھ اس کی نسبت استقبال تنگ تر ہوتی ہے، اہل عربیت اس کو حرف تنفیس سے تعبیر کرتے ہیں جس کے معنے حرف توسع کے ہیں. کیونکہ یہ مضارع کو تنگ زمانہ یعنی حال سے وسیع زمانہ یعنی استقبال کی طرف پلٹ دیتا ہے اور بعض نے ذکر کیا ہے کہ کبھی استقبال کے استمرار کے لیے آتا ہے جیسے ارشاد ہے سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِیْنَ الآیہ (اب تم دیکھو گے ایک اور لوگ) اور سَیَقُوْلُ السُّفَھَآءُ الآیہ (اب کہیں گے بے وقوف) کیونکہ یہ ان کے اس کہنے کے بعد نازل ہوا ہے کہ وہ کاہے پر پھر گئے تو سین استمرار کو بتانے کے لیے آیا ہے استقبال کے لیے نہیں، ابن ہشام نے کہا ہے کہ اہل نحو اس کو نہیں جانتے بلکہ استمرار تو مضارع سے سمجھا جاتا ہے اور سین استقبال پر آتی ہے کیونکہ استمرار مستقبل ہی میں ہوتا ہے۔

ابن ہشام کہتے ہیں کہ زمخشری نے یہ خیال کیا ہے کہ سین جب کسی محبوب یا مکروہ فعل پر داخل ہوتا ہے تو یہ بتاتا ہے کہ وہ ضرور واقع ہوگا اور مجھے نہیں معلوم کہ کسی نے اس کی وجہ سمجھی ہو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فعل کے ہونے کے وعدہ کو بتاتا ہے، پس اس کا اس پر داخل ہونا جو وعدہ یا وعید کو بتائے اس کی تاکید اور اس کے معنی برقرار رہنے کا مقتضی ہے، چنانچہ زمخشری نے سورہ

بقرہ میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے چنانچہ
فَسَیَکْفِیْکَھُمُ اللّٰہُ (سو اب کفایت
ہے تیری طرف سے ان کو اللہ) میں کہا ہے
کہ "سین" کے معنے یہ ہیں کہ یہ لامحالہ ہو کر ہی
رہے گا اگرچہ کچھ وقت کی اس کی دیر ہو" اور
سورہ براۃ میں اس کی تصریح ہے چنانچہ آیت
اُولٰئِکَ سَیَرْحَمُھُمُ اللّٰہُ (وہ لوگ ان پر
رحم کرے گا اللہ) میں کہا ہے کہ "سین لامحالہ
وجود رحمت کو بتاتا ہے اور یہ وعدہ کی اسی
طرح تاکید کرتا ہے جس طرح تمہارے سَاَنْتَقِمُ
مِنْکَ (بس اب تجھ سے بدلہ لوں گا) سکنے میں
وعید کی تاکید کرتا ہے" [1]

فصل الالف

سَاءَ برا ہے (نصر) فعل ذم ہے، سَوْءٌ
سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ
ہو اَسُوْءَ) پ ۴/۱۲ پ ۵/۳ پ ۶/۱۳ پ ۷/۱۰ پ ۸/۳ پ ۹/۱۲
پ ۱۰/۸ پ ۱۴/۹ و ۱۳ پ ۱۵/۴ پ ۱۶/۱۴ پ ۱۹/۱۳ و ۱۹ پ ۲۰/۱۳ پ ۲۳/۹
پ ۲۵/۱۸ پ ۲۸/۳ و ۱۳

سَاءَتْ بری ہے سَوْءٌ سے ماضی کا صیغہ
واحد مونث غائب، پ ۱۱/۱۴ و ۱۹ پ ۱۵/۱۴ پ ۱۹/۴
پ ۲۶/۹

سٰبِحٰتِ تیرنے والیاں، سَبْحٌ سے
اسم فاعل کا صیغہ جمع مونث، سَابِحَۃٌ کی
جمع ہے (ملاحظہ ہو سَبْحٌ) پ ۳۰/۲

سٰبِغٰتٍ کشادہ زرہیں، سُبُوْغٌ سے
جس کے معنے وسیع اور فراخ ہونے کے
ہیں، اسم فاعل کا صیغہ جمع مونث، سَابِغَۃٌ
کی جمع، پوری لمبی چوڑی زرہ کے لیے سابغۃ
کا استعمال ہوتا ہے پ ۲۲/۸

سَابِقٌ آگے بڑھنے والا، سَبْقٌ سے اسم
فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو تَسْبِقُ
اور سَبْقًا) پ ۲۲/۱۶ پ ۲۳/۲

سٰبِقٰتِ آگے بڑھنے والیاں،
سَبْقٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مونث
سَابِقَۃٌ کی جمع ہے پ ۳۰/۲

سَابِقُوْا دوڑو، سبقت کرو، مُسَابَقَۃٌ
اور سِبَاقٌ سے جس کے معنے دوڑ میں
ایک دوسرے سے سبقت لے جانے
کے ہیں، امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر پ ۲۷/۱۹

[1] الاتقان فی علوم القرآن طبع احمدی دہلی ص ۲۲۸ و ۲۲۹

سٰبِقُوْنَ آگے پہنچنے والے، آگے بڑھنے والے، سَبْقٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، بحالت رفع، سَابِقٌ کی جمع، آیہ شریفہ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ (اور جو لوگ قدیم ہیں پہلے وطن چھوڑنے والے اور مدد کرنے والے) کی تفسیر میں حافظ ابن عبدالبر نے اپنی مشہور کتاب الاستیعاب فی اسماء الاصحاب میں حسب ذیل اقوال نقل کیے ہیں

(۱) ابن سیرین کہتے ہیں "سابقون اولون" وہ لوگ ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف نمازیں ادا کی ہیں، محمد بن الحنفیہ، اور سعید بن المسیب کا بھی یہی قول[1] ہے، امام مالک، یحییٰ بن سعید سے وہ سعید بن المسیب سے راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ ماہ تک بیت المقدس کی طرف نماز ادا کی پھر واقعہ بدر سے دو مہینے پہلے آپ کا رخ کعبہ کی طرف پھیر دیا گیا

(۲) محمد بن کعب قرظی اور عطا بن یسار کا قول ہے کہ یہ اہل بدر ہیں عبیدہ کہتے ہیں کہ اہل بدر کی تعداد تین سو تیرہ یا تین سو چودہ تھی

(۳) شعبی کا بیان ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے بیعت رضوان میں شرکت کی ہے، حضرت جابر بن عبداللہ، معقل بن یسار، اور عبداللہ بن اوفی رضی اللہ عنہم کا بیان ہے کہ ان کی تعداد چودہ سو تھی، یہ تینوں حضرات بھی اس بیعت میں شریک تھے اور ایک روایت میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے پندرہ سو کی تعداد منقول ہے[2] پ ۱۱ ع ۲ ش ۱۸ پ ۲۷ ۱۴

سَابِقِيْنَ آگے بڑھنے والے، سَبْقٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت نصب وجر، سَابِقٌ کی جمع پ ۲ ۱۹

سَاجِدًا سجدہ کرنے والا سُجُوْدٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، (ملاحظہ ہو اُسْجُدْ) پ ۲۳ ۱۵

سٰجِدُوْنَ سجدہ کرنے والے سُجُوْدٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت رفع، سَاجِدٌ واحد، پ ۱۱ ۳

سٰجِدِيْنَ سجدہ کرنے والے، سُجُوْدٌ سے

---

[1] حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حسن بصری، اور قتادہ سے بھی یہی نقل کیا ہے (ملاحظہ ہو ج ۲ ص ۳۸۳ طبع مصر ۱۳۵۶ھ) [2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الاستیعاب ج ۱ ص ۲ لغایت ص ۷، طبع مصر ۱۳۲۸ھ برحاشیہ الاصابہ

اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت نصب و جر،
پ۹/۴ پ۱۲/۱۱ پ۱۴/۳ پ۱۹/۱۵ پ۲۳/۱۴

سَاحَتِہِمْ ان کا میدان، ان کا صحن، سَاحَۃ
مضاف، ھِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ،
جائے فراخ کو سَاحَۃ کہتے ہیں، اور اسی لیے
ساحۃ الدار بمعنے صحن مکان ہے، پ۲۳/۹

سَاحِرٌ جادوگر، سِحْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ
واحد مذکر، یہ لفظ صرف سورہ "ذاریات" میں
الف کے ساتھ مرقوم ہے اور باقی تمام قرآن
میں بغیر الف ہے (ملاحظہ ہو سِحْرٌ) پ۹/۴ پ۱۱
پ۱۶/۱۲ پ۱۹/۷ پ۲۳/۱۰ پ۲۴/۸ پ۲۵/۱۱ پ۲۷/۲

سٰحِرٰنِ دو جادوگر، سِحْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ،
تثنیہ مذکر بحالت رفع پ۱۶/۱۲

سٰحِرُوْنَ جادو کرنے والے، سِحْرٌ سے اسم
فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت رفع سَاحِرٌ واحد پ۱۱/۱۳

سَاحِلِ کنارۂ دریا، ساحل سمندر، سَحْلٌ سے
جس کے معنے چھیلنے کے ہیں ماخوذ ہے چونکہ کنارۂ
دریا پانی کو جدا کرتا ہے، اس لیے ساحل سے
موسوم ہوا، اور بعض کا خیال ہے کہ بمعنی مفعول
ہے کیونکہ پانی اس کو چھیلتا اور کاٹتا ہے لیکن
اس کا استعمال بلفظ فاعل ہوا ہے جیسے ھَمٌّ
نَاصِبٌ بمعنے منصوب بولتے ہیں،
سَوَاحِلُ جمع، پ۱۶/۱۱

سَاخِرِیْنَ ہنسی کرنے والے، ٹھٹھا
کرنے والے، سُخْرِیَۃٌ سے جس کے معنی
استہزا اور مذاق کرنے کے ہیں اسم فاعل
کا صیغہ جمع مذکر بحالت نصب و جر، سَاخِرٌ
واحد، پ۲۴/۳

سَادَتَنَا ہمارے سردار، سَادَۃٌ
سَیِّدٌ کی جمع مضاف ہے نَا ضمیر جمع
متکلم مضاف الیہ، (ملاحظہ ہو سَیِّدًا)
پ۲۲/۵

سَادِسُهُمْ ان کا چھٹا، سَادِسُ مضاف،
هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ،
پ۱۵/۱۵ پ۲۸

سَارَ وہ چلا، سَیْرٌ سے ماضی کا صیغہ
واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو تَسِیْرُ) پ۲۰

سَارِبٌ گلیوں میں پھرنے والا، راہ میں
چلنے والا، سُرُوْبٌ سے جس کے معنے اپنے
رخ پر چلنے کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ
واحد مذکر، سَوَارِبُ جمع ہے جیسے رَکْبٌ
رَاکِبٌ کی ہے پ۱۳/۸

سَارِعُوْا جلدی کرو، دوڑو، مُسَارَعَۃٌ سے
جس کے معنے دوڑنے اور دوڑانے کے ہیں
امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، اس کا تعدیہ بذریعہ
الیٰ ہوتا ہے، ابن جنّی نے تصریح کی ہے کہ
سَارَعَ متعدی ہے اور سَرُعَ اور اَسْرَعَ
دونوں لازم ہیں اور ان دونوں میں باہم فرق
یہ ہے کہ سَرُعَ توپسندیدہ ہے اور اَسْرَعَ
کا مطلب ہے اپنی جان کو سرعت کی تکلیف
دی[1] پ ۴

سَارِقٌ چور، چوری کرنے والا، سَرِقَۃٌ
سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، (ملاحظہ ہو
سَرَقَ) پ ۶

سَارِقُوْنَ چور، چوری کرنے والے، سَرِقَۃٌ
سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، بحالت رفع،
سَارِقٌ واحد، پ ۱۳

سَارِقَۃٌ چوری کرنے والی چرانے والی
سَرِقَۃٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مونث
پ ۶

سَارِقِیْنَ چرانے والے، چوری کرنے والے
یہ اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت نصب وجر
ہے، پ ۱۳

سَاعَۃٌ گھڑی، وقت، رات یا دن کا کوئی سا
وقت ہو ساعت کہلاتا ہے، اہل عرب
اس کا استعمال وقت ہی کے معنے میں کرتے
ہیں چاہے ذرا دیر ہی کے لیے ہو، قرآن مجید
میں السَّاعۃ کا لفظ جہاں کہیں بھی استعمال
ہوا ہے اس سے قیامت مراد ہے، امام
راغب اصفہانی لکھتے ہیں

"زمانہ کے حصوں میں سے کوئی سا بھی حصہ ہو
ساعت ہے اور قیامت بھی اس سے مراد
لی جاتی ہے ارشاد ہے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ
(پاس آگئی وہ گھڑی یعنی قیامت) اور یَسْئَلُوْنَکَ
عَنِ السَّاعَۃِ (تجھ سے پوچھتے ہیں وہ گھڑی
یعنی قیامت) اور عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ
(اس کے پاس ہے قیامت کی خبر) اب یا تو
حق تعالیٰ شانہٗ کے جلد حساب لے لینے کے
سبب اس کو قیامت سے تشبیہ دی گئی
ہے چنانچہ ارشاد ہے وَھُوَ اَسْرَعُ الْحَاسِبِیْنَ
(اور وہ شتاب لیتا ہے حساب) اور یا اس
وجہ سے کہ جس پر یہ کہہ کر تنبیہ فرمایا ہے،

[1] ملاحظہ ہو تاج المصادر از امام ابو جعفر بیہقی

كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا (ایسا لگے گا جس دن اس کو دیکھیں گے کہ ان کو دیر نہ لگی مگر ایک شام یا اس کی صبح) اور يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ (اور جس دن ان کو جمع کرے گا گویا نہ رہے تھے مگر کوئی گھڑی دن) پس ساعت اولیٰ قیامت ہے اور ساعت ثانیہ زمانہ کا قلیل وقت)

اور بعض کا قول ہے کہ وہ ساعات جو قیامت کے معنے دیتی ہیں، تین ہیں، (۱) الساعۃ الکبریٰ یعنی لوگوں کا حساب دینے کے لیے اٹھنا اسی کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اشارہ فرمایا ہے لا تقوم الساعۃ حتی یظھر الفحش والتفحش وحتی یعبد الدرھم والدینار (قیامت نہیں قائم ہونے کی یہاں تک کہ فحش اور بے حیائی کھلم کھلا ہونے لگے اور یہاں تک کہ روپیہ اور اشرفی کی پوجا ہونے لگے) وغیرہ وغیرہ اور آپ نے بہت سے ان امور کا ذکر فرمایا کہ جو نہ آپ کے زمانہ میں ہوئے اور نہ آپ کے بعد، (۲) الساعۃ الوسطیٰ، اور یہ ایک قرن کے لوگوں کا مرجانا ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے عبد اللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر فرمایا ان یطل عمر ھذا الغلام لم یمت حتی تقوم الساعۃ (اگر اس لڑکے کی عمر دراز ہوئی تو یہ اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک قیامت قائم نہ ہو) چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یہ صحابہ میں سب سے آخری مرنے والے شخص ہیں۔

(۳) الساعۃ الصغریٰ اور یہ انسان کی موت ہے پس ہر انسان کی ساعت اس کی موت ہے اور اسی کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاءِ اللّٰهِ حَتّٰى اِذَا جَاءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا (خراب ہوئے جنہوں نے جھوٹ جانا ملنا اللہ کا جب تک کہ آپہنچی ان پر قیامت بے خبر کہنے لگے اے افسوس کیسا قصور کیا اس میں) اور معلوم ہے کہ یہ حسرت انسان کو اس کی موت کے وقت حاصل ہوتی ہے کیونکہ ارشاد ہے وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (اور خرچ کرو کچھ ہمارا دیا اس سے پہلے کہ پہنچے کسی کو تم میں سے موت تب کہے

اے رب کیوں نہ ڈھیل دی مجھ کو ایک تھوڑی مدت کہ میں خیرات کرتا اور ہوتا نیک لوگوں میں) اور اسی طرح یہ آیت ہے قُلْ أَرَأَيْتَكُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللَّهِ أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ (تو کہہ دیکھو تو اگر آوے تم پر عذاب اللہ کا یا آوے تم پر قیامت) اور مروی ہے کہ جب آندھی آتی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا رنگ روئے متغیر ہو جاتا اور فرماتے تخوفت الساعۃ (مجھے قیامت کا دھڑکا ہوا) نیز ارشاد ہے ما امد طرفی ولا اغضها الا و الساعۃ قد قامت (میں جب بھی نظر اٹھاتا ہوں یا نیچی کرتا ہوں تو یہ خیال کرتا ہوں کہ قیامت ہو چکی) یعنی موت آ چکی۔

پ۷ ۱۰، پ۸ ۱۱، پ۹ ۱۳، پ۱۱ ۳ و ۱۰، پ۱۳ ۶، پ۱۴ ۴ و ۱۴ و ۱۷، پ۱۵ ۱۵ و ۱۷

پ۱۶ ۸ و ۱۰، پ۱۷ ۴ و ۸ و ۱۴، پ۱۸ ۱۷، پ۲۱ ۵ و ۹ و ۱۳، پ۲۲ ۵ و ۷ و ۹

پ۲۴ ۱۰ و ۱۱، پ۲۵ ۱ و ۳ و ۱۲ و ۱۳ و ۲۰، پ۲۶ ۴ و ۶، پ۲۷ ۸ و ۱۰، پ۳۰ ۴

سَافِلَهَا اس کے نیچے، اس کے تلے، سَافِلَ سُفُوْلٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، مضاف هَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ (ملاحظہ ہو اَسْفَلَ) پ۱۲ پ۱۴ ۵

سَافِلِيْنَ نیچے ہونے والے، سُفُوْلٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت نصب و جر۔

پ۳۰ ۲

سَاقٌ پنڈلی، علامہ لغوی مجد الدین فیروز آبادی، قاموس میں رقم طراز ہیں

"ٹخنہ اور گھٹنہ کے جو درمیان ہے وہ ساق ہے سُوْقٌ، سِيْقَانٌ اور أَسْوُقٌ جمع ہواو کو ہمزہ اس لیے کیا گیا کہ ضمہ کو برداشت کر سکے اور يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ (جس دن کھولی جائے پنڈلی) کے معنے عن شدۃ کے ہیں (یعنی جس دن سختی ظاہر ہو وے) وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ (اور لپٹ گئی پنڈلی پر پنڈلی) یعنی دنیا کی آخری شدت آخرت کی پہلی شدت سے لپٹ گئی، جب معاملہ کی شدت اور اس کی ہولناکی کی خبر دینا مقصود ہوتا ہے تو ساق کا ذکر کرتے ہیں۔"

پ۲۹ ۴ و ۱۷

سَاقِطًا گرنے والا، سُقُوْطٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر (ملاحظہ ہو تَسَقَّطَ)

پ۲۷ ۴

سَاقَيْهَا اس کی دونوں پنڈلیاں، سَاقَيْ مضاف، هَا ضمیر واحد مؤنث غائب

مضاف الیہ، سَاقٍ اصل
میں سَاقَیْنِ تھا سَاقٌ کا تثنیہ
بحالت نصب وجر، اضافت کے
سبب ی ساقط ہوگئی ۱۹/۱۸

سَاکِنًا ٹھیرا ہوا، ساکن سُکُونٌ سے جس
کے معنے تھمنے اور حرکت کے بعد کسی شے کے
ٹھیر جانے کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر،
پ ۱۹/۳

سَأَلَ اس نے مانگا، سُؤَالٌ سے ماضی کا صیغہ
واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو اِسْئَلْ اور سُؤَالِ)
پ ۲۹/۲

سَالَتْ وہ بہی، وہ جاری ہوئی، (ضَرَبَ)
سَیَلَانٌ سے جس کے معنے بہنے کے ہیں ماضی
کا صیغہ واحد مؤنث غائب، پ ۱۳/۸

سَأَلْتُكَ میں نے تجھ سے پوچھا، میں نے تجھ
سے سوال کیا، سَأَلْتُ سُؤَالٌ سے ماضی کا صیغہ
واحد متکلم، کَ ضمیر واحد مذکر حاضر، پ ۱۶/۱

سَأَلْتُمْ میں نے تم سے سوال کیا، میں
نے تم سے مانگا، اس میں کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر
ہے پ ۱۱/۱۳ پ ۲۲/۱۲

سَأَلْتُمْ تم نے مانگا، تم نے سوال کیا،
سُؤَالٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر،
پ ۱/۲

سَأَلْتُمُوْهُ تم نے اس کو مانگا، تم نے
اس کا سوال کیا، اس میں واو اشباع کا
ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، پ ۱۳/۱۴

سَأَلْتُمُوْهُنَّ تم نے ان (عورتوں)
سے مانگا، تم نے ان سے سوال کیا، اس
میں واو اشباع کا اور ھُنَّ ضمیر جمع مؤنث
غائب ہے، پ ۲۲/۴

سَأَلْتَهُمْ تو نے ان سے پوچھا، تو نے
ان سے سوال کیا، سَأَلْتَ سُؤَالٌ سے
ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر، ھُمْ ضمیر جمع
مذکر غائب پ ۱۰/۱۴ پ ۲۱/۲و۱۲ پ ۲۴/۱ پ ۲۵/۷و۱۳

سَأَلَكَ اس نے تجھ سے پوچھا، اس نے
تجھ سے سوال کیا، اس میں کَ ضمیر واحد مذکر
حاضر ہے (ملاحظہ ہو سَأَلَ) پ ۲/۷

سَالِمُوْنَ چنگے، اچھے بھلے، صحیح
سالم، سَلَامَةٌ سے جس کے معنی آفات ظاہر
و باطنہ سے صحیح سالم رہنے کے ہیں، اسم
فاعل کا صیغہ جمع مذکر سَالِمٌ کی جمع
پ ۲۹/۴

سَآئِلُوْا انہوں نے مانگا، انہوں نے سوال کیا، سُؤَال سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب پ

سَأَلَهَا اس کو پوچھا، اس کا سوال کیا، اس میں هَا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے، (ملاحظہ ہو سَأَلَ) پ

سَأَلَهُمْ ان سے پوچھا، ان سے سوال کیا، اس میں هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے (ملاحظہ ہو سَأَلَ) ۲۹ پ

سَامِدُوْنَ کھیل کرنے والے، غافل ہونے والے، گانے والے، تکبر سے سر اٹھانے والے، حیرت میں کھڑے رہنے والے، سُمُوْد سے جس کے معنے کھیلنے، غافل ہونے، گانے، اور تکبر سے سر اٹھانے اور حیرت میں کھڑے رہ جانے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، سَامِدٌ واحد ابن درید نے تصریح کی ہے کہ یہ یمانی لغت[1] ہے، اور عبد الرزاق بروایت عکرمہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے معنے گانے کے نقل کرتے ہیں، عکرمہ کا بیان ہے کہ یہ اہل یمن کی زبان ہے جب یمنی تغن (توگا) کہنا چاہے گا تو اس کے لیے اُسْمُدْ بولے گا[2] اور امام بخاری اپنی صحیح میں عکرمہ سے ناقل ہیں کہ سَامِدُوْنَ کے معنی حمیری زبان میں گانے والوں کے ہیں[3]، نیز عبد الرزاق نے ایک اور طریق سے بروایت عکرمہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے معنے کھیل کرنے والوں کے اور بروایت معمر، قتادہ سے غافل ہونے والوں کے روایت کیے ہیں، اور ابن مردویہ بروایت سعید بن جبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روگردانی کرنے والوں کے معنے نقل کرتے ہیں[4]۔ ۲۷ پ

سَامِرًا کہانی والا، افسانہ گو، داستان سرا، سَمَر سے جس کے معنے رات میں قصہ گوئی کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، علامہ محمود آلوسی، روح المعانی میں رقم طراز ہیں

"سَامِرًا ابر بنائے حال منصوب ہوا اور یہ اسم جمع ہے جیسے کہ حاج، حاضر جامل اور باقر ہیں اور بعض کا قول ہے کہ یہ مصدر ہے جو بر بنائے تاویل مشہور حال واقع ہوا ہے اس لیے اپنی اصل کے

[1] جمہرۃ اللغۃ ج ۲ ص ۲۶۵ [2] فتح الباری ج ۸ ص ۶۵ طبع مصر [3] صحیح البخاری ج ۲ ص ۷۲۰ طبع مجتبائی دہلی [4] فتح الباری ج ۸

اعتبار سے قلیل و کثیر سب پر مشتمل ہے مگر مخفی
نہ رہے کہ مصدر کا فاعل کے وزن پر آنا نادر
ہے اور اسی سے عافیۃ اور عاقبۃ ہے
سمر اصل میں ظل قمر (چاند کا سایہ) کو کہتے ہیں اور
یہ جیسا کہ مطلع (کتاب کا نام ہے) میں مذکور
ہے اپنے دھندلے پن کی وجہ سے اس نام
سے موسوم ہے اور بحر میں ہے کہ درختوں
پر جو چاندنی پڑتی ہے اسے کہتے ہیں، اور راغب
کا بیان ہے کہ یہ رات کی اندھیاری ہے بعد
میں رات میں باتیں کرنے کے معنے میں اس کا
استعمال ہونے لگا، اور بعض نے سامر کی تفسیر
اندھیری رات سے کی ہے، اور یہاں اس معنے
میں اس کا ہونا اور پھر بربنائے نزع خافض اسے
منصوب قرار دینا کچھ نہیں ہے" [۱]

سامری، علامہ محمود زمخشری، کشاف
میں رقم طراز ہیں

"سامری بنی اسرائیل کے ایک قبیلہ کی طرف
منسوب ہے جس کو سامرہ کہا جاتا ہے اور
بعض کا قول ہے کہ سامرہ یہود میں ایک قوم
ہے جو بعض مذہبی چیزوں میں یہود کی مخالف ہے

اور بعض نے اس کو باجرما کا رہنے والا بتایا ہے
اور بعض کہتے ہیں کہ کرمان کا ایک دہقانی کافر
تھا، اس کا نام موسیٰ بن ظفر ہے یہ منافق تھا
اور اسلام ظاہر کرتا تھا، اس کی قوم گائے کی
پجاری تھی۔" [۲]

اور مولانا ابو الکلام آزاد لکھتے ہیں

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سامری کون تھا
یہ اس کا نام تھا یا قومیت کا لقب، قیاس
کہتا ہے کہ یہاں سامری سے مقصود سمیری
قوم کا فرد ہے، کیونکہ جس قوم کو ہم نے سمیری
کے نام سے پکارنا شروع کر دیا ہے، عربی میں
قدیم سے اس کا نام سامری چلا آرہا ہے، اور
اب بھی عراق میں ان کا بقایا اسی نام سے پکارا
جاتا ہے، یہاں قرآن کا "السامری" کہہ کے
اسے پکارنا صاف کہہ رہا ہے کہ یہ نام نہیں
ہے اس کی قومیت کی طرف اشارہ ہے یعنی
وہ شخص اسرائیلی نہ تھا، سامری تھا،
حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً
ساڑھے تین ہزار برس پہلے دجلہ و فرات
کے دو آبے میں دو مختلف قومیں آباد ہو رہی تھیں

[۱] روح المعانی ج ۱۰ ص ۵۴ طبع منیریہ مصر [۲] کشاف ج ۲ ص ۲۹ طبع بولاق مصر ۱۲۸۱ھ

اور ایک عظیم الشان تمدن کی بنیادیں اٹھا رہی تھیں، ان میں ایک قوم جو جنوب سے آئی تھی عرب تھی، دوسری جس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ شمال سے اتری سمیری تھی، اسی قوم کے نام سے تاریخ قدیم کا شہر سامرہ اور ادر آباد ہوا تھا، جس کا محل تل العبید میں دریافت ہوا ہے اور وہاں سے پانچ ہزار برس پیشتر کے بنے ہوئے زیور اور سنہری ظروف برآمد ہوئے ہیں . . . .

. . . بہر حال سمیری قبائل کا اصلی وطن عراق تھا مگر یہ دور دور تک پھیل گئے تھے، مصر کے ان سے تعلقات کا سراغ ایک ہزار سال قبل مسیح تک روشنی میں آچکا ہے پس معلوم ہوتا ہے اسی قوم کا ایک فرد حضرت موسیٰ کا بھی معتقد ہو گیا اور جب بنی اسرائیل نکلے تو یہ بھی ان کے ساتھ نکل آیا، اسی کو قرآن نے "السامری" کے لفظ سے یاد کیا ہے، گائے بیل اور بچھڑے کی تقدیس کا خیال سمیریوں میں بھی تھا اور مصریوں میں بھی [1]

پ ۱۶ / ۱۳ و ۱۴

سَاوٰی اس نے برابر کر دیا، وہ برابر ہو گیا مسا سے جس کے معنے برابر کرنے اور برابر ہونے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب،

پ ۱۶ / ۲

سَاھِرَۃِ میدان، زمین، روئے زمین، سہر سے جس کے معنے نیند اڑ جانے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث، مگر اس کا استعمال زمین اور روئے زمین کے معنے میں ہوتا ہے، امام رازی تفسیر کبیر میں رقم طراز ہیں،

" ساھرۃ سفید ہموار زمین کو کہتے ہیں، اس نام سے اس کے موسوم ہونے کی دو وجہیں ہیں (۱) اس پر چلنے والا خوف سے سوتا نہیں (۲) اس میں سراب رواں ہوتا ہے کہ یہ عرب کے محاورہ عین ساھرۃ چشمہ رواں سے ماخوذ ہے اور میرے نزدیک اس میں تیسری وجہ بھی ہے، وہ یہ کہ زمین کا ساھرۃ اس لیے نام پڑا کہ شدت خوف کے باعث اس میں انسان کی نیند اڑ جاتی ہے تو وہ زمین جس کے اندر قیامت کے موقع پر کافر جمع ہوں گے نہایت ہی خوف

[1] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۳۶۴ و ۳۶۵

ہیں ہوں گے لہٰذا اس زمین کا نام ساھرۃ اس بنا
پر ہوا

پھر ایک اور وجہ سے بھی علماء میں اختلاف
ہے، بعض کہتے ہیں کہ یہ دنیا کی زمین ہے اور
دوسروں کا بیان ہے کہ ارضِ آخرت ہے کیونکہ
لوگ زجرہ (جھڑکی) صیحہ (شور) کے وقت جوق
در جوق آخرت کی زمین پر منتقل ہوں گے، شاید یہ
وجہ زیادہ قریب ہو[1] پ ۳۰

ساھَمَ اس نے قرعہ ڈلوایا، مُسَاھَمَۃٌ سے
جس کے معنے کسی کے ساتھ قرعہ ڈالنے کے
ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ ۲۳/۹

سَاھُوْنَ بے خبر، بھولنے والے، غافل، سَھْوٌ
سے جس کے معنے غافل ہونے کے ہیں اسم فاعل
کا صیغہ جمع مذکر، سَاھُوْنَ اصل میں سَاھِیُوْنَ
تھا بر وزن فاعلون، ی مضموم ما قبل اس کا مکسور
ضمہ ی پر ثقیل ہوا نقل کر کے ما قبل کو دیا، اب
واو اور ی دو ساکن جمع ہوئے، ی کو حذف کر دیا
امام راغب لکھتے ہیں

"غفلت سے جو خطا ہو وہ سہو ہے، اس کی دو قسمیں
ہیں ایک یہ کہ انسان سے ایسی چیزیں سرزد نہ ہوں
جو اس خطا کو کھینچتی اور پیدا کرتی ہیں جیسے
دیوانہ کسی انسان کو گالی دے، دوسرے
یہ کہ اس سے ایسی چیزیں ہوئیں جو اس خطا
کو پیدا کرتی ہیں جیسے وہ شخص کہ جس نے شراب
پی اور پھر اس سے کوئی برائی بغیر اس برائی
کے ارادہ کیے ظہور میں آئی تو پہلی خطا تو اس
کو معاف ہے اور دوسری پر ماخوذ ہوگا، اور
دوسری طرح کی خطا پر حق تعالیٰ نے مذمت
فرمائی ہے ارشاد ہے فِیْ غَمْرَۃٍ سَاھُوْنَ
(غفلت میں بھول رہے ہیں) عَنْ صَلَاتِہِمْ
سَاھُوْنَ (اپنی نماز سے بے خبر ہیں")
پ ۲۶/۱۸ پ ۳۰/۳۲

سَائِبَۃٌ سائبہ، اہل جاہلیت مویشی میں سے
جو جانور بت کے نام پر آزاد کرتے اور اسے
اپنے اختیار پر چھوڑ دیتے وہ "سائبہ" تھا،
امام فخر الدین رازی، تفسیر کبیر میں رقم طراز ہیں

"سائبۃ بر وزن فاعلۃ ساب سے ہے
جو سطح زمین پر کسی چیز کے رواں ہونے کے
لیے استعمال ہوتا ہے، کہا جاتا ہے ساب
الماء (پانی رواں ہوا) سابت الحیۃ

[1] تفسیر کبیر ج ۸ ص ۳۴۳ طبع مصر ۱۳۰۹ھ

(سانپ رواں ہوا) پس جو جانور اس لیے چھوڑ دیا جائے کہ جدھر چاہے چلا جائے وہ سائبہ ہے اور یہ بمعنے مسیبۃ (رواں شدہ اسم فاعل بمعنی اسم مفعول) ہے جیسے کہ عیشۃ راضیۃ بمعنی مرضیۃ ہے، اور اس کے متعلق علماء نے متعدد صورتیں بیان کی ہیں،

(۱) ابو عبیدہ کا بیان ہے کہ کوئی شخص جب بیمار ہو جاتا یا سفر سے واپس ہوتا یا کوئی منت مانتا یا کسی نعمت کا شکرانہ ادا کرتا تو اونٹ چھوڑ دیتا جو تمام احکام میں بحیرہ کی طرح ہوتا تھا۔

(۲) فراء کا قول ہے کہ جب ناقہ دس بچے دے چکتی جو سب کے سب مادہ ہوتے تو اسے چھوڑ دیا جاتا نہ اس پر سواری کی جاتی نہ اس کا دودھ دوہا جاتا اور نہ اس کی اون کاٹی جاتی، اور نہ بجز بچہ یا مہمان کے کوئی اس کا دودھ پیتا تھا

(۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سائبۃ وہ ہے جو بتوں کے لیے لے جائی جاتی یعنی ان کے لیے چھوڑی جاتی تھی، ایک شخص اپنے مال میں سے جو چاہتا چھوڑ دیتا اور اسے لے کر پجاریوں کے پاس جو ان کے بتوں کے خادم تھے آتا تھا اور وہ مسافروں کو اس کا دودھ پلاتے تھے

(۴) سائبۃ وہ غلام ہے جو اس طرح پر آزاد کیا جاتا کہ نہ اس پر ولاء ہوگی نہ دیت اور نہ میراث [۱]

شیخ نور الحق محدث دہلوی تیسیر القاری میں فرماتے ہیں

"ابو عبیدہ گوید سائبہ از ہمہ انعام می باشد کہ نذر بتاں می کردند و می گذاشتند و بعضی گویند مخصوص بشتر ست" [۳]

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے عمرو بن عامر خزاعی کو دیکھا کہ وہ اپنی آنتیں آگ میں کھینچ رہا ہے یہ پہلا شخص ہے جس نے سوائب (سانڈنیاں) کو چھوڑا ہے [۴] [۵]

سٰٓئِحٰتٍ

روزہ دار، سیاحۃ سے جس کے معنے زمین پر چلنے کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ جمع مؤنث سَآئِحَۃٌ واحد اس اعتبار سے اس کے لغوی معنی زمین پر سیر و سیاحت کرنے

[۱] ملاحظہ ہو لفظ بحیرہ [۲] تفسیر کبیر ج ۳ ص ۵۰ و ۵۱ [۳] تیسیر القاری شرح صحیح البخاری ج ۴ ص ۲۲۵ طبع علوی لکھنو

[۵] صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۶۵ طبع مجتبائی دہلی

والیوں کے ہیں لیکن سلف کی اکثریت نے اس
کی تفسیر صائمات یعنی روزہ رکھنے والیوں سے کی
ہے حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں صحابہ میں
سے حضرت ابوہریرہ، حضرت عائشہ،
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم اور تابعین
اہل تفسیر میں سے عکرمہ، مجاہد، سعید بن جبیر
عطا محمد بن کعب قرظی، ابوعبدالرحمن سلمی، ابومالک
ابراہیم نخعی، حسن، قتادہ، ضحاک، ربیع بن انس
اور سدی وغیرہم کا یہی قول نقل کیا ہے، اور
زید بن اسلم اور ان کے صاحبزادے عبدالرحمن
نے اس کی تفسیر مہاجرات (ہجرت کرنے والیاں)
سے کی ہے، مگر پہلا قول اولیٰ ہے، [1]
علامہ زمخشری، کشاف میں سورہ "التحریم" میں
اس لفظ کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔
صائم کو سائح کہا گیا کیونکہ اس کے پاس توشہ
نہیں ہوتا۔ اس لئے جب تک کھانے کو نہ ملے
رکا رہتا ہے، پس روزہ دار کو افطار کا وقت آجانے
تک رک جانے میں اس سے تشبیہہ دی
گئی ہے" ۲۸/۱۹
سَائِحُونَ بے تعلق رہنے والے، یہ شاہ
عبدالقادر صاحب کا ترجمہ ہے، فرماتے ہیں
"بے تعلق رہنا روزہ ہے، یا ہجرت ہے یا
دل نہ لگانا دنیا کے مزوں میں" (موضح قرآن)
سَیَاحَۃٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر
سَائِحٌ واحد، علامہ خازن بغدادی لکھتے ہیں
"سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ صائم کا "سائح"
اس لئے نام پڑا کہ سیاحت کرنے والا کھانا
پینا، نکاح کرنا، سب لذتوں کو ترک کر دیتا
ہے اور ازہری کا بیان ہے کہ جو شخص عابدانہ
طریق پر زمین میں سیاحت کرتا ہے، اس کے
ساتھ توشہ نہیں رہتا اس لئے وہ کھانے سے
رکا رہتا ہے اور اسی طرح روزہ دار بھی
کھانے سے رک جاتا ہے اور بعض کا قول ہے
کہ سیاحت اصل میں زمین پر برابر چلتے رہنے
کا نام ہے جیسے کہ بہتا پانی ہوتا ہے اور
روزہ دار بھی برابر طاعت کی بجا آوری اور
امر ممنوع کے ترک میں مشغول رہتا ہے۔
عطا کہتے ہیں کہ سائحون سے مراد راہ خدا
کے غازی اور مجاہد ہیں اور اس پر وہ حدیث
دلالت کرتی ہے جو حضرت عثمان بن مظعون

[1] ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۳۹۰ طبع مصر ۱۳۵۶ھ

رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے عرض کیا
یارسول اللہ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) مجھے سیاحت
کی اجازت عطا فرمایئے تو آپ نے ارشاد
فرمایا میری امت کی سیاحت اللہ کی راہ میں
جہاد ہے، بغوی نے اس روایت کو بغیر سند
کے ذکر کیا ہے، عکرمہ نے کہا ہے کہ "سائحون"
سے طالب علم مراد ہیں کہ جو طلب علم میں ایک
شہر سے دوسرے شہر میں پھرتے رہتے ہیں،
اور بعض کا قول ہے کہ نفس کی درستگی اور اخلاق
کی خوبی میں سیاحت کو بڑا دخل ہے، کیونکہ ضرور
ہے کہ سیاحت کرنے والے کو طرح طرح کی
تکالیف اور مشقتوں سے سابقہ پڑے جن
پر صبر کرنا اسے لابدی ہے۔ دوران سیاحت
میں علماء و صلحاء سے ملاقات ہوگی اور ان سے
استفادہ کرکے ان کی برکتوں کو لے کر واپس
ہوگا، نیز قدرت الٰہی کے آثار و عجائبات نظر پڑیں
گے، اور ان پر غور کرے گا تو حق تعالیٰ کی وحدانیت
اور اس کی عظمت قدرت کی طرف رہنمائی کریں
گے" [1]

امام راغب مفردات القرآن میں تحریر کرتے
ہیں۔

"بعض نے کہا ہے کہ روزہ کی دو قسمیں ہیں ایک
حقیقی یعنی کھانے پینے اور جماع کو ترک کرنا
دوسرے حکمی یعنی جوارح کان، آنکھ، زبان وغیرہ
کی معاصی سے حفاظت کرنا، پس سائح
وہ ہے جو پہلی قسم کا روزہ نہیں بلکہ یہ روزہ
رکھے، اور بعض کا قول ہے کہ سائحون وہ
وہ ہیں جو اس آیت کے مقتضے کی تلاش میں
رہتے ہیں اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ
فَتَکُوْنَ لَھُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِھَآ
اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِھَا (کیا پھرے نہیں
ملک میں جو ان کے دل ہوتے جن سے سمجھتے
یا کان ہوتے جن سے سنتے)"

حافظ ابن کثیر نے مفسرین سلف صحابہ و تابعین
سے اس کی تفسیر میں روزہ داروں کے سے
نقل کرکے لکھا ہے کہ اس بارے میں حدیث
مرفوع بھی وارد ہوئی ہے۔ ابن جریر حضرت ابوہریرہ
رضی اللہ عنہ سے راوی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا سائحون روزہ دار ہیں
مگر یہ موقوفاً صحیح ہے۔ نیز ابن جریر نے عبید بن عمیر

[1] لباب التاویل فی معانی التنزیل ج ۲ ص ۲۶۹ طبع مصر

سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
سے سائحین کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا
وہ روزہ رکھنے والے ہیں، ابن کثیر کہتے ہیں یہ مرسل
جید ہے اور یہ معنے سب اقوال میں اصح اور زیادہ
مشہور ہیں اور ایسی روایت بھی آئی ہے جو یہ بتاتی
ہے کہ سیاحت سے مراد جہاد ہے، اس کے بعد
لکھتے ہیں، مگر سیاحت سے مراد وہ نہیں ہے جو
بعض متعبدین سمجھ بیٹھے ہیں کہ بس محض زمین میں پھر لینا
اور پہاڑ کی چوٹیوں اور کھوؤں اور جنگلوں میں تنہا بسر
کرنا سیاحت ہے کیونکہ یہ چیز بجز اس زمانہ کے جب
کہ فتنوں کا زمانہ ہو اور مذہب پامال ہو رہا ہو اور
کسی وقت مشروع نہیں ہے[1]، پ ۱۱/۳

سَائِغٌ خوش گوار، رچتا پچتا، سَوْغٌ سے جس کے
معنے آسانی کے ساتھ کھانے پینے کے حلق سے
نیچے اتر جانے کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ واحد
مذکر، پ ۲۲/۱۴ سَائِغًا پ ۱۴/۱۵

سَائِقٌ ہانکنے والا، سَوْقٌ سے جس کے معنے
ہانکنے کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر
یہاں وہ فرشتہ مراد ہے جو حشر میں کھینچ کر لائے گا

پ ۲۶/۱۶

سَائِلٌ مانگنے والا، سوال کرنے والا،
سُؤَالٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد
مذکر، آیت شریفہ سَأَلَ سَائِلٌ
بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ کی تفسیر میں ابن ابی
حاتم نے ابن زید سے یہ روایت
کی ہے کہ یہ جہنم کی ایک وادی ہے
جسے سائل کہا جاتا ہے، [2] حافظ
ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ قول ضعیف اور
مراد سے دور ہے صحیح پہلے ہی معنے
ہیں کیونکہ سیاق اسی کو بتا رہا ہے [3]
(ملاحظہ ہو اِسْتَلْ اور سُؤَال) پ ۲۹/۱۸

پ ۲۹/۷ پ ۲۰/۱۸

سَائِلِيْنَ مانگنے والے، سوال کرنے
والے، پوچھنے والے، سُؤَالٌ
سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر بحالت
نصب و جر۔ پ ۲/۶ پ ۱۲/۱۲ پ ۲۴/۱۶

فصل الباء الموحدہ

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۹۲ [2] الاتقان فی علوم القرآن از سیوطی ص ۴۰۹ طبع احمدی
[3] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۱۸ طبع مصر ۱۳۵۶ھ

"سبا" ایک قوم کا نام ہے، ان کا وطن عرب میں
تھا، یمن کی طرف (موضح القرآن) امام ابن جریر
الطبری حضرت فروہ بن مسیک غطیفی رضی اللہ عنہ
سے راوی ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یا
رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے سبا سے مطلع
فرمائیے وہ کیا ہے، آیا وہ کوئی ملک ہے، یا کوئی
عورت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہ تو
وہ کوئی ملک ہے اور نہ کوئی عورت بلکہ ایک
شخص ہے جس کے دس اولادیں ہوئیں چھ
نے یمن کی سمت کو اختیار کیا، اور چار نے شام
کو، جو لوگ بجانب شام ہیں وہ لخم، جذام، عاملہ
اور غسان ہیں، اور جنہوں نے یمن کی سمت کو
اختیار کیا وہ کندہ، اشعریین، ازد، مذحج، حمیر
اور انمار ہیں، تب اس شخص نے دریافت کیا انمار
کون ہیں آپ نے فرمایا وہ لوگ جن میں خثعم اور
بجیلہ ہیں، امام ترمذیؒ نے بھی اس حدیث کو اپنی
جامع میں اس سے زیادہ بسط کے ساتھ روایت
کیا ہے اور اس کو حسن غریب بتایا ہے[1]، زجاج
کہتے ہیں کہ سبا وہ شہر ہے جو مارب کے نام سے
مشہور ہے یہ صنعاء سے تین شب کی مسافت
پر ہے[2]، یاقوت حموی لکھتے ہیں کہ یہ سرزمین
اس نام سے اس لئے موسوم ہوئی کہ یہی
اولاد سبا بن یشجب بن یعرب بن قحطان کی
سکونت گاہ تھی، یاقوت نے اس کا طول البلد
۶۳ درجہ اور عرض البلد ۱۷ درجہ بیان کیا ہے
اور کہا ہے کہ یہ اقلیم اول میں ہے[3] ابن درید
نے کتاب الاشتقاق میں لکھا ہے کہ سبا
ابن یشجب بن یعرب کا لقب ہے اس کا نام
عبد شمس ہے، یہ لفظ یمن کے تمام قبائل کو
جامع ہے[4]، مولانا سید سلیمان ندوی، ارض
القرآن میں لکھتے ہیں۔
"توراۃ میں شبا ایک جد قبیلہ کا نام ہے عرب
روایت کے مطابق اس جد قبیلہ کا نام عمر یا
عبد شمس اور لقب سبا تھا، محققین جدید کی
زیادہ تر اس کو لقب خیال کرتے ہیں لغویوں
کی رائے ہے کہ یہ "سبی" سے مشتق ہے جس کے
معنے غلام بنانے کے ہیں، چونکہ عبد شمس بہت
بڑا فاتح تھا، اور اس نے بہت سے لوگوں کو

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۵۳۱ طبع مصر ۱۳۵۶ھ [2] تاج العروس [3] معجم البلدان ج ۵ ص ۴۲ طبع مصر ۱۳۲۴ھ [4] تاج العروس

گرفتار کرکے غلام بنایا، اس لیے اس کا لقب سبا
قرار دیا گیا۔ تحقیق جدید یہ ہے کہ "سبی" اور "سبا"
اس معنے سے ماخوذ ہے جس کا مفہوم تجارت ہے،
کتبات میں عموماً "سبا" کا مادہ تجارتی سفر کے
معنے میں مستعمل ہوا ہے۔ عربی زبان میں یہ اب تک
شراب کی تجارت اور خرید و فروخت اور اس کے
سفر کے معنے میں مستعمل ہے۔ سبا چونکہ تاجر قوم تھی
اس لیے اس لقب سے مشہور ہوئی"[1]

پ ۱۹ ۲۲ ۱۷ ۸

سُبَاتًا آرام، راحت، تکان کا دفع کرنا، اصل میں
اس کے معنے راحت کے ہیں اسی سے سَبَتَ
یَسْبُتُ (نَصَرَ) بضم مضارع آتا ہے، آیت
شریفہ وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا (اور بنایا نیند
کو تمہاری تکان دفع کرنے کے لیے) میں ابن الاعرابی
نے سُبَات کو بمعنی قطع کرنے کے لیا ہے، اور
سبت کے معنے قطع کرنے کے ہیں، گویا جب
سو گیا لوگوں سے منقطع ہو گیا۔ زجاج کہتے ہیں
"سبات" یہ ہے کہ حرکت سے منقطع ہو جائے
اور روح بدن میں موجود ہو پس معنی یہ ہیں "ہم نے
تمہاری نیند کو تمہارے لیئے راحت بنایا"[2]
راغب لکھتے ہیں "سبات بمعنی قطع عمل ہے یہ
رات کی اس صفت کی طرف اشارہ ہے جس کا
آیت لِتَسْكُنُوا فِيهِ (تاکہ اس میں چین پکڑو)
میں بیان ہے" پ ۱۹ ۳ ۳۰ ۱

سَبَبٌ رسی، سامان، ذریعہ، ابو عبیدہ کہتے
ہیں ہر وہ رسی جو اوپر سے ڈالی جائے "سبب"
ہے، خالد بن جنبہ کا بیان ہے کہ جو مضبوط
اور لمبی رسی ہو وہ "سبب" ہے اور جب تک اس
کے ذریعہ اترا چڑھا نہ جائے سبب نہیں کہلاتی
اور بعض کا قول ہے کہ اس وقت تک "سبب"
سے موسوم نہیں ہوتی جب تک کہ وہ ایک طرف
سے چھت یا اسی قسم کے کسی مقام میں لٹکی ہوئی
نہ ہو۔[3] (ملاحظہ ہو سَبَاب) پ ۱۹

سَبَبًا پ ۱۶ ۲

سَبْتٌ کام کاج سے قطع تعلق کر لینا، سنیچر کی
تعظیم کرنا، سنیچر کا دن، یوم شنبہ، اول معنی کے
اعتبار سے مصدر ہے اور دوسرے معنی کے
اعتبار سے اسم جس کی جمع اَسْبُتٌ اور سُبُوتٌ

---

[1] ارض القرآن ج۔ ۱ ص ۲۳۶ و ۲۳۷ طبع معارف اعظم گڑھ ۱۳۴۳ھ
[2] تاج العروس [3] ایضاً

آتی ہے، علامہ زمخشری نے پہلے معنے اختیار کئے ہیں اور علامہ ابوحیان اندلسی نے دوسرے
چنانچہ زمخشری، کشاف میں لکھتے ہیں
"سبت مصدر ہے، سبتت الیہود کے معنی ہیں یہود نے شنبہ کے دن کی تعظیم کی" [1]
اور ابوحیان، البحر المحیط میں فرماتے ہیں
"السبت یوم معلوم (روز شنبہ) کا نام ہے اور یہ سَبْتٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنے قطع کرنے کے ہیں اور یا سبات سے ہے جس کے معنی آسائش وراحت کے ہیں اور ابوالفرج بن الجوزی نے کہا ہے کہ یہ خطا ہے کلام عرب میں سَبَتَ بمعنی اِسْتَرَاحَ کے معروف نہیں . . . . ابن جریج کا بیان ہے کہ "یوم السبت" اس لئے نام پڑا کہ وہ زمانہ کا ایک قطعہ (ٹکڑا) ہے" [2]
علامہ مرتضیٰ زبیدی لغوی، تاج العروس شرح قاموس میں رقم طراز ہیں
"السبت ہفتہ کا ایک مشہور دن ہے اور وہ ہفتہ کا ساتواں روز ہے اور سبت اس کا اس لئے نام پڑا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دن میں پیدائش کی ابتداء فرمائی - اور زمین کی پیدائش کے ایک حصہ کو اسی دن میں قطع یعنی تمام کیا، اور کہا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کو اس دن کام کاج کے قطع کرنے اور چھوڑ دینے کا حکم تھا اور محکم میں ہے کہ سبت اس لئے نام رکھا گیا کہ پیدائش کی ابتداء ایک شنبہ کے دن سے ہوئی تھی جو جمعہ کے دن تک جاری رہی اور شنبہ کو کسی چیز کی پیدائش عمل میں نہیں آئی - اہل لغت نے کہا ہے ہذا "یوم السبت" منسبتۃ ہوا - یعنی تمام شدہ بایں طور کہ اس دن میں عمل منقطع ہو گیا" [3]

علامہ موصوف نے سبت کی وجہ تسمیہ کے سلسلہ میں تین توجیہیں ذکر فرمائیں جن میں پہلی تو یقیناً بودی ہے کیونکہ اولاً تو اس میں اختلاف ہے کہ ہفتہ کے دن کسی چیز کی پیدائش عمل میں کبھی آئی یا نہیں اور برتقدیر صحت ہفتہ ہی کو سبت سے موسوم کرنا کیا معنی جبکہ بقیہ چھ دنوں میں سے ہر ایک دن میں کسی نہ کسی شے کی تخلیق تکمیل کو پہنچی ہے البتہ دوسری توجیہ قابل قبول ہے لیکن

[1] تفسیر کشاف ج ۱ ص ۱۰۹ طبع مصر [2] البحر المحیط ج ۱ ص ۲۴۰ طبع سعادت مصر ۱۳۲۸ھ اردو میں اسی لئے اسی ہفتہ کہا جاتا ہے [3] تاج العروس من جواہر القاموس ج ۱ ص ۵۷۸ طبع خیریہ مصر ۱۳۰۶ھ مادہ سبت

اصل میں سبت کی وجہ تسمیہ وہی ہے جو علامہ
موصوف نے امام اللغۃ ابن سیدہ کی کتاب
المحکم سے نقل کی ہے ائمہ لغت کی تصریحات
اسی کی تائید میں ہیں ابو عبیدہ کہتے ہیں
انما سمی سبتا سبت اس لئے نام رکھا
لانہ سبت فیہ گیا کہ اس میں ہر شے کی
خلق کل شئ و پیدائش کا کام قطع ہو گیا
عملہ[1]

امام راغب مفردات میں لکھتے ہیں
"حق تعالیٰ نے زمین و آسمان کی پیدائش کی
ابتداء یوم الاحد یعنی یک شنبہ کے دن سے فرمائی اور
جیسا کہ ارشاد ہے چھ دن میں ان کو خلق فرما کر شنبہ کو اپنا
کام ختم فرما دیا لہذا اس دن کا نام یوم السبت پڑ گیا

جوہری کا بیان ہے
وسمی یوم السبت چونکہ دن اس پر ختم
لانقطاع الایام ہو جاتے ہیں اس لئے اس کا
عنہ[2] نام یوم السبت قرار دیا گیا

غرض آفرینش عالم کی ابتداء چونکہ اتوار کے دن سے
عمل میں آئی ہے اس سے وہ عالم کا پہلا دن یعنی
یوم الاحد قرار پایا اور ہفتہ کے دن چونکہ پیدائش کا کام
منقطع ہو گیا اس لیے انقطاع کے دن یعنی یوم
السبت سے موسوم ہوا یہود و نصاریٰ دونوں
فرقوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ہفتہ کے
ایک دن کو عید قرار دیا یہود نے سنیچر کو پسند کیا
اور نصاریٰ نے اتوار کو اور حق تعالیٰ نے
مسلمانوں کے لیے یوم جمعہ کو مشروع فرمایا
صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے
روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا ہم پچھلے ہیں قیامت کے اگلے اس کتاب
ان یہود و نصاریٰ کو پہلے مل گئی اور یہ یعنی جمعہ
ان کا دن ہے جو ان پر مقرر کیا گیا تھا تو انہوں نے
اس میں اختلاف کیا اور اللہ نے ہمیں اس کی
طرف رہنمائی فرمائی اب لوگ اس میں ہمارے
پیچھے ہیں یہودی کل اور نصاریٰ پرسوں[3] اور
صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ اور حضرت حذیفہ
رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جمعہ سے اللہ نے
اگلوں کو بے خبر رکھا، یہودیوں کے لیے تو سنیچر

[1] تاج العروس [2] ایضاً
[3] صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۲۰ طبع مصطفائی ۱۳۰۷ھ صحیح مسلم ج ۶ ص ۱۴۳ طبع مصر ۱۳۳۴ھ

ہوا اور نصاریٰ انہوں کے لیے اتوار اور اللہ ہمیں لایا تو
ہمیں جمعہ کے دن کی ہدایت فرمائی اور جمعہ سنیچر
اور اتوار مقرر ہوئے اسی طرح وہ لوگ قیامت
کے دن ہمارے پیچھے ہوں گے ہم دنیا والوں میں
آخری ہیں اور قیامت کے دن اول کہ خلائق سے
پہلے ہمارا ہی فیصلہ ہوگا [1]

امام رازی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں
اگر کوئی شخص سوال کرے کہ کیا عقل میں کوئی ایسی
وجہ ہے جو اس بات کی مقتضی ہو کہ جمعہ کا دن ہفتہ کے دن
سے افضل ہے کیونکہ اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ
حق تعالیٰ نے چھ روز میں عالم کی تخلیق فرمائی یکشنبہ
سے پیدائش کی ابتداء فرمائی اور جمعہ کے
دن ہی تکمیل ہوگئی سنیچر کا دن فراغت کا دن ہوا،
یہود تو یہ کہتے ہیں کہ ہم ترک اعمال میں اللہ تعالیٰ
کی موافقت کرتے ہیں بدیں وجہ انہوں نے سبت
کو معین کیا ہے اور نصاریٰ یہ کہتے ہیں کہ خلق و
تکوین کی ابتداء یکشنبہ سے ہوئی ہے اس لیے
ہم اس دن کو عید قرار دیتے ہیں لہذا یہ دونوں
دن تو معقول ہیں پھر جمعہ کو ہمارے لیے عید مقرر
کرنے کی کیا وجہ ہے
تو ہم کہیں گے کہ جمعہ کا دن کامل ہونے اور
تمام ہونے کا دن ہے اور تمام و کمال کا حاصل ہونا
فرحِ کامل اور سرورِ عظیم کا موجب ہے لہذا اس بنا
پر جمعہ کے دن کو عید قرار دینا اولیٰ ہے۔ واللہ اعلم [2]

واضح رہے کہ اس امر میں علماء کا اختلاف
ہے کہ آفرینشِ عالم کی ابتدا کس دن میں عمل میں آئی
بعض شنبہ بتاتے ہیں اور بعض یکشنبہ، اور
اس کی وجہ اختلافِ روایات ہے، حافظ ابن
کثیر البدایہ والنہایہ میں فرماتے ہیں
"ابن جریر نے اول ایام کے بارے میں تین اقوال
نقل کیے ہیں، اور محمد بن اسحٰق سے ان کا بیان
روایت کیا ہے کہ" اہلِ تورات کہتے ہیں اللہ
نے آفرینش کی ابتدا یکشنبہ کو فرمائی اور
اہلِ انجیل کہتے ہیں دوشنبہ کو اللہ نے تخلیق شروع
کی اور ہم مسلمان جیسا کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم سے پہنچا ہے یوں کہتے ہیں کہ اللہ نے
شنبہ کو پیدائش کا آغاز فرمایا"

اور یہ قول جس کی ابن اسحٰق نے مسلمانوں سے

---

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۲۰ طبع مصطفائی ۱۳۰۷ھ، صحیح مسلم ج ۶ ص ۱۴۲ طبع مصر ۱۳۳۴ھ
[2] تفسیر کبیر ج ۵ ص ۳۶۳

حکایت کی ہے فقہاء شافعیہ وغیرہم کی ایک جماعت اسی طرف مائل ہے اور ابھی اس بارے میں ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) کی حدیث خلق اللّٰہ التربة یوم السبت (اللہ نے مٹی کو شنبہ کے دن پیدا فرمایا) آنے والی ہے،

اور یکشنبہ کے قول کو ابن جریر نے بروایت سُدی، ابو مالک (رضی اللہ عنہ) اور بروایت ابی صالح، ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے اور بروایت مرہ ابن مسعود (رضی اللہ عنہ) اور صحابہ کی ایک جماعت نیز عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے اور اسی کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے اور یہی تورات کی تصریح ہے اور اسی کی طرف فقہاء کا دوسرا گروہ مائل ہے اور یہی لفظ احد سے زیادہ مشابہ ہے اور اسی بناء پر جمعہ دن میں پیدائش کی تکمیل ہوئی اور جمعہ ان کا آخری دن ہوا اور مسلمانوں نے ہفتہ میں اسے اپنے لئے عید قرار دیا" [1]

حدیث مذکور جس کی طرف حافظ ابن کثیر نے اشارہ کیا ہے مسند احمد بن حنبل، صحیح مسلم اور نسائی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا اللہ نے مٹی کو شنبہ کے دن پیدا فرمایا اور پہاڑوں کو یکشنبہ کے دن اور درختوں کو دوشنبہ کے دن اور مکروہ یعنی ناپسند امور کو سہ شنبہ کے دن اور نور کو چہار شنبہ کے دن خلق فرمایا اور پنجشنبہ کے دن جانوروں کو منتشر فرمایا اور روز جمعہ بعد عصر حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا جو آخری مخلوق ہیں اور جمعہ کی آخری ساعت میں عصر سے لے کر رات کے درمیان ان کی تخلیق عمل میں لائی گئی ہے، یہ روایت ان تینوں کتابوں میں بروایت ابن جریج بایں اسناد مروی ہے ابن جریج اخبرنی اسماعیل بن امیة عن ایوب بن خالد عن عبد اللہ بن رافع مولی ام سلمة عن ابی هريرة نیز امام نسائی نے تفسیر میں بروایت ابن جریج عن عطاء بن ابی رباح عن ابی ہریرہ روایت کیا ہے [2]، حافظ ابن کثیر اس روایت کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

" ابن جریج پر اس حدیث میں اختلاف ہے علی بن المدینی، بخاری اور بیہقی وغیرہ حفاظ نے

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۵ طبع مصر مطبع کردستان العلمیہ ۱۳۴۸ھ [2] ایضاً ج ۱ ص ۱۷

اس حدیث میں کلام کیا ہے، بخاری نے تاریخ میں
کہا ہے کہ بعض نے اس کو کعب سے بیان کیا ہے
اور یہی زیادہ صحیح ہے، یعنی یہ حدیث ان روایتوں
میں سے ہے جس کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ
نے کعب سے سنا اور ان سے لیا ہے، کیونکہ
وہ دونوں حدیث کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ
رہتے اور اٹھتے بیٹھتے تھے، یہ تو انہیں اپنے
صحیفوں سے بتاتے اور وہ انہیں نبی علیہ الصلوٰۃ
والسلام سے وہ باتیں نقل کرتے جو اس کی تصدیق
میں ہوتیں، پس یہ حدیث وہ ہے جس کو حضرت
ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کعب سے ان کے
صحیفوں سے لی ہے، پھر کسی راوی کو وہم ہوا
اور اس نے اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک
مرفوع کر دیا اور یہ کہہ کر کہ "رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا" اس کے رفع کی اور
تاکید کر دی۔

نیز اس کے متن میں سخت غرابت ہے،
من جملہ اس کے یہ کہ اس میں آسمانوں کے پیدا
کرنے کا ذکر تک نہیں اور زمین اور زمین میں جو
کچھ ہے سات روز میں اس کے پیدا ہونے کو
بیان کیا ہے، اور یہ قرآن مجید کے خلاف ہے
کیونکہ زمین چار دن میں پیدا ہوئی ہے پھر دو دن
میں آسمانوں کو دھوئیں سے پیدا کیا گیا"۔ [1]

اور دوسرے قول یعنی یک شنبہ کو آغاز آفرینش ہونے
کے بارے میں وہ حدیث ہے جو مستدرک حاکم
میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی
ہے کہ یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
خدمت میں آکر آسمانوں اور زمین کی پیدائش
کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ
نے زمین کو یک شنبہ اور دوشنبہ کے دن پیدا
فرمایا اور پہاڑوں کو نیز ان منافع کو جو پہاڑوں
میں ہیں سہ شنبہ کے روز بنایا اور درخت،
پانی، شہر، آبادی اور ویرانہ کی چہار شنبہ کے روز
تخلیق فرمائی، یہ چار روز ہوئے، ارشاد عز وجل ہے

قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ
الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ
أَندَادًا ذَٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝
وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَ
بَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا
فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ ۝

---

[1] ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۷

(تو کہہ کیا تم منکر ہو اس سے جس نے بنائی زمین دو دن میں اور برابر کرتے ہو اس کے ساتھ اوروں کو، وہ رب ہے جہان کا، اور رکھے اس میں بھاری پہاڑ، اوپر سے، اور برکت رکھی اس کے اندر، اور ٹھیرائیں اس میں خوراکیں اس کی چار دن میں، پورا ہوا پوچھنے والوں کو) اور پنج شنبہ کے دن آسمان پیدا کیا اور جمعہ کے دن ستارے آفتاب و ماہتاب اور فرشتے پیدا فرمائے اب تین ساعتیں جمعہ کی باقی رہی تھیں کہ ان تین ساعتوں میں سے پہلی ساعت میں اجلیں پیدا فرمائیں کہ وقت پر مرتا ہے، جسے موت آئی اور دوسری ساعت میں ہر اس شئے پر کہ جس سے لوگ منتفع ہوتے ہیں آفت ڈالی، اور تیسری میں حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرماکر انہیں جنت میں بسایا اور ابلیس کو انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا اور آخری ساعت میں وہاں سے ان کا اخراج کر دیا، یہود نے کہا پھر کیا ہوا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ نے فرمایا پھر وہ عرش پر قائم ہوا یہود لے اگر

پوری بات کہتے تو ٹھیک تھا، کہنے لگے پھر اس نے آرام لیا اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت غصہ آیا اور یہ آیت نازل ہوئی

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۝ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ

(اور ہم نے بنائے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے چھ دن میں اور ہم کو نہ ہوا کچھ تکان، سو تو سہتا رہ جو کچھ وہ کہتے ہیں)

حاکم نے لکھا ہے کہ

هذا صحيح الاسناد ولم يخرجاه[1]	یہ حدیث صحیح الاسناد ہے مگر بخاری و مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا۔

مگر حاکم کی تصحیح میں اہل فن کو کلام ہے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں اس حدیث میں غرابت ہے[2] اس حدیث کا ایک راوی ابو سعید بقال ہے اس کے متعلق حافظ ذہبی تلخیص المستدرک میں

[1] مستدرک حاکم ج ۲ ص ۵۴۳ طبع دائرۃ المعارف اور صحیح ہے کہ اس حدیث کو حاکم کے علاوہ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اور نحاس نے ناسخ و منسوخ میں اور ابو الشیخ نے کتاب العظمۃ میں اور ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں اور بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں روایت کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو الدر المنثور فی التفسیر بالماثور از سیوطی ج ۵ ص ۳۶۰) [2] تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۹۴

از تابعین سے جو فنِ جرح و تعدیل کے امام ہیں
ناقل ہیں کہ لا یکتب حدیثہ[1] (اس کی حدیث
نہ لکھی جائے)

غرض آفرینشِ عالم کے متعلق دنوں کی ترتیب
تعیین میں تو کوئی صحیح موجود نہیں، البتہ سلف صحابہ
و تابعین کی اکثریت اسی پر ہے کہ ابتداءِ آفرینش
یک شنبہ کے دن سے عمل میں آئی بلکہ امام جریر
طبری نے تو اس پر سلف کا اجماع نقل کیا ہے،[2]

ب ۱/۸ ب ۵/۴ ب ۶/۲ ب ۹/۱۱ ب ۱۴/۲۲

سَبْتِھِمْ ان کا شنبہ منانا، ان کا سنیچر منانا،
ان کا کام چھوڑ دینا، سبت مضاف ھِمْ ضمیر
جمع مذکر غائب مضاف الیہ، یہود سنیچر کے دن
کام کاج چھوڑ دیتے اور اس دن کی تعظیم کرتے
ہیں ب ۹/۱۱

سَبَّحَ اس نے پاکی بیان کی، تسبیح سے
جس کے معنے سُبْحَانَ اللّٰہ کہنے اور اللہ
تعالیٰ کی پاکی بیان کرنے کے ہیں ماضی کا صیغہ
واحد مذکر غائب، امام راغب لکھتے ہیں
"سب چیزیں حق تعالیٰ شانہ کی تسبیح کرتی ہیں،
بعض کا سجدہ تسخیری ہوتا ہے اور بعض کا اختیاری"

آسمان زمین اور رینگنے والے جانوروں کے متعلق اس
بارے میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ وہ بالتسخیر تسبیح گذار
ہیں کیونکہ ان کے احوال اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ
پر دال ہیں البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آسمان
و زمین آیا اپنے اختیار سے بھی اللہ کی پاکی بولتے
ہیں اور آیت اسی کی مقتضی ہے"

علامہ لغوی سید محمد مرتضیٰ زبیدی، تاج العروس
شرح قاموس میں رقم طراز ہیں
"اور کبھی تسبیح بول کر اس سے نماز اور ذکر اور تحمید اور
تمجید مراد لی جاتی ہے، اور نماز تسبیح سے اس لیے
موسوم ہوئی کہ تسبیح کے معنے اللہ تعالیٰ کی تعظیم
کرنے اور برائی سے اس کی تنزیہ یعنی پاکی بیان
کرنے کے ہیں، . . . .
. . . . اور ارشاد الٰہی فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ
حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ (سو پاک
اللہ کی یاد کرو جب شام کرو اور جب صبح کرو) کی یہی
معنے پر تفسیر کی گئی ہے کہ ان دونوں وقتوں میں اللہ
ان کو نماز کا حکم فرماتا ہے، اور فراء نے کہا ہے کہ
حِیْنَ تُمْسُوْنَ مغرب و عشا اور حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ
نماز فجر اور عَشِیًّا نماز عصر اور حِیْنَ تُظْهِرُوْنَ نماز

[1] تلخیص المستدرک ج ۲ ص ۳۴۳ ۵
[2] تاریخ طبری ج ۱ ص ۲۳ طبع مصر

اولیٰ یعنی ظہر ہے اور ارشاد ہے وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ یعنی نماز پڑھ شام اور صبح (ملاحظہ ہو تَسْبِيحَةً) پ ۲۷ ع ۹ ، پ ۲۸ ع ۴

سَبِّحْ تو تسبیح کر، تو پاکی بیان کر، تو عبادت کر، تَسْبِيحٌ سے امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر، پ ۳ ع ۱۲ پ ۱۴ ع ۶ پ ۱۶ ع ۷ پ ۱۹ ع ۳ پ ۲۴ ع ۱۱ پ ۲۶ ع ۱۲ پ ۲۷ ع ۴، ۱۵، ۱۶ پ ۲۹ ع ۶ پ ۳۰ ع ۱۲، ۱۵

سَبْحًا مشغول ہونا، تیزی سے تیرنا، یہ سَبَحَ يَسْبَحُ کا مصدر ہے، امام راغب فرماتے ہیں "سَبْحٌ کے معنے پانی اور ہوا میں تیز گذرنے کے ہیں بولا جاتا ہے سَبَحَ سَبْحًا، سِبَاحَةً اور (حسب ذیل معانی میں) بطور استعارہ استعمال ہوا ہے (۱) آسمان میں ستاروں کی گردش کے لیے جیسے وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (اور ہر کوئی ایک چکر میں پیرتے ہیں) (۲) گھوڑے کے دوڑنے کے لیے جیسے وَالسَّابِحَاتِ سَبْحًا (اور قسم ہے پیرنے والے گھوڑوں کی تیزی سے) (۳) کام میں جلد لگ جانے کے لیے جیسے إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا (البتہ تجھ کو دن میں جلد شغل رہتا ہے لمبا)"

علامہ محمود آلوسی آیت إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا کی تفسیر میں لکھتے ہیں "کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنے ہیں "دن کو اپنے سونے اور حوائج میں مصروف ہونے کے سبب فراغت اور گنجائش ہے" اور بعض نے کہا ہے کہ "اگر رات میں کچھ چھوٹ جائے تو تمہیں دن میں فراغت ہے تم اس کی تلافی کر سکتے ہو" پس سبح بمعنے فراغ ہے اور لغت میں یہ اس معنے میں بھی مستعمل ہے لیکن پہلے معنی (یعنی کام میں جلدی مشغول ہو جانا) عرب کے محاورہ سبح فی الماء کے زیادہ موافق اور موقع کے زیادہ مناسب ہیں" [۱] پ ۲۹ ع ۱۴ پ ۳۰ ع ۳

سُبْحٰنَ پاک ہے، امام سیوطی، الاتقان میں رقم طراز ہیں "سبحان مصدر ہے بمعنے تسبیح (یعنی پاکی بیان کرنے کے)، نصب نیز مفرد کی طرف اضافت اس کو لازم ہیں خواہ مفرد اسم ظاہر ہو جیسے سُبْحٰنَ اللّٰهِ (اللہ پاک ہے) اور سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى (پاک ذات ہے جو لے گیا) یا اسم ضمیر جیسے سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ (اس کے

[۱] روح المعانی ج ۲۹ ص ۱۰۵ طبع منیریہ مصر

لائق نہیں ہے کہ اس کے اولاد ہو) اور سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا (پاک ہے تو ہم کو معلوم نہیں) اور یہ ان مصادر میں سے ہے جن کے فعل کو مردہ کر دیا گیا ہے (یعنی کبھی استعمال نہیں کیا گیا) اور کرمانی کی عجائب میں ہے کہ یہ غریب (یعنی اوپری سی بات) ہے، جو مفضل نے بیان کی ہے کہ سُبْحَانَ سَبَّحَ کا مصدر ہے جب کہ دعا اور ذکر کے لیے اپنی آواز بلند کرے اور یہ شعر پیش کیا ہے

قبح الاله وجوه تغلب کلما
سبح الحجیج وکبروا اهلالا

(اللہ تغلب کے منہوں کو بگاڑے جب بھی حاجی زور سے دعا مانگیں اور چلا کر تکبیر کہیں)

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سبحان اللہ کے معنے ہیں اللہ کی ذات کی ہر برائی سے پاکی بیان کرنا" [1]

علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے قاموس میں سبحان کو معرفہ لکھا ہے یعنی وہ اس کو تسبیح کا علم جنس بناتے ہیں جیسے بُرَّۃ (ایک گیہوں) بُرّ (گندم) کا علم جنس ہے اور اسی طرح دوسرے اعلام اجناس کہ جو معانی کے لیے وضع کیے گئے ہیں، اور صاحب قاموس نے جو اس کا علم ہونا بیان کیا ہے یہی مختار جماہیر ہے، قاضی بیضاوی زمخشری، دمامینی اور بہت سے علما بھی اسی کے مقر ہیں، زجاج نے سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی کی تفسیر میں کہا ہے کہ یہ مصدر ہونے کی بنا پر منصوب ہے یعنی مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے اور اس کا نصب ایک پوشیدہ فعل کی بنا پر ہے جس کا اظہار متروک ہے اس کی اصل یوں ہے اُسَبِّحُ اللّٰهَ سُبْحَانًا تَسْبِیْحًا (میں اللہ کی تسبیح کرتا ہوں) شیخ محمد فاسی لکھتے ہیں کہ پھر سبحان فعل کا قائم مقام ہو کر تنزیہ بلیغ یعنی ان تمام برائیوں سے جن کو مشرکین حق تعالیٰ شانہ کی طرف منسوب کرتے ہیں پاک ہونے کو بتانے لگا، نضر بن شمیل کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا ایک شخص نے مجھ سے سبحان اللہ کی تفسیر بیان کی اس نے کہا کہ کیا تم محاورہ الفرس یسبح فی سرعته (گھوڑا اپنی تیزی

[1] الاتقان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۱۶۲ طبع مصر ۱۳۴۳ھ

میں دوڑ رہا ہے) پر غور نہیں کرتے کہنے لگا سبحان[1] اللہ کے معنے ہیں اللہ کی طرف لپکنا اور اس کی طاعت میں چست رہنا۔

یہ واضح رہے کہ امام سیوطی نے جو یہ کہا ہے کہ سبحان کے فعل کو مردہ کر دیا گیا ہے اور مفصل نے جو اس سے فعل کے آنے کا ذکر کیا ہے تو تعجب کے ساتھ اسے کرمانی کی عجائب سے نقل کیا ہے اور اسی طرح ابن یعیش وغیرہ شارحین مفصل نے بھی لکھا ہے سو لائق اعتبار نہیں، کیونکہ اس کا فعل مشہور ہے اور ارباب افعال اور دیگر علماء اس کو لائے ہیں ان کا بیان ہے کہ یہ سَبَحَ مخفف سے ہے جیسے کہ شَکَرَ شُکْرَاناً ہے اور ایک جماعت نے اس کو بھی جائز رکھا ہے کہ اس کا فعل سَبَّحَ ہو مشدد مگر یہ تصریح ضرور کرتے ہیں کہ یہ بعید از قیاس ہے کیونکہ اس کی کوئی نظیر نہیں، برخلاف اول کے کہ اس کی نظیریں بہت سی ہیں اگرچہ وہ بھی غیر مقیس ہے یعنی قاعدہ کے مطابق نہیں ہے۔

پ ۱۳/۶، پ ۱۵/۱و۱۰و۱۲، پ ۱۷/۲، پ ۱۸/۵، پ ۱۹/۱۴، پ ۲۰/۱۰، پ ۲۱/۵، پ ۲۳/۹و۱۴، پ ۲۵/۷و۱۳، پ ۲۷/۴، پ ۲۸/۹، پ ۲۹/۳

سُبْحٰنَكَ تو پاک ہے، سبحان مضاف، كَ ضمیر واحد مذکر حاضر، مضاف الیہ، پ ۱/۴، پ ۳/۱۱، پ ۷/۶، پ ۹/۱۷، پ ۱۱/۹، پ ۱۷/۶، پ ۱۸/۵و۱۷، پ ۲۲/۱۱

سُبْحٰنَهٗ وہ پاک ہے، سُبْحٰنَ مضاف، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۱/۱۴، پ ۶/۳، پ ۷/۱۸، پ ۱۰/۱۱، پ ۱۱/۶و۱۲، پ ۱۴/۷و۱۳، پ ۱۵/۵، پ ۱۶/۵، پ ۱۷/۲، پ ۲۱/۷، پ ۲۳/۱۵، پ ۲۴/۴

سَبَّحُوْا انہوں نے تسبیح کی، انہوں نے پاکی بیان کی، تَسْبِيْحٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب (ملاحظہ ہو تَسْبِيْحَةٌ اور سَبَّحَ) پ ۲۱/۱۵

سَبِّحُوْا تم تسبیح پڑھو، تم پاکی بیان کرو، تم عبادت کرو، تَسْبِيْحٌ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر پ ۱۶/۴

سَبِّحُوْهُ اس کی پاکی بولتے رہو، اس کی یاد کرتے رہو، اس میں ہُ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، پ ۲۲/۳

سَبِّحْهُ تو اس کی تسبیح کر، تو اس کی پاکی بول اس میں ہُ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، (ملاحظہ ہو

---

[1] اس بحث کے تمام حوالوں کے لیے ملاحظہ ہو تاج العروس شرح قاموس

سَبِّحْ ٢٦/٤ ٢٧/٣ ٢٩/٣

سَبُعٌ درندہ، اَسْبُعٌ اور سِبَاعٌ جمع، راغب نے مفردات میں لکھا ہے

"درندہ کو سَبُعٌ اس لیے کہا گیا کہ اس کی قوت پوری ہوتی ہے اور سَبْعٌ بھی اعداد تامہ میں سے ہے" ٦/٥

سَبْعٌ سات، ہفت، اسم عدد ہے، مونث کے لیے آتا ہے۔ ١/٣ ٣/٤ ١٢/١٤ ٥/٥ ١٨/١٥ ٢٤/١٦ ٥٢/١٨ ٢٩/٩ **سَبْعًا** ١٤/٩ ٣٠/١

سَبْعُوْنَ ستر، اسم عدد ہے، بحالت رفع سبعون ہوگا ٢٩/٥

سَبْعَةٌ سات، ہفت، اسم عدد ہے مذکر کے لیے آتا ہے ٢/٨ ١٤/٣ ١٥/١٥ ٢١/١٢

سَبْعِيْنَ ستر، اسم عدد ہے، بحالت نصب و جر سَبْعِيْنَ ہوگا۔ ٩/٩ ١٠/١٦

سَبَقَ وہ پہلے ہوچکا وہ پہلے گذر چکا، اس نے سبقت کی، سَبْقٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، مِنَ اللّٰہِ سَبَقَ کا مطلب ہے اللہ کی طرف سے پہلے سے ٹھیر چکا اور ہو چکا ٩/٩ ١٠/١٦ (ملاحظہ ہو تَسْبِقُ) ١٠/٥ ١٢/٤ ١٦/٤ ١٨/٢

سَبْقًا آگے ہونا، پہلے ہونا، مقدم ہونا، سَبَقَ يَسْبِقُ کا مصدر ہے ٣٠/٣

سَبَقَتْ پہلے سے ہوچکی، پہلے سے ٹھیر چکی، سَبْقٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مونث غائب۔ ١١/٢ ١٢/١٠ ١٦/١٢ ١٧/٧ ٢٣/٩ ٢٤/٢ ٢٥/٣

سَبَقَكُمْ اس نے تم سے پہلے کیا، اس نے تم سے سبقت کی، سَبَقَ اس میں كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر ہے (ملاحظہ ہو سَبَقَ) ٢٠/١٢ ٢١/١٥

سَبَقُوْا انہوں نے سبقت کی، وہ آگے نکل گئے، سَبْقٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب۔ ١٠/٤

سَبَقُوْنَا وہ ہم سے پہلے دوڑے، انہوں نے ہم سے سبقت کی، وہ ہم سے آگے ہوئے، اس میں نا ضمیر جمع متکلم ہے۔ ٢٦/٢ ٢٨/٤

سُبُلَ راہیں، راستے سَبِيْلٌ کی جمع ٦/٧ ٩/٦ ١٤/١٥

سُبُلَنَا ہماری راہیں، ہمارے راستے، سُبُلَ مضاف، نا ضمیر جمع متکلم

مضاف الیہ" پ ۱۳/۱۴ پ ۲۱/۳ سُبُلًا پ ۱۴/۸ پ ۱۶/۱۱ پ ۱۷/۴ پ ۲۵/۷ پ ۲۹/۹

سَبِیْلٌ راستہ، راہ "سبیل" اصل میں اس راہ کو کہتے ہیں جو واضح ہو اور اس میں سہولت ہو، امام راغب لکھتے ہیں

سَبِیْلٌ کا استعمال ہر اس شے کے لئے ہوتا ہے جس کے ذریعہ کسی شے تک پہنچا جا سکے خواہ وہ شے شر ہو یا خیر، نیز واضح راستہ بھی اس سے مراد لیا جاتا ہے، یہ لفظ مذکر بھی استعمال ہوتا ہے اور مؤنث بھی ابن الاثیر نے کہا ہے کہ اس کی تانیث زیادہ غالب ہے[1]، اس کی تذکیر کا شاہد ارشاد الٰہی وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا ج وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الْغَیِّ یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا ہے (کہ اس میں سبیل کے لئے مذکر کی ضمیر لائی گئی ہے) اور تانیث کا شاہد قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِیْرَةٍ ہے (کہ ھٰذِہٖ کے ذریعہ اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو مؤنث کے لئے استعمال ہوتا ہے)

آیت شریفہ لَیَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ (اور ان کو روکتے رہتے ہیں راہ سے) میں "سبیل" سے راہ حق مراد ہے کیونکہ اسم جنس کا جب مطلق ہو کر استعمال ہو تو وہ اس کے ساتھ مخصوص ہوگا جو حق ہو اور ایسے ہی ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ (پھر راہ آسان کر دی اس کو) ہے،

آیت کریمہ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِیْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ (اور اللہ تک پہنچتی ہے سیدھی راہ اور بعضی راہ کج بھی ہے) میں سبیل سے کوئی ایک معین راستہ مراد نہیں کہ جو کج بھی ہو، بلکہ یہاں یہ اسم جنس ہے سبیل پ ۱/۱۳ پ ۲/۶ و ۱۰ پ ۳/۱۶
پ ۵/۳ و ۴ و ۹ و ۱۱ و ۱۴ پ ۶/۷ و ۱۳ و ۱۴ پ ۷/۱۲ پ ۹/۷ پ ۱۰/۱ و ۱۸
پ ۱۱/۱۴ پ ۱۳/۱۱ پ ۱۴/۵ و ۷ و ۲۲ پ ۱۵/۳ پ ۱۸/۱۷ پ ۱۹/۱۷
پ ۲۰/۶ و ۱۵ و ۱۹ پ ۲۱/۷ و ۱۱ و ۱۷ پ ۲۴/۷ و ۹ و ۱۰ پ ۲۵/۵ و ۶ و ۱۰
پ ۲۸/۴ و ۷ پ ۲۹/۱۹ پ ۳۰/۵

سَبِیْلًا پ ۴/۱ و ۱۴ پ ۵/۳ و ۵ و ۹ و ۱۱ و ۱۴ و ۱۶ پ ۶/۱ پ ۹/۷ و ۸
پ ۱۵/۴ و ۵ و ۸ و ۹ و ۱۲ پ ۱۸/۱۶ پ ۱۹/۱ و ۲ و ۳ پ ۲۱/۵ پ ۲۹/۱۳ و ۲۰

سَبِیْلِ اللّٰهِ راہ خدا، اللہ کی راہ سَبِیْلِ مضاف، اللّٰهِ مضاف الیہ، حافظ ابو السعادات ابن الاثیر الجزری لکھتے ہیں

"سَبِیْلِ اللّٰهِ لفظ عام ہے جو ہر اس خالص عمل کے لئے آتا ہے جس کی بدولت حق تعالیٰ کے تقرب کے راستے

---

[1] النہایہ فی غریب الحدیث والاثر ج ۲ ص ۱۵۶ طبع خیریہ مصر

بر فرائض، نوافل اور انواع عبادات کی ادائیگی کے ذریعہ گامزن ہوا جائے اور جب یہ مطلق استعمال ہو تو بیشتر جہاد کے معنی میں آتا ہے حتیٰ کہ کثرت استعمال کی بنا پر ایسا ہو گیا کہ گویا اسی معنی میں منحصر ہو[1]

پ ۲/۳و۸و۹و۱۱و۱۲ پ ۳/۴و۵و۹و۱۰ پ ۴/۸و۲و۱ پ ۵/۱۰و۹و۷ پ ۶/۲و۳و۱۲ پ ۸/۱و۱۶و۱۸ پ ۹/۱۸ پ ۱۰/۲و۴و۶و۹و۱۱و۱۲و۱۳و۱۴ پ ۱۱/۳و۴ پ ۱۲/۲ پ ۱۳/۱۳ پ ۱۴/۱۸و۱۹ پ ۱۷/۸و۱۰ پ ۱۸/۹ پ ۲۱/۱۰ پ ۲۳/۱۱ پ ۲۶/۵و۸و۱۴ پ ۲۷/۱۷ پ ۲۸/۳و۱۰و۱۳ پ ۲۹/۱۴

سَبِيلِكَ تیری راہ، تیرا راستہ، سَبِيلِ مضاف

كَ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۱۱/۱۴ پ ۲۴/۲

سَبِيلَنَا ہماری راہ، ہمارا راستہ، سَبِيلِ مضاف

نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، پ ۲۰/۱۳

سَبِيلِهٖ اس کی راہ، اس کا راستہ، سَبِيلِ مضاف

ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ پ ۷/۱ پ ۸/۱و۶ پ ۱۰/۸و۹ پ ۱۳/۱۷ پ ۱۴/۲۲ پ ۱۵/۲۱ پ ۲۳/۱۵ پ ۲۷/۲ پ ۲۸/۹ پ ۲۹/۳

سَبِيلِهِمْ ان کی راہ، ان کا راستہ، سَبِيلِ مضاف

ھم ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۱۰/۷

سَبِيلِيْ میری راہ، میرا راستہ، سَبِيلِ مضاف

ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، پ ۴/۱۱ پ ۱۳/۲ پ ۲۸/۷

فصل التاء المثناۃ

سِتْرًا حجاب، پردہ، سُتُوْرٌ اور اَسْتَارٌ جمع، پ ۱۶/۲

سِتَّةِ چھ، اسم عدد ہے، مذکر کے لئے استعمال ہوتا ہے، سِتَّةٌ اصل میں سِدْسَةٌ تھا، سین کو تا سے بدلا اور پھر دال کا اس میں ادغام کر دیا گیا پ ۸/۱۴ پ ۱۱/۲ پ ۱۲/۱ پ ۱۹/۳ پ ۲۱/۱۴ پ ۲۶/۱۷ پ ۲۷/۱۷

سِتِّيْنَ ساٹھ، اسم عدد ہے سِتَّةٌ سے مشتق ہے، پ ۲۸/۱

فصل الجیم المعجمۃ

سَجَدَ اس نے سجدہ کیا، سُجُوْدٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کے متعلق بعض نے تو یہ کہا ہے کہ فرشتوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو قبلہ قرار دیں اور بعض کا قول ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے فروتنی کرنے اور ان کی اولاد کی مصالح کا بندوبست کرنے کا ان کو حکم ہوا تھا، سو بجز ابلیس کے سب نے حکم مانا[2] (ملاحظہ ہو اُسْجُدُوْا) پ ۱۴/۳ پ ۲۳/۱۴

سُجَّدًا سجدہ کرنے والے سَاجِدٌ کی جمع، آیت شریفہ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا (اور داخل ہو دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے) میں

[1] ملاحظہ ہو النہایہ فی غریب الحدیث والاثر [2] مفردات القرآن

والےؒ، اور وَخَرُّوا لَہٗ سُجَّدًا (اور سب گرے اس کے آگے سجدہ میں) میں سجدۂ تعظیمی مراد ہے سجدۂ عبادت نہیں، اور اخفش نے جو نحو و لغت کے امام ہیں فرمایا ہے کہ یہاں خرَّ بمعنی مرَّ (یعنی گذرنے کے) ہے گرنے اور زمین پر پڑنے کے معنی میں نہیں، ان کے قول پر آیت کا ترجمہ یوں ہوگا "وہ ان کے لیے جھکے ہوئے گذرے"۲؎ پ ۱/۴ پ ۶/۲ پ ۹/۱۰ پ ۱۳/۵ پ ۱۴/۱۲ پ ۱۵/۱۲ پ ۱۶/۱۲ و ۷ پ ۱۹/۴ پ ۲۱/۱۵ پ ۲۶/۱۲

سَجَدُوْا انہوں نے سجدہ کیا، سُجُوْدٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب۔ پ ۱/۴ پ ۵/۱۲ پ ۹/۹ پ ۱۵/۷ و ۱۹ پ ۱۶/۱۹

سُجِّرَتْ وہ آگ سے پر کی گئی۔ اس کا پانی بہایا گیا۔ وہ خالی کی گئی، وہ پُر کی گئی، تَسْجِیْرٌ سے جس کے معنی زور سے آگ بھڑکانے اور بہانے، خالی کرنے اور پُر کرنے کے ہیں۔ ماضی کا صیغہ واحد مونث غائب، امام فخر الدین رازیؒ آیۂ شریفہ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (اور جب دریا جھونکے جائیں گے) کی تفسیر میں رقم طراز ہیں۔

" یہ بالتخفیف بھی پڑھا گیا ہے اور بالتشدید بھی (یعنی سُجِرَتْ بھی اور سُجِّرَتْ بھی) اور اس میں مختلف وجہیں ہیں۔

(۱) اصل کلمہ سجرت (التنور) سے ہے جو تنور جھونکنے اور اس میں آگ بھڑکانے کے لیے آتا ہے اور کسی چیز میں جب آگ بھڑکائی جاتی ہے تو جو کچھ رطوبت اس میں ہوتی ہے وہ خشک ہو جاتی ہے، تو اس وقت سمندروں میں ذرا سا پانی بھی نہیں بچے گا، پھر چونکہ حسب تصریح وَسُیِّرَتِ الْجِبَالُ (اور چلائے جائیں گے پہاڑ) پہاڑ چلائے جائیں گے اس لیے اس آن سمندر اور زمین انتہائی حرارت اور سوزانی میں ایک شئے بن جائیں گے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ جب سمندروں کے پانی سوکھ جائیں تو زمین ابھر کر اور مرتفع ہو کر پہاڑوں کی چوٹیوں کے برابر ہو جائے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ جب پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر ان کے اجزا منتشر ہوں اور وہ مٹی کی طرح ہو جائیں تو وہ مٹی سمندروں کی تہ میں جا پہنچے اور سطح زمین سمندروں کے ساتھ برابر ہو جائے اور سب مل کر ایک دھکتا ہوا سمندر بن جائے۔

۱؎ الاتقان ج ۱ ص ۱۳۸ ۲؎ تاج العروس

(۲) سجرت بمعنی فجرت ہو جو پانی کے رواں
ہونے کے لیے آتا ہے، اور یہ اس طرح کہ چونکہ
حسب ارشاد مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ بَيْنَهُمَا
بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ (چلائے دو دریا مل کر چلنے والے
ان دونوں میں ہے ایک پردہ جو ایک دوسرے
پر زیادتی نہ کرے) سمندروں کے مابین آڑ ہے پس
جب اللہ اس آڑ کو ہٹا دے گا، ایک دوسرے میں
رواں ہونے لگے گا اور سارے سمندر ایک سمندر
بن جائیں گے، کلبی کا قول یہی ہے۔

(۳) سجرت بمعنی اوقدت یعنی آگ بھڑکانے
کے ہو۔ قفال نے کہا ہے کہ اس کی تاویل میں
مختلف وجوہ کا احتمال ہے۔ اول یہ کہ جہنم سمندروں کی
تہوں میں ہو اس پر سمندر اس وقت تو اس لیے نہیں دہکتے
کہ دنیا کو قائم رکھنا ہے لیکن جب دنیا کی مدت ختم ہو جائے
گی حق تعالیٰ شانہ اس آگ کی تاثیر کو سمندروں تک
پہنچا دیگا اور اس لیے وہ پورے طور پر کھولنے لگ جائینگے
دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ آفتاب و ماہتاب اور ستاروں
کو سمندر میں ڈال دے گا اور سمندر کھول اٹھیں گے
سوم یہ کہ اللہ تعالیٰ سمندروں میں آتش عظیم پیدا فرمائیگا
کہ پانی ابل جائیں گے، ہیں (یعنی امام رازی)

کہتا ہوں کہ ان سب وجہوں میں تکلف سے
کام لیا گیا ہے ان میں سے کسی کی بھی حاجت
نہیں کیونکہ جو دنیا کی تخریب اور قیامت کے
قائم کرنے پر قادر ہے یقیناً وہ اس پر بھی قادر
ہے کہ سمندروں کے ساتھ جو چاہے کرے ان کو
کھولا دے یا ان کے پانیوں کو آگ کی شکل میں
بدل ڈالے بغیر اس کے کہ اس ان میں آفتاب
و ماہتاب کے ڈالنے کی حاجت ہو یا ان کے نیچے
جہنم کی آگ ہو[1] پ ۳۰

سِجِلّ کاغذ کا طومار، صحیفہ، محضر، وثیقہ،
لکھنے والا، مرد، ایک شخص کا نام، سجلات
جمع۔ یہ ان اسماء میں ہے کہ باوجود مذکر ہونے کے
ان کی جمع الف تا کے ساتھ آتی ہے[2] جو جمع
مونث سالم کا وزن ہے۔

علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں

"اس میں اختلاف ہے کہ آیا یہ لفظ عربی ہے یا
معرب (یعنی دوسری زبان سے عربی میں
لایا گیا) ہے پس بصو والے تو اس طرف گئے
ہیں کہ یہ عربی ہے اور ابو الفضل رازی نے
کہا ہے کہ اصح یہ ہے کہ یہ فارسی کا معرب ہے[3]"

۱؎ تفسیر کبیر ج ۸ ص ۳۸۳ و ۳۳۹ طبع شرفیہ مصر ۱۳۲۴ھ ۲؎ تاج العروس ۳؎ روح المعانی ج ۷ اص ۹۱ طبع منیریہ مصر

ابن جنی نے جو نحو و عربیت کے امام ہیں المحتسب میں سجل کے معنے کتاب یعنی نوشتہ کے نقل کئے ہیں اور لکھا ہے کہ ایک قوم نے اس کو فارسی سے معرّب کہا ہے[1] امام راغب مفردات میں لکھتے ہیں کہ اس کی اصل جیسا کہ بیان کیا گیا ہے فارسی ہے جس کو عربی کر لیا گیا ہے اور سجل کو پتھر بتایا گیا ہے جس پر تحریر کیا جاتا تھا بعد میں ہر وہ شے جس پر لکھا جانے لگا اس کا نام سجل پڑ گیا،

اس لحاظ سے سجل فارسی لفظ سنگ کا معرب ہے۔

اور ابن مردویہ نے بطریق ابی الجوزاء حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ حبشی زبان میں اس کے معنی شخص کے ہیں[2] امام لغت زجاج کا بھی یہی بیان ہے[3]

امام ابن جریر طبری اپنی مشہور تفسیر جامع البیان فی تفسیر القرآن میں رقمطراز ہیں،

"جس سجل کا حق تعالیٰ نے یہاں ذکر فرمایا ہے اہل تاویل اس کے معنی میں مختلف ہیں بعض کا قول ہے کہ وہ ایک فرشتہ کا نام ہے کچھ لوگوں کا بیان ہے کہ وہ ایک کاتب تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کتابت کی خدمت انجام دیا کرتے تھے، دیگر حضرات یہ کہتے ہیں کہ سجل وہ صحیفہ ہے جس میں لکھا جاتا ہے (پہلے قول کو) ابن جریر نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور سدی سے اور دوسرے کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور تیسرے کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد سے روایت کیا ہے اور اس کے بعد فرمایا ہے کہ اور اس بارے میں ہمارے نزدیک سب اقوال میں صحت کے اعتبار سے اولیٰ اس شخص کا قول ہے جس نے سجل کو اس جگہ یعنے صحیفہ بیان کیا ہے، کیونکہ یہی معنے کلام عرب میں معروف ہیں، اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کسی ایسے کاتب کا پتہ نہیں چلتا کہ جس کا نام سجل ہو اور نہ فرشتوں میں کوئی ایسا فرشتہ ہے کہ جس کا یہ نام ہو"[4]

واضح رہے کہ ابن منذر، ابو نعیم، ابن مردویہ، خطیب اور ابن عساکر حضرت ابن عمر رضی اللہ سے راوی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

[1] الاتقان از سیوطی ج ۱ ص ۱۳۸ طبع مصر ۱۳۴۳ھ [2] ایضاً [3] غرائب القرآن ورغائب الفرقان از نظام الدین نیشاپوری ج ۱۷ ص ۲۰ برحاشیہ تفسیر طبری [4] جامع البیان المعروف بہ تفسیر ابن جریر طبری ج ۱۷ ص ۷۰ طبع میمنیہ مصر

کا ایک کاتب تھا جس کو سجل کہا جاتا تھا سو اللہ
تعالیٰ نے نازل فرمایا یَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ
كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ (جس دن ہم لپیٹ دیں
گے آسمان کو جس طرح کہ سجل کا لپیٹنا ہے نوشتوں کو)[1]
خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں اس حدیث
کو روایت کرکے بروایت برقانی حافظ ابو الفتح
ازدی سے نقل کیا ہے کہ اگر یہ روایت صحیح ہو
تو ابن نمیر اس میں منفرد ہیں[2]، حافظ ابن حجر عسقلانی
الاصابہ میں لکھتے ہیں کہ "ابن نمیر کبار ثقات میں
سے ہیں اور یہ حدیث ان طرق سے صحیح ہے اور
اُس سے غفلت ہوئی جس نے یہ زعم کیا یہ حدیث
موضوع ہے[3]" لیکن حافظ صاحب کا یہ فرمانا
اسناد کے اعتبار سے تو ممکن ہے اُسے تسلیم کرلیا جائے
لیکن متن بہرحال نکارت سے خالی نہیں حافظ

ابن کثیر نے صاف تصریح کی ہے
وھذا منکر جداً من حدیث نافع عن ابن
عمر لا یصح اصلاً[4] "یہ ابن عمر سے بروایت
نافع سخت منکر ہے ہرگز صحیح نہیں ہے،
اسی طرح ابو داؤد اور نسائی وغیرہ کی وہ
روایت جو انھوں نے حضرت ابن عباس رضی
اللہ عنہما سے یہ کی ہے کہ سجل رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کے کاتب تھے، اور بیہقی نے اس
کی تصحیح بھی کی ہے صحیح نہیں بلکہ موضوع ہے
چنانچہ حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر میں رقمطراز ہیں۔
"اور اسی طرح ابن عباس سے بروایت ابی داؤد
وغیرہ جو گزرا وہ بھی صحیح نہیں حفاظ کی ایک جماعت نے
اسکے موضوع ہونے کی تصریح کی ہے اگرچہ وہ ابو
داؤد کی سنن میں موجود ہے منجملہ ان کے ہمارے شیخ م
م حافظ کبیر ابو الحجاج مزی ہیں، • اور بحمد اللہ اس حدیث پر ایک مستقل جزء لکھا ہے اور امام ابو جعفر بن جریر اس

[1] تفسیر فتح القدیر ج۔ ۳ ص ۴۱۸ طبع مصر ۱۳۵۱ھ [2] تاریخ بغداد ج ۸ ص ۱۷۵ طبع سعادت مصر ۱۳۴۹ھ [3]
الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ ج۔ ۲ ص ۶۵ طبع شرفیہ مصر ۱۳۲۵ھ [4] تفسیر ابن کثیر ج۔ ۳ ص ۲۰۰ [5] ملاحظہ ہو الدر
المنثور فی تفسیر بالماثور از امام سیوطی ج ۴ ص ۳۴۰ طبع مصر [6] واضح رہے کہ ابن کثیر کی اس عبارت کو قاضی شوکانی
نے بھی فتح القدیر میں نقل کیا ہے، نواب صدیق حسن خاں صاحب کا تفسیر فتح البیان میں اصل ماخذ ہی فتح القدیر
ہے چنانچہ جملہ وقد افردت لھذا الحدیث جزءاً علی حدتہ کو نواب صاحب نے قاضی شوکانی کی عبارت سمجھا اور
فتح البیان میں نقل کرتے وقت اس میں اس طرح تصرف فرمایا کہ وقد افرد الشوکانی لھذا الحدیث جزءاً علی حدتہ
جس کے نتیجہ میں وہ جزء بجائے حافظ ابن کثیر کے قاضی شوکانی کی تصنیف بن کر رہ گیا (ملاحظہ ہو تفسیر فتح البیان فی مقاصد
القرآن ج۔ ۶ ص ۱۵۲ طبع میریہ بولاق مصر ۱۳۰۱ھ)

روایت پر انکار کے درپے ہیں انہوں نے اس
کی پورے طور پر تردید کی ہے ان کا بیان ہے
کہ صحابہ میں کسی ایسے شخص کا پتہ نہیں چلتا
کہ جس کا نام سجل ہو حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم کے کاتب معروف ہیں ان میں کوئی
ایسا شخص نہیں کہ جس کا نام "سجل" ہو۔ اللہ
ان پر رحم فرمائے انہوں نے اس بارے
میں بالکل صحیح فرمایا ہے اور یہ اس حدیث
کی نکارت پر سب سے قوی دلیل ہے۔

اور جس نے بھی اسماء صحابہ میں سجل
کا ذکر کیا ہے اس نے اسی حدیث پر اعتماد
کیا ہے کسی اور چیز پر نہیں واللہ اعلم،
اور صحیح ابن عباس سے یہی ہے کہ سجل
صحیفہ ہی ہے، علی بن ابی طلحہ اور عوفی ان
سے یہی روایت کرتے ہیں۔ مجاہد، قتادہ
اور بہت سے علماء نے اسی کی تصریح کی
ہے، اور ابن جریر نے اسی کو اختیار
کیا ہے کیونکہ لغت میں یہی مشہور ہے
پس اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں
گے کہ "جس دن کہ ہم لپیٹ لیں آسمان کو
جیسے لپیٹتے ہیں صحیفہ میں نوشتے"

قاضی شوکانی نے تفسیر فتح القدیر میں
میں لکھا ہے کہ "یہ کہنا کہ ابن عباس رضی اللہ
عنہما سے بس یہی صحیح ہے (یعنی سجل کا معنی
صحیفہ ہونا) درست نہیں کیونکہ علی بن ابی طلحہ
اور عوفی دونوں ضعیف ہیں۔ لہٰذا اولیٰ یہ ہے
کہ معنی لغوی ہی پر اعتماد کیا جائے اور
اسی کی طرف رجوع کیا جائے[1]" لیکن
واضح رہے کہ علی بن ابی طلحہ وہ ہیں جن پر حضرت
ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایات کے
باب میں امام بخاری نے اپنی صحیح میں اعتماد
کیا ہے اور عوفی کی روایات کی امام
ترمذی نے تحسین کی ہے[2]

علاوہ ازیں سجل کو اگر کسی
کاتب کا نام مانا جائے تو تشبیہ میں
حسن نہیں رہتا[3]۔ بہرحال لغت کے
اعتبار سے بھی اور روایت کے
اعتبار سے بھی اولیٰ یہی معلوم ہوتا
ہے کہ اس کے معنے صحیفہ کے لیے جائیں،
ثابت

[1] تفسیر فتح القدیر ج ۳ ص ۴۱۸ [2] الاتقان ج ۲ ص ۱۸۸ و ۱۸۹ طبع مصر [3] ملاحظہ ہو روح المعانی ج ۱۷ ص ۹۱

سِجْنٌ قیدخانہ، محبس، سُجُوْنٌ جمع پ ۱۲/۱۴ و ۱۵ پ ۱۳/۵

سُجُوْدٌ سجدہ کرنا، سر زمین پر رکھنا۔ فروتنی کرنا، یہ سَجَدَ یَسْجُدُ کا مصدر ہے۔ امام راغب نے لکھا ہے "کہ کبھی سجود کی تعبیر نماز سے بھی کی جاتی ہے ارشاد ہے وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (اور نماز کے پیچھے) اور صلاۃ الضحیٰ کو سبحۃ الضحیٰ اور سجود الضحیٰ بھی کہتے ہیں" پ ۲۶/۱۷ پ ۲۹/۱۴

سُجُوْدٌ سجدہ کرنے والے، سَاجِدٌ کی جمع پ ۱/۱۵ پ ۱۷/۱۱ پ ۲۶/۱۲

سَجٰی وہ چھاگیا۔ اس نے آرام لیا، اس نے قرار پکڑا، (نصر) سُجُوٌّ سے جس کے معنی سکون پانے اور قرار پکڑنے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب

علامہ حسین بن احمد معروف با بن خالویہ لکھتے ہیں

"کہ جب رات میں ہوا تھم جائے، اور اس کی اندھیاری سخت بڑھ جائے تو کہا جاتا ہے لَیْلٌ سَاجٍ اسی طرح جب سمندر تھم جاتا ہے تو بحر ساج بولتے ہیں"[1] پ ۳۰/۱۸

سِجِّیْلٌ کنکر، یہ وہی فارسی کا سنگ و گل ہے جو عربی میں آکر سِجِّیْلٌ بن گیا ہے، فریابی نے مجاہد سے یہی نقل کیا ہے[2] پ ۱۲/۷ پ ۱۴/۵ پ ۳۰/۳۰

سِجِّیْنٌ سجین، قیدخانہ، ابوحاتم نے کتاب الزینۃ میں ذکر کیا ہے کہ یہ لفظ غیر عربی ہے امام فخرالدین رازی، تفسیر کبیر میں رقم طراز ہیں۔

"سجین آیا شئے معین کے لیے اسم علم ہے یا کسی معنی سے اسم مشتق ہے اس بارے میں دو قول ہیں۔

اول جمہور مفسرین کا قول ہے کہ یہ شئے معین کا علم ہے۔ پھر اس شئے معین میں اختلاف ہے اکثر تو اس طرف ہیں کہ یہ ساتویں زمین زیر زمین ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بروایت عطا نیز قتادہ، مجاہد، ضحاک اور ابن زید کا یہی قول ہے۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپؐ نے فرمایا سجین ساتوں زمینوں میں سب سے نیچے ہے، عطاء خراسانی کا بیان ہے کہ ابلیس اور اس کی ذریت اسی میں ہے۔۔۔ اور ....

۱؎ اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن العظیم ص ۱۱۶ طبع دار الکتب المصریہ ۲؎ الاتقان ج ۱ ص ۱۳۸ طبع مصر

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سجین جہنم میں ایک گڑھا ہے، کلبی اور مجاہد نے کہا ہے کہ سجین ساتویں زمین کے نیچے ایک چٹان ہے،

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ مشتق ہے اور سِجِّینٌ بروزن فِعِّیلٌ سجنٌ سے جس کے معنے حبس اور تضییق (یعنی روکنے قید کرنے اور تنگ کرنے) کے ہیں اسی طرح اسم قرار دیا گیا ہے جس طرح کہ فسق سے فِسِّیقٌ بولا جاتا ہے ابو عبیدہ، مبرا اور زجاج کا یہی قول ہے، واحدی کا بیان ہے کہ یہ قول ضعیف ہے اور اس امر کی دلیل کہ اہل عرب سجین کو نہیں جانتے آیۃ شریفہ وَمَا اَدْرٰكَ مَا سِجِّيْنٌ (اور تجھ کو کیا خبر ہے کیا ہے سجین) ہے یعنی سجین اس میں سے نہیں جسے تم اور تمہاری قوم جانتی ہو (امام رازی کہتے ہیں) اور میں اس کو ضعیف نہیں بتاتا کیونکہ شاید یہ سجین کے معاملہ کی عظمت کے لئے بیان کیا گیا ہو جیسے ارشاد الٰہی وَمَا اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (اور تجھ کو کیا خبر ہے کیا ہے دن انصاف کا) میں ہے"[1]

شیخ اسماعیل حقی بروسوی لکھتے ہیں

"سجین" اس جامع کتاب کا علم ہے جو شر کا دفتر ہے جس میں شیاطین نیز کافران وفاسقان جن وانس کے اعمال مدون ہیں یہ لفظ حاتم کی طرح صفت سے نقل کر لیا گیا ہے اور منصرف ہے کیونکہ اس میں صرف ایک ہی سبب ہے یعنی معرفہ ہونا اور اس کی اصل فِعِّیلٌ ہے سِجْنٌ سے ساجن کا مبالغہ ہے[ع]، یا چونکہ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، اسے ساتویں زمین کے نیچے تاریک اور وحشتناک مقام پر ڈال دیا گیا ہے نیز ابلیس اور اس کی ذریت کا ان کی تذلیل اور تحقیر کی بنا پر مسکن ہے اور وہاں راندہ درگاہ شیاطین پہنچتے رہتے ہیں جس طرح کہ نیکوں کے نوشتوں پر فرشتگان مقرب حاضر ہوتے ہیں لہٰذا سجین مسجون[ع] کا مبالغہ ہے[2]

قاضی محمد بن علی شوکانی فرماتے ہیں

" سجین کے نون میں علماء نے اختلاف کیا ہے بعض

---

[1] تفسیر کبیر مسمیٰ بہ مفاتیح الغیب ج ۸ ص ۳۵۲ طبع مصر [2] تفسیر روح البیان ج ۱۰ ص ۳۶۶ طبع استنبول

ع یعنی بہت روکنے اور قید کرنے والے کے کیونکہ یہ دوزخیوں کو جہنم میں روکنے اور قید کرنے کا سبب ہے

ع یعنے محبوس ومقید کے کیونکہ ساتویں زمین میں مقید پڑا ہوا ہے

نے کہا ہے کہ اصلی ہے اور اس کا اشتقاق سَجْرٌ سے ہے جس کے معنی حبس کے ہیں اور یہ مبالغہ کا وزن ہے جیسے حِمِّيرٌ، سِکِّيرٌ اور فِسِّيقٌ خمر سکر اور فسق سے ہیں ابو عبیدہ، مبرد اور زجاج نے ایسا ہی بیان کیا ہے، واعدی نے کہا ہے کہ یہ کمزور بات ہے کیونکہ عرب سجّین سے واقف نہ تھے اور اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ ان ائمہ کا بیان کرنا، خود دلیل قایم کرتا اور یہ بتلاتا ہے کہ یہ لفظ عربی زبان کا ہے اور اسی میں سے ابن مقبل شعر ہے ؎

ورفقة یضربون البیض ضاحیة
ضربا تواصت به الابطال سجینا

اور بعض کا قول ہے کہ نون لام کے بدلہ میں ہے اصل میں سجیل تھا جو سِجِلٌّ سے مشتق ہے جس کے معنے نوشتہ کے ہیں"[1] ب ۳۰ ع ۸

فصل الحاء المهملة

سَحَابٌ بادل "سحاب" ابر کو کہتے ہیں خواہ اس میں پانی ہو یا نہ ہو اور کبھی لفظ سحاب ذکر کرکے بطور تشبیہ اس سے سایہ اور اندھیرا بھی مراد لیا جاتا ہے ارشاد ہے اَوْ کَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ (یا جیسے اندھیرے گہرے دریا میں چڑھی آتی ہے اس پر ایک لہر اس پر ایک اور لہر اس کے اوپر بادل (یعنی اندھیرا بادل کا اندھیرے میں ایک پر ایک) اصل میں سَحْبٌ کے معنی کھینچنے کے ہیں اسی سے سحاب ہے کیونکہ ہوا اس کو کھینچ کر لے چلتی ہے یا اس لئے کہ یہ پانی کو کھینچ کر لاتا ہے یا اس بناء پر کہ یہ خود اپنی روانی میں کھنچا چلا آتا ہے، اصمعی نے جو لغت وعربیت کے امام ہیں کتاب اسماء السحاب میں لکھا ہے کہ

"سحاب اسم جنس جمعی ہے اس کا واحد سحابۃ ہے یہ مذکر بھی آتا ہے اور مؤنث بھی، مفرد بھی استعمال ہوتا ہے اور جمع بھی"[2]

فرید وجدی لکھتے ہیں

"لفظ کی رعایت سے اس کی صفت مفرد آتی ہے جیسے ارشاد الٰہی وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (اور بادل جو کہ تابعدار ہے اسکے حکم کا درمیان آسمان اور زمین کے) اور معنی کی رعایت سے م

[1] تفسیر فتح القدیر ج ۵ ص ۲۰۸ طبع مصر [2] تاج العروس شرح قاموس

وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ (اور اٹھاتا ہے
بادل بھاری)" [1]

اسی طرح تذکیر کی مثال آیتِ مذکورہ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ اور تانیث کی حَتّٰی اِذَا اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا ہے۔ تانیث جمع ہونے ہی کی وجہ سے ہے، اس کی جمع سُحُبٌ آتی ہے۔

لسان العرب میں ہے، مناسب یہ ہے کہ سُحُبٌ سَحَابٌ کی جمع ہو جو سَحَابَۃٌ کی جمع ہو پس سُحُبٌ جمع الجمع ہوگا۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عمامۂ مبارک کا نام سحاب تھا جو ہوا میں (شملہ کے) اڑنے کے سبب بادل سے تشبیہ کی بنا پر اس نام سے موسوم ہوا۔ [2] پ ۲/۴ پ ۱۳/۹ پ ۲۰/۲

پ ۲۷/۴ سَحَابًا پ ۹/۴ پ ۲۱/۸ پ ۲۲/۱۴

سَحَّارٌ بڑا جادوگر، سِحْرٌ سے بر وزن فَعَّالٌ مبالغہ کا صیغہ ہے پ ۱۹/۴

سُحْتٌ حرام، اصل میں وہ چھلکا جسے جڑ سے اکھیڑ لیا جائے "سحت" ہے اور اسی سے سُحت کا استعمال اس ممنوع فعل کے لیے ہوتا ہے کہ جس کے مرتکب کو عار دامن گیر ہو، گویا وہ اپنے دین و مروت کی جڑ کاٹتا ہے۔ مرتضیٰ زبیدی لکھتے ہیں

"گفتگو میں یہ کبھی مکروہ کے لیے آتا ہے اور کبھی حرام کے لیے اور قرآن سے اس کا پتہ چلتا ہے" [3]

ارشادِ الٰہی ہے اَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (بڑے حرام کے کھانے والے ہیں) میں سحت بمعنی حرام ہے یعنی وہ چیز جو انسان کے دین کا ناس کرنے والی ہے اور حدیث کسب الحجام سحت (پچھنے لگانے والے کی کمائی سحت ہے) میں سحت بمعنی مکروہ ہے یعنی یہ کمائی مروت کو ختم کرنے والی ہے دین کو نہیں۔

کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو اونٹنی کے چارہ اور غلاموں کو کھانا کھلانے میں صرف کرنے کی اجازت دی ہے۔ [4]

پ ۶/۱۰ و ۱۳

سِحْرٌ جادو، جادو کرنا، سَحَرَ يَسْحَرُ کا مصدر ہے یہ مصادرِ شاذہ میں سے [5] ہے۔ علامہ ابن خالویہ

---

[1] دائرۃ المعارف فرید وجدی مادہ سحب [2] پ ۲/۴ [3] تاج العروس شرح قاموس [4] ملاحظہ ہو مفردات امام راغب
[5] روح المعانی ج ۱ ص ۳۰۵

لغوی نے کتاب لیس میں تصریح کی ہے کہ "عربی زبان میں فَعَلَ یَفْعَلُ فِعَلاً کے وزن پر سوائے سَحَرَ یَسْحَرُ سِحْراً اور کوئی مصدر نہیں ہے"[1] لیکن علامہ ابوحیان نے البحر المحیط میں اتنا اور زیادہ کیا ہے کہ "سحر سحرٌ اور فعلٌ کے اور کوئی مصدر بروزن فِعْلٌ فَعَلَ یَفْعَلُ کا نہیں پایا جاتا"[2] شیخ سمین نے بھی یہی کہا ہے[3]۔ امام ابوبکر جصاص رازی، احکام القرآن میں رقم طراز ہیں

"اہل لغت ذکر کرتے ہیں کہ سحر کی اصل لغت میں اس شئے کے لیے ہے جو لطیف ہو اور جس کا سبب مخفی ہو اور سَحَر ان کے نزدیک بالفتح بمعنی غذا ہے کیونکہ وہ مخفی ہوتی ہے اور اس کے مجاری لطیف ہوتے ہیں لبید کہتے ہیں (رضی اللہ عنہ)

ارانا موضعین لامر غیب
ونسحر بالطعام وبالشراب

یہاں نسحر میں دو وجہیں بیان کی گئی ہیں ہم سحر زدہ کی طرح مشغول و فریفتہ تھے دوسرے یہ کہ ہم غذا حاصل کر رہے تھے اور وجہ جو بھی ہو اس کے معنی خفاء کے ہوتے ہیں ایک اور شاعر کہتا ہے۔

فان تسئلینا فیم نحن فاننا
عصافیر من ھذا الانام المسحر

اس بیت کے معنی میں بھی وہی احتمال ہیں جو اول میں ہیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ مُسَحَّر سے ذوسحر (پھیپھڑے والا) مراد لیا ہو. سَحْر پھیپھڑے کو اور جو حلق سے لگا ہو اسے کہتے ہیں اسی سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مابین سَحْرِی ونَحْرِی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے پھیپھڑے اور سینے کے بالائی حصے کے مابین وفات پائی) اور ارشاد الٰہی ہے اِنَّمَا اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ یعنی تم اس مخلوق میں سے ہو جو کھاتی پیتی ہے اور اسی کو آیت شریفہ وَمَا اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (اور تو بھی ایک آدمی ہے جیسے ہم) بتلاتی ہے جس طرح کہ فرمایا ہے مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْکُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ (یہ کیسا رسول ہے کھاتا ہے کھانا اور پھرتا ہے بازاروں میں) نیز یہ بھی احتمال ہے کہ ہماری طرح ذوسحر (پھیپھڑے والا) ہے اور اس قسم کے مقامات پر لفظ سحر کا ذکر ان اجسام کے ضعف و لطافت اور رقت کے سبب

---

[1] تاج العروس شرح قاموس [2] البحر المحیط ج ا ص ۲۱۹ [3] الفتوحات الالٰہیہ بتوضیح تفسیر الجلالین للدقائق الخفیہ مشہور بہ حاشیہ جمل علی الجلالین ج ا ص ۸۷ طبع مصر ۱۳۵۲ھ

کیا جاتا ہے نیز بایں ہمہ اسی کے ذریعہ انسان کا قوام ہے، لہذا جس کی یہ صفت ہو وہ ضعیف و محتاج ہے رہیں وہ معنی جو لغت میں سحر کے آتے ہیں پھر یہ اسم منقول ہو کر ہر اس امر کے لئے استعمال ہونے لگا جس کا سبب مخفی ہو اور اپنی حقیقت کے خلاف اس کا تخیل ہونے لگے نیز ملمع اور دھوکہ بازی کے قائم مقام ہو اور جب بھی یہ لفظ مطلق بلا کسی قید کے استعمال ہوگا اپنے فاعل کی مذمت کو بتائیگا ہاں قید کے ساتھ قابل مدح و ستائش کے بارے میں بھی استعمال ہوا ہے، مروی ہے ان من البیان لسحرا (بعضا بیان تو جادو ہے)[۱]

امام راغب فرماتے ہیں

"سحر طرف حلقوم اور پھیپھڑے کو کہتے ہیں... ...... اور کہا گیا ہے کہ اسی سے سحر کا اشتقاق کیا گیا ہے، اور وہ سحر یعنی گلے اور پھیپھڑے کو نشانہ بنانا ہے، سحر مختلف معانی کے لئے بولا جاتا ہے،

(۱) دھوکہ دینا اور بے حقیقت خیالات کا پیدا کرنا جیسے شعبدہ باز کہ جو کچھ بھی کرتا ہے ہاتھ کی صفائی کی بنا پر نظریں بچا کر کرتا ہے اور جیسے کہ چغلخور ملمع کی باتوں کے ذریعہ جو (دوسری طرف) سے کانوں کو بند کر دیتی ہیں کیا کرتا ہے ارشاد الٰہی سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ (انہوں نے باندھ دیا لوگوں کی آنکھوں کو اور ان کو ڈرایا) اسی کے متعلق ہے، نیز فرمایا ہے یُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ (اس کے خیال میں آئیں ان کے جادو سے) اور اسی نظر سے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ساحر (جادوگر) سے موسوم کیا، وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ (اور کہنے لگے اے جادوگر پکار ہمارے واسطے اپنے رب کو)

(۲) شیطان سے کسی طرح کے تقرب کے ذریعہ اس کی معاونت کا حاصل کرنا، جیسے کہ ارشاد ہے هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ (میں بتلاؤں تمکو کس پر اترتے ہیں شیطان، ہر جھوٹے گنہگار پر) اور اسی کے متعلق فرمایا ہے وَلٰكِنَّ[۲]

(۳) جس کی طرف ان سمجھ (جو بات تک کرنا نہیں جانتے) جاتے ہیں کہ وہ ایک ایسے فعل کا نام ہے جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ اس کی قوت سے صورتوں اور طبیعتوں کو بدلا

[۲] الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (لیکن شیطانوں نے کفر کیا، سکھاتے تھے لوگوں کو جادو)

[۱] احکام القرآن ج ۱ ص ۴۷ طبع مصر ۱۳۴۷ھ

اور انسان کو گدھا بنایا جاتا ہے حالانکہ اہل علم کے
نزدیک اس کی کچھ حقیقت نہیں ہے
اور کبھی سحر سے اس کی خوبی کا تصور ہوتا ہے
چنانچہ کہا گیا ہے ان من البیان لسحرا اور کبھی
کام کی باریکی کا چنانچہ اطبا طبیعت کو ساحرۃ
کہتے اور غذا کو سحر سے موسوم کرتے ہیں کیونکہ
اس کا فعل دقیق اور اس کی تاثیر لطیف ہوتی ہے"
حافظ ابو حیان اندلسی لکھتے ہیں
"سحر کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے بارے میں
مختلف اقوال ہیں،
اول یہ کہ وہ اعیان (حقائق) کا قلب واختراع اور
لوگوں کی صورتوں کا بدل ڈالنا ہے جو کہ معجزات
وکرامات کے مشابہ ہے جیسے کہ ہوا میں اڑنا
اور ایک رات میں مسافتوں کا قطع کر ڈالنا،
دوم یہ کہ دھوکہ بازیاں، بازی گریاں، ملمع سازیاں
اور شعبدہ بازیاں ہیں جن کی کوئی حقیقت
نہیں یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰی (اس
کے خیال میں آتی ان کے جادو سے کہ دوڑتی
ہیں) اسی کو بتلا رہا ہے اور حدیث میں ہے کہ
لبید بن الاعصم نے جب رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم پر سحر کیا تھا تو آپ کے خیال میں یوں
آتا تھا کہ آپ کسی چیز کو انجام دے رہے ہیں
حالانکہ آپ اس کو انجام دیتے نہ تھے، اور
یہ معتزلہ کا قول ہے جن کی رائے میں سحر کی کوئی
حقیقت نہیں ہے شافعیہ میں ابو اسحٰق استرا
بازی بھی انہی کے موافق ہیں،
سوم یہ کہ وہ حیلہ کے طور پر ایسا معاملہ ہے
جو نظر بندی کر دیتا ہے اسی سے ہے سَحَرُوْا
اَعْیُنَ النَّاسِ (انھوں نے باندھ دیا لوگوں
کی آنکھوں کو) حیلہ گروں اور ایک چیز کو دوسری
چیز کے ساتھ ملا دینے والوں اور شعبدہ بازوں
میں اس طرح کی چیزیں ہوتی ہیں جن میں سے
بہت سی باتیں کتاب کشف الدک والشوذ
وایضاح الشک، اور کتاب ارخاء الستور
والکلل فی الشعوزۃ والحیل میں مذکور ہیں، اور
حدیث میں ہے کہ جب مکہ میں چاند کے دو ٹکڑے
ہو گئے تو ابو جہل (علیہ اللعن) کہنے لگا ذرا اتنا
صبر کرو کہ بادیہ نشین لوگ آ لیں اگر وہ اس کی
خبر نہ دیں تو محمد نے (صلوات علیہ وسلامہ)
ہماری آنکھوں پر سحر کیا ہے (یعنی ہماری نظر
بندی کر دی ہے) جب انھوں نے بھی اس
کی خبر دی تو بولا کہ یہ تو بڑا جادو ہے،

چہارم یہ کہ وہ خدمت جن کی ایک قسم ہے اور انہوں نے ہی اسے اپنے اجسام کی جنس لطیف اور اس کی ہیئتوں سے نکالا ہے، چنانچہ وہ لطیف دقیق اور مخفی ہی ہے۔

پنجم یہ کہ وہ ان اجسام سے مرکب ہے جن کو جمع کر کے جلایا جاتا اور ان کی راکھ اور سیاہیاں بنا کر ان پر اسماء، اور عزیمتیں پڑھی جاتی ہیں اور پھر جہاں سحر کی ضرورت پڑتی ہے وہاں انہیں استعمال کیا جاتا ہے۔

ششم یہ کہ اس کی اصل طلسمات اور تلفظریات ہیں جو ستاروں کی خاصیتوں کی تاثیر پر بنائے جاتے ہیں جیسے کہ فرعونی لاٹھیوں کے بارہ میں دھوپ کی تاثیر تھی، یا جو چیز مشکل ہو اس کی سہولت کے لیے شیطانوں سے خدمت لینا۔

ہفتم یہ کہ وہ ان کلمات سے مرکب ہے جو کفر پر مشتمل ہیں۔

ہمارے ایک معاصر کا بیان ہے کہ یہ سب اقوال جو سحر کی حقیقت کے متعلق لوگوں نے بیان کیے ہیں سحر کے اقسام میں سے بعض قسمیں ہیں، اس نے ان کے ساتھ دوسرے انواع شعبدہ، دک (ایک چیز کو دوسری چیز سے ملا دینا) نیز نیرنجات، اوفاق، عزائم اور ردمال ڈالنا، اور اختلال حواس کی قسموں کو بھی شامل کیا ہے

(یہاں تک معاصر کا بیان ختم ہوا)

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سحر موجود تھا کیونکہ قرآن اور حدیث صحیح اس پر ناطق ہیں لیکن اب ہمارے زمانہ میں تمام وہ باتیں جن پر ہم نے کتابوں کے ذریعہ واقفیت حاصل کی ہے کذب و افترا ہیں جن سے کچھ نہیں بنتا، اور قطعی کوئی شے اس میں سے صحیح نہیں اور یہی حال عزیمتوں اور ردمال ڈالنے کا ہے۔ پر وہ لوگ جن کے متعلق یہ اعتقاد کیا جاتا ہے کہ وہ عقل مند ہیں ان باتوں کی تصدیق کرتے اور ان پر کان دھرتے ہیں حالانکہ میں نے بعض ان لوگوں کو جو اپنے کو عالم بتلاتے ہیں یہ دیکھا ہے کہ جب مفلس ہوئے چند کتابیں بنائیں اور اپنے دماغ سے کچھ باتیں ان میں ذکر کر کے بازار میں اچھے داموں انہیں فروخت کر ڈالا۔

اور بعض علماء نے سحر کے اسم کا اطلاق لوگوں کے درمیان چغل خوری کے ذریعہ ادھر کی باتیں اُدھر لگانے پر بھی کیا ہے کیونکہ اس میں بھی دوست کو دشمن سے اور محبوب کو مبغوض سے بدل دینا ہے"[۱]۔

سحر کی حقیقت پر امام ابوبکر جصاص رازی نے احکام القرآن میں اور امام فخر الدین رازی نے

[۱] البحر المحیط ج ۱ ص ۳۲۷ و ۳۲۸ طبع مصر

تفسیر کبیر میں اور علامہ ابن خلدون نے مقدمہ
میں اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے تفسیر فتح
العزیز میں اور شیخ طنطاوی جوہری نے تفسیر
الجواہر میں بڑی سیر حاصل بحثیں لکھی ہیں تفصیل کے
لیے ان کا مطالعہ کافی ہے۔ پ ۱/۱۲ پ ۷/۵ پ ۹/۴ پ ۱۱/۱۳
پ ۱۳/۱ پ ۱۶/۱۲ پ ۱۷/۱ پ ۱۹/۱۶ پ ۲۰/۲ پ ۲۲/۱۱ پ ۲۳/۵ پ ۲۵/۹ پ ۲۶/۱ پ ۲۷/۸،۳
پ ۲۸/۹ پ ۲۹/۱۵

سَحَرٍ پچھلی رات، سحر کا وقت، "سحر" کے معنی اصل
میں پھیپھڑے کے ہیں۔ مجازاً اس کا استعمال
صبح سے کچھ پہلے رات کے اس آخری حصہ کے
لیے ہوتا ہے جب کہ پچھلی رات کی سیاہی دن کی
روشنی سے مل جاتی ہے۔ علامہ زمخشری کا
بیان ہے

"سحر اس کا نام بطور استعارہ پڑا کیونکہ وہ
رات کے جانے اور دن کے آنے کا وقت ہے اس
لیے وہ صبح کے سانس لینے کا مقام ہے"[1]

اَسحَارٌ جمع (ملاحظہ ہو اَسحَار) پ ۲۷/۹

سٰحِرٰنِ دو جادو، سِحرٌ کا تثنیہ بحالت رفع۔
پ ۱۶/۸

سِحْرُکَ تیرا جادو، سِحْرٌ مضاف کَ ضمیر واحد
مذکر حاضر مضاف الیہ پ ۱۶/۱۲

سَحَرُوْا انہوں نے جادو کیا، انہوں نے نظر
بندی کی، (فَتَحَ) سَحْرٌ سے ماضی کا صیغہ
جمع مذکر غائب۔ پ ۹/۴

سَحَرَةٌ جادوگر، سَاحِرٌ کی جمع، پ ۹/۴ پ ۱۶/۱۲ پ ۱۹/۷

سِحْرِہٖ اس کا جادو، سِحْرٌ مضاف ہٖ ضمیر
واحد مذکر غائب مضاف الیہ پ ۱۹/۷

سِحْرِہِمَا ان دونوں کا جادو، سِحْرِ مضاف ہِمَا
تثنیہ مذکر غائب مضاف الیہ پ ۱۶/۱۲

سِحْرِہِمْ ان کا جادو، سِحْرِ مضاف ہِمْ ضمیر
جمع مذکر غائب مضاف الیہ پ ۱۶/۱۲

سُحْقًا دفع ہونا، دور کرنا، مصدر ہے اور
اس کا فعل ثلاثی ہے سَمِعَ اور کَرُمَ
دونوں سے آتا ہے[2] یعنی سَحِقَ یَسْحَقُ بھی
اور سَحُقَ یَسْحُقُ بھی۔ زجاج نے اس کو باب
افعال کا مصدر بتایا ہے۔ یعنی اَسْحَقَ سُحْقًا
ابوعلی فارسی کا بیان ہے کہ قیاس سُحَاقًا ہے
مصدر بحذف زوائد آیا ہے جیسے کہ کہا گیا
ہے ع: وان اھلک فذٰلک کان قدری
(اور اگر میں ہلاک ہوا تو یہی میری تقدیر تھا)

[1] تاج العروس فصل السین باب الرا [2] قاموس

کہ یہاں قدر کے معنے تقدیر کے ہے،

ابوحیان لکھتے ہیں کہ

"مصدر میں ادعاء حذف کی احتیاج نہیں کیونکہ اس کا فعل ثلاثی آیا ہے۔"[1] پ ۱۹

سَحِیْقٌ دور، بعید سُحْقٌ سے بروزن فَعِیْلٌ بمعنے فاعل ہے، پ ۱۷ / ۱۱

فصل الخاء المعجمہ

سَخِرَ اس نے ٹھٹھا کیا، (سَمِعَ) سُخْرٌ سے جس کے معنی ٹھٹھا کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، آیتِ شریفہ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ (اللہ نے ان کو ٹھٹھا کرنے کی سزا دی) میں سَخِرَ کا استعمال حق تعالیٰ شانہ کے لئے بسبب مشاکلت ہے،

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں

"یہ ان کی بداطواری اور اہل ایمان سے استہزاء کے مقابلہ کے طور پر ہے کیونکہ جیسا کام ویسا ہی بدلہ"[2]

امام رازی نے اصم سے اس کے معنے کی تشریح نقل کی ہے،

"مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان منافقین نے جو نیکی کے کام بظاہر انجام دیئے تھے انھیں قبول تو کر لیا مگر ان پر انھیں ثواب نہیں عطا فرمائیگا تو یہ "سخریہ" (ٹھٹھے) ہی کی طرح ہوا"[3] پ ۱۰ / ۱۴

سَخَّرَ اس نے کام میں لگا دیا، اس نے بس میں کر دیا، تَسْخِیْرٌ سے جس کے معنے بس میں کرنے اور زبردستی کسی خاص کام میں لگا دینے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ ۱۳ / ۷ و ۱۲

پ ۱۴ / ۸ پ ۱۷ / ۱۶ پ ۲۱ / ۲ و ۱۲ پ ۲۲ / ۱۴ پ ۲۳ / ۱۵ پ ۲۵ / ۷ و ۱۸

سَخَّرْنَا ہم نے تابع کر دیا، ہم نے بس میں کر دیا، تَسْخِیْرٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم پ ۱۷ / ۶

پ ۲۳ / ۱۱ و ۱۲

سَخَّرْنٰهَا ہم نے اس کو بس میں کر دیا، اس میں ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے، پ ۱۷ / ۱۲

سَخِرُوْا انھوں نے ہنسی کی، انھوں نے ٹھٹھا کیا، سُخْرٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب

پ ۷ / ۷ پ ۱۲ / ۴ پ ۱۷ / ۳

سَخَّرَهَا اس نے اس کو مقرر کر دیا، اس نے اس کو کام میں لگا دیا، اس میں ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے (ملاحظہ ہو

[1] البحر المحیط ج۔۸ ص ۴۰۰ [2] تفسیر ابن کثیر ج۔۳ ص ۳۷۶ طبع مصر ۱۳۶۵ھ

[3] تفسیر کبیر ج۔۴ ص ۴۷۹ ملاحظہ ہو،

سِخرِیّا) پ ۱۸ ع ۵ پ ۲۹ ع ۱۲

سِخرِیّا ٹھٹھا، ہنسی، دل لگی: اسم ہے، واضح رہے کہ یہ سُخرٌ سے جس کے معنے ٹھٹھا کرنے کے ہیں اسم بھی ہو سکتا ہے، اور سَخَرَ یَسخَرُ کا مصدر بھی جس کے معنے مسخر ہونے اور بس میں آنے کے ہیں، اور علامہ زمخشری تفسیر سورہ "مومنون" میں رقمطراز ہیں،

"سُخرِیٌّ پیش کے ساتھ بھی اور زیر کے ساتھ بھی، سُخرٌ کا مصدر ہے سُخرٌ کی طرح سے، مگر یاء نسبت کی بناء پر فعل کی قوت میں زیادتی ہو جاتی ہے، جس طرح کہ خصوص میں خصوصیۃ کہا گیا ہے، اور کسائی و فراء سے منقول ہے کہ کسرہ تو ٹھٹھے سے ہے اور مضموم مسخر کرنے اور غلام بنانے سے یعنی انھوں نے اُن کو مسخر رکھا اور غلام سمجھا، اور پہلا مذہب خلیل اور سیبویہ کا ہے"[1]

علامہ محمود آلوسی، روح المعانی میں فرماتے ہیں

"نافع، حمزہ اور کسائی نے سُخرِیًّا بضم سین پڑھا ہے اور باقی سبعہ نے بکسر سین، اور معنی دونوں صورتوں میں ایک ہی ہیں یعنی ٹھٹھا کرنا، یہ خلیل، ابو زید انصاری، اور سیبویہ کے نزدیک ہے اور ابو عبیدہ، کسائی اور فراء نے مضموم السین کو بمعنے بیگار اُجرت خدمت لینے کے اور مکسور السین کو بمعنے استہزاء کے بیان کیا ہے، اور یونس نے کہا ہے کہ جب خدمت لینا مراد ہو تو سین پر ضمہ (پیش) کے سوا اور کچھ نہ آئیگا، اور جب ہنسی ٹھٹھا کرنا مراد ہو تو ضمہ بھی روا ہے اور کسرہ (زیر) بھی اور دونوں حالتوں میں یہ مصدر ہے جس میں یاء نسبت مبالغہ کے لئے بڑھادی گئی ہے جیسے کہ احمری میں"[2]

ابو علی فارسی کہتے ہیں

"کہ قرأت کسر سین کی زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہ بمعنے استہزاء ہے اور کسرہ اس میں اکثر ہے، اور یہی آیت کے زیادہ لائق ہے دیکھتے نہیں [illegible] ارشاد ہے وَكُنتُم مِّنْهُمْ تَضْحَكُونَ (اور تم ان سے ہنستے تھے)"[3]

پ ۱۸ ع ۶ پ ۲۳ ع ۱۳

سُخرِیّا خدمتگار، تابعدار، علامہ

---

[1] تفسیر الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل ج ۳ ص ۷۵ طبع مصر [2] روح المعانی ج ۱۸ ص ۶۲ طبع منیریہ مصر [3] البحر المحیط ج ۶ ص ۴۲۳ طبع مصر ۱۳۲۸

محمود آلوسی لکھتے ہیں

"سُخْرِیًّا جیسا کہ آپ نے مناسخرۃ کی طرف نسبت ہے جس کے معنی بس میں کرنا اور کام میں لگانے کے ہیں، راغب کہتے ہیں کہ تسخیر مادہ ہے کہ جس پر زبردستی کی جائے اور وہ اپنے ارادے مسخر ہو جائے اور بعض نے خیال کیا ہو کہ یہ یہاں سُخْرِیًّا سے ہے بمعنے استہزاء کے یعنی تاکہ تونگر فقیر پر ٹھٹھا کرے اور ابوحیان نے اس کو بعید بتایا ہے اور سمین نے کہا ہے کہ یہ موقع کے مناسب نہیں" لہ ۲۵/۹

سَخَطٍ غصہ، وہ سخت غصہ جو عقوبت کا مقتضی ہو" سَخَطٌ سے ۳/۸

سَخِطَ وہ غصہ ہوا (سَمِعَ) سَخَطٌ سے جس کے معنی غصہ ہونے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ۶/۱۵

فصل الدال المهملة

سَدًّا آڑ، حائل، دیوار، دو چیزوں کے درمیان آڑ اور حائل کو سَدّ کہا جاتا ہے۔ اصل میں یہ سَدَّ یَسُدُّ کا مصدر ہے۔ جس کے معنے رخنہ کو استوار کرنے اور خلل کو بند کرنے کے ہیں، دیوار، پہاڑ اور بند میں چونکہ یہ صفت موجود ہے اس لیے ان کے لیے بھی سدّ کا لفظ استعمال ہوتا ہے "سد ذوالقرنین" کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی جو تحقیق ہے اس کا اقتباس درج ذیل ہے فرماتے ہیں

"بحر خزر کے مغربی ساحل پر ایک قدیم شہر دربند آباد ہے، یہ ٹھیک اس مقام پر واقع ہے جہاں کاکیشیا کا سلسلۂ کوہ ختم ہوتا اور بحر خزر سے مل جاتا ہے، اس مقام پر قدیم زمانہ سے ایک عریض و طویل دیوار موجود تھی جو سمندر سے شروع ہو کر تقریباً تیس میل تک مغرب میں چلی گئی ہے اور اس مقام تک پہنچ گئی ہے جہاں کاکیشیا کا مشرقی حصہ بہت زیادہ بلند ہو گیا ہے، اس طرح اس دیوار نے ایک طرف بحر خزر کا ساحلی مقام بند کر دیا تھا، دوسری طرف پہاڑ کا وہ تمام حصہ بھی روک دیا تھا جو ڈھلوان ہونے کی وجہ سے قابل عبور ہو سکتا تھا، ساحل کی طرف یہ دیوار دوہری ہے یعنی اگر آذربائجان سے ساحل ہوتے ہوئے آگے

لہ روح المعانی ج ۲۵ ص ۷۲

بڑھیں تو پہلے ایک دیوار ملتی ہے جو سمندر سے برابر مغرب کی طرف چلی گئی ہے اس میں پہلا ایک دروازہ تھا، دروازہ سے جب گذرتے تھے تو شہر دربند ملتا تھا اب یہ صورت باقی نہیں رہی، دربند سے آگے پھر اسی طرح کی ایک دیوار ملتی ہے لیکن یہ دوہری دیوار صرف دو میل تک گئی ہے اس کے بعد اکہری دیوار کا سلسلہ ہے دونوں دیواریں جہاں جاکر ملی ہیں وہاں ایک قلعہ ہے قلعہ تک پہنچ کر دونوں کا درمیانی فاصلہ سو گز سے زیادہ نہیں رہتا لیکن ساحل کے پاس پانچ سو گز ہے اور اسی پانچ سو گز کے عرض میں دربند آباد ہے۔ اس دوہری دیوار کو ایرانی قدیم سے "دو بارۂ" کہتے آئے ہیں یعنی دوہرا سلسلہ۔

اس مقام سے جب مغرب کی طرف کاکیشیا کے اندرونی حصوں میں اور آگے بڑھتے ہیں تو ایک اور مقام ملتا ہے جو درۂ داریال کے نام سے مشہور ہے اور موجودہ زمانہ کے نقشہ میں اس کا محل ولاڈی کیوکز دیونانی کاکیشیا، روسی کیوکز اور فارسی قفقاز ایک ہی لفظ ہے) اور تفلس کے درمیان دکھایا جاتا ہے۔ یہ کاکیشیا کے نہایت بلند حصوں میں سے ہو کر گذرا ہے اور دور تک بلند چوٹیوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہاں بھی قدیم زمانے سے ایک دیوار موجود ہے اور ارمنی روایتوں میں اسے "آہنی دروازہ" کے نام سے پکارا گیا ہے ارمنی زبان میں اس کا قدیم نام "بھاگ کورائی" اور "کاپان کورائی" چلا آتا ہے، دونوں ناموں کا مطلب ہے "گنکور کا درہ" سوال یہ ہے کہ گور سے مقصود کیا ہے؟ کیا یہ گورش کی بدلی ہوئی شکل نہیں ہے جو سائرس (ذوالقرنین) کا اصلی نام تھا جیسا کہ دارا کے کتبہ استخر میں پڑھا جا چکا ہے۔

اب ایک سوال اور غور طلب ہے۔ ذوالقرنین نے جو سد تعمیر کی تھی وہ درہ داریال کی سد ہے یا دربند کی دیوار یا دونوں؟

قرآن میں ہے کہ ذوالقرنین دو پہاڑی دیواروں کے درمیان پہنچا اس نے آہنی تختیوں سے کام لیا، اس نے برابر کا حصہ پاٹ کے برابر کر دیا اس نے پگھلا ہوا تانبا استعمال کیا، تعمیر کی یہ تمام خصوصیات کسی طرح بھی دربند کی دیوار پر صادق نہیں آتیں یہ پتھر کی بڑی بڑی سلوں کی دیوار ہے اور دو پہاڑی دیواروں کے درمیان نہیں ہے بلکہ سمندر سے پہاڑ کے بلند حصے تک چلی گئی ہے اس میں آہنی تختیوں اور پگھلے ہوئے تانبے کا کوئی

نشان نہیں ملتا پس یہ قطعی ہے کہ ذوالقرنین والی سد کا اطلاق اس پر نہیں ہو سکتا،

البتہ درہ داریال کا مقام ٹھیک ٹھیک قرآن کی تصریحات کے مطابق ہے یہ دو پہاڑی چوٹیوں کے درمیان ہے، اور جو سد تعمیر کی گئی ہے اس نے درمیان کی راہ بالکل مسدود کر دی ہے چونکہ اس کی تعمیر میں آہنی سلوں سے کام لیا گیا تھا اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جارجیا میں "آہنی دروازہ" کا نام قدیم سے مشہور چلا آتا ہے اسی کا ترجمہ ترکی میں "دامر کپو" مشہور ہو گیا، بہر حال ذوالقرنین کی اصلی سد یہی سد ہے[1] (ملاحظہ ہو ذَا الْقَرْنَيْنِ) ۱۶/۲ ، ۲۲/۱۸

سِدْرٌ بیری کا درخت، راغب لکھتے ہیں "سدر ایسا درخت ہے جو کھانے میں ناکارہ ہوتا ہے، اسی لئے ارشاد ہوتا ہے وَاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ (اور جھاؤ اور کچھ بیر تھوڑے سے) اور چونکہ اس کے کانٹے جھاڑ کر اس کے نیچے سایہ حاصل کیا جاتا ہے اس لئے یہ ارشاد الٰہی فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ (بیری کے درختوں میں جن میں کانٹا نہیں ہے) میں یہ جنت کے سایہ اور اسکی مثال قرار دیا گیا کہ سایہ حاصل کرنے کے لئے بہت کافی ہوتا ہے، ۲۲/۸ ، ۲۷/۱۴

سِدْرَةٌ بیری کا درخت، واحد ہے سِدْرٌ جمع ۲۷/۵

سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى سدرۃ المنتہٰے، پرلے حد کی بیری، "سدرۃ المنتہٰے کیا ہے، انسانی فہم و ادراک کی اخیر سرحد پر ایک درخت، اکابر تابعین سے یہی روایت طبری نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کی ہے[2] یہی وہ مقام ہے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فیوض ربانی اور نعمائے صمدانی سے مخصوص فرمایا گیا تھا، ۲۷/۵

سُدُسٌ چھٹا حصہ، اسم عدد ہے، اَسْدَاسٌ جمع، ۴/۱۳

سُدًى بے قید، مہمل کہ نہ کسی بات پر مامور ہو اور نہ کسی چیز سے اسے روکا جائے، اِسْدَاءٌ سے جس کے معنے مہمل چھوڑ دینے کے ہیں اسم ہے واحد اور جمع دونوں کے لئے مساوی طور پر مستعمل ہے، ۲۹/۱۸

سَدِيْدًا سیدھا، سَدَادٌ سے جس کے

[1] ملاحظہ ہو ترجمان القرآن ج ۲ ص ۴۲۷ و ۴۲۸ و ۴۲۹ طبع مدینہ پریس بجنور [2] سیرۃ النبی ج ۳ ص ۴۲۵

طبع معارف پریس اعظم گڈھ [illegible]

معنے درست وراست ہونے کے ہیں بروزن
فَعِیْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ، پ ۱۲/۴ پ ۶/۲۲

سَدَّیْنِ دو پہاڑ، دو آڑ، سَدٌّ کا تثنیہ
بحالت نصب وجر، (ملاحظہ ہو سَدًّا) پ ۱۶

فصل الراء المهملة

سِرًّا چھپی ہوئی بات، بھید، راز، دل میں
جو بات چھپی ہوا سے "سِرّ" کہتے ہیں، اَسْرَار
جمع واضح رہے بطور کنایہ اور مجاز کے لفظ
سِرّ کا استعمال جماع، نکاح، نکاح کرنے
کا اظہار کرنے نیز زنا کے لئے بھی ہوتا ہے،
چنانچہ آیۃ شریفہ لَا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا ان سے
نکاح کا وعدہ نہ کرو (چھپ کر) میں سِرّ کو ابن
السیدہ نے نکاح کا کنایہ بتایا ہے اور مجاہد
وفراء نے زمانۂ عدت میں نکاح کی بات
چیت کرنے کے معنے لئے ہیں اور ابو الہیثم،
حسن بصری ابو مجلز نے زنا سے تفسیر کی ہے[1]
پ ۱۰/۱۶ پ ۱۶/۱۸ سِرًّا پ ۱۴/۲ پ ۹/۳ پ ۹/۱۳ پ ۱۶/۱۴ پ ۱۶/۲۲

سَرَّاءِ نعمت، فراخی، خوشی، اصل میں عامۃ
شادمانی کا نام "سَرَّاء" ہے پ ۵/۴ پ ۲/۹

سَرَابٍ چمکتی ہوئی ریت، سراب، شدت
گرما میں دوپہر کے وقت دھوپ کی تیزی
سے میدان میں جو ریت پانی کی طرح چمکتی
ہوئی نظر آتی ہے اور دور سے ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ پانی بہ رہا ہے اور مکانات
اور درختوں کا عکس اس میں دکھائی دے
رہا ہے، اسے "سراب" کہتے ہیں چونکہ
اکثر اس کے نظر پڑنے سے پانی کا دھوکہ
ہو جاتا ہے اس لئے سراب دھوکہ
اور فریب کے لئے ضرب المثل ہے
پ ۱۸/۱۱ سَرَابًا پ ۳۰

سَرَابِیْلَ کرتے، قمیصیں، پیراہن،
سِرْبَال کی جمع "سربال" قمیص کو کہتے
ہیں وہ کسی قسم کی بھی ہو، پ ۱۴/۱۴

سَرَابِیْلُهُمْ ان کے کرتے، ان کے
پیراہن، سَرَابِیْلُ مضاف، هُمْ ضمیر
جمع مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۱۳/۱۹

سِرَاجًا چراغ، دیا، مجازًا
آفتاب اور ہر روشن چیز
کے لئے بھی اس کا استعمال

[1] تاج العروس

ہوتا ہے سُرِّحُوْهُنَّ ۲/۲۳۱، ۲۳/۲۲، ۲۸/۹، ۳۰/۱

سَرَاحًا رخصت کرنا، چھوڑنا، تسریح سے جس کے معنی طلاق دینے کے ہیں، اسم ہے، جیسے تبلیغ سے بلاغ ہے۔ ابو جعفر بیہقی نے تاج المصادر میں لکھا ہے کہ:-

"اس مقام پر تحقیق یہ ہے کہ سراح، سلام کلام اسماء ہیں بر وزن فعال جو مصدر کے معنی دیتے ہیں۔

راغب لکھتے ہیں کہ

"ارشاد الٰہی وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا (اور رخصت کر دو بھلی طرح سے)" تسریح ابل (اونٹوں کو چرنے کے لیے چھوڑنا) سے مستعار ہے۔ جیسے کہ طلاق "اطلاق ابل" (اونٹوں کے پائے بند کھولنا) سے مستعار ہے"

(ملاحظہ ہو تسریح) ۲/۲۱، ۲۲/۳

سُرَادِقُهَا اس کے قناتیں سرادق مضاف ھا ضمیر واحد مونث غائب مضاف الیہ۔ علامہ ابو السعادات مبارک بن الاثیر جزری نے لکھا ہے کہ "ہر وہ شئے جو کسی شے کا احاطہ کئے ہوئے ہو، خواہ چار دیواری ہو یا شامیانہ یا خیمہ وہ سرادق" ہے[1]۔ امام سیوطی الاتقان میں فرماتے ہیں۔

"جوالیقی کا بیان ہے کہ یہ فارسی ہے معرب اصل میں سرادر تھا بمعنی (درسرا) دہلیز کے اور دیگر حضرات یہ کہتے ہیں یہ فارسی کا "سراپردہ" ہے" [2]

اور علامہ زبیدی نے تاج العروس میں جوالیقی سے یہ نقل کیا ہے کہ "یہ سرادر" یا "سراطاق" کا معرب ہے، لیکن طاق خود معرب ہے

راغب اصفہانی مفردات میں رقمطراز ہیں،

"سُرَادِق فارسی ہے معرب اور کلام عرب میں کوئی ایسا مفرد اسم نہیں ہے کہ جس کا تیسرا حرف الف ہو اور الف کے بعد دو حرف ہوں"

علامہ محمود آلوسی نے لکھا ہے کہ:-

"اس کے معرب ہونے کے بارے میں تو راغب نے صحیح کہا کیونکہ عامہ اہل لغت اسی پر ہیں لیکن یہ جو کہا ہے کہ کلام عرب میں الخ تو علا بطے،

---

[1] النہایہ فی غریب الحدیث والاثر

[2] الاتقان ج ۱ ص ۱۳۸ طبع مصر ۱۳۴۳ھ

قرامص، جناذف، حلاحل کا آنا اس
کی تکذیب کرتا ہے حالانکہ سب کے سب
سرادق کے وزن پر ہیں اور ایسے الفاظ بہت
ہیں۔ باوجود اس کثرت کے ایسے فاضل سے
غفلت ہوجانا بعید ہے اس لیے غور کرنا چاہیے
کہ ان کی مراد کیا ہے؟[۱]

امام احمد، امام ترمذی اور امام ابن جریر طبری نے
حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت
کی ہے کہ "سرادق نار" (سراپردہ آتش) کی چار
دیواریں ہیں اور ہر دیوار کی موٹائی چالیس سال
کی مسافت کے بقدر ہے[۲] سُرَادِقَاتٌ جمع
ہے۔ سیبویہ کا بیان ہے کہ جب اس کو کسرہ
نہ دیا گیا تو باوجود مذکر ہونے کے اس کی جمع تا
کے ساتھ لائے[۳]۔ پ ۱۵/۱۶

سِرَاعًا دوڑتے ہوئے، جلدی کرتے ہوئے،
دوڑنے والے، جلدی کرنے والے، سَرِیْعٌ
کی جمع جو کہ سُرْعَۃٌ سے ہے، جس کے معنی جلدی کرنے
کے ہیں بروزن فَعِیْلٌ بمعنے فاعل ہے جس
طرح کہ کِرَام کَرِیْم کی جمع ہے۔[۴] پ ۲۶/۱۷ پ ۲۹/۸

سَرَائِرُ بھید، راز، پوشیدہ باتیں سَرِیْرَۃٌ کی
جمع علامہ ابن خالویہ لغوی لکھتے ہیں،
"یا" کو جمع میں ہمزہ کر دیا گیا حالانکہ واحد میں ہمزہ
نہ تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ جمع میں یا سے قبل
الف ہے جو ساکن ہے، اب دو ساکن جمع ہوئے
تو انہوں نے "یا" کو ہمزہ سے بدل کر التقاء
ساکنین کی بنا پر اس کو کسرہ دے دیا اور
اسی طرح سے ہے قَبِیْلَۃٌ اور قَبَائِلُ
اور اگر "یا" اصلی ہوتی جیسے کہ مَعِیْشَۃٌ میں
ہے تو جمع میں اسے ہمزہ نہ کیا جاتا ارشاد ہے
وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ[۵]
پ ۳۰/۱۱

سَرَابًا فریب، آسْرَابٌ جمع پ ۱۵/۲۱
سَرِّحُوْهُنَّ تم ان عورتوں کو رخصت کر دو،
تم ان عورتوں کو چھوڑ دو، سَرِّحُوْا تَسْرِیْحٌ
سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر هُنَّ
ضمیر جمع مونث غائب (ملاحظہ ہو تَسْرِیْحٌ)
پ ۲۲/۳ ۱۳

سَرْدِ کڑیاں جوڑنا، زرہیں بنانا، سَرَدَ

۱ روح المعانی ج ۱۵ ص ۲۴۶ طبع مصر ۲ تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۸۱ طبع مصر [illegible] ۳ تاج العروس ۴ تفسیر کبیر سورہ ق
ج ص ۴ ۶۲ ۵ اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن العظیم ص ۴۹ طبع دار الکتب المصریہ

یشرح کا مصدر ہے، نیز کڑیوں کے لئے بطور اسم
بھی مستعمل ہے، ۲۳/۱۸

سُرُرٌ تخت، سَرِیْرٌ کی جمع ہے، راغب لکھتے ہیں
"سریر یعنی جس پر سرور سے بیٹھا جائے
کیونکہ یہ ارباب نعمت کے ہی پاس ہوتا ہے
اس کی جمع، اَسِرَّۃٌ اور سُرُرٌ ہے، ۱۴/۴
۲۳/۹ ۲۶/۱۲ ۳۰/۱۳

سُرُدًا ۲۵/۹

سَرَقَ اس نے چوری کی، (ضرب) سَرِقَۃٌ
سے جس کے معنے چوری کرنے کے ہیں ماضی کا
صیغہ واحد مذکر غائب، راغب لکھتے ہیں
"سرقۃ کے معنی ہیں پوشیدہ طور پر اس
چیز کا لینا جس چیز کو لینے کا حق نہ ہو، اور
شرع میں یہ کسی شے کے مخصوص جگہ سے اور
مخصوص مقدار میں لے لینے کے لئے مستعمل
ہے" ۱۳/۴ و ۴

سِرَّکُمْ تمہارا بھید، تمہارا چھپا، سِرٌّ مضاف
کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، (ملاحظہ
ہو سِرٌّ) ۶/۳

سَرْمَدًا ہمیشہ، دائم، علامہ زمخشری،
کشاف میں رقمطراز ہیں
"سرمد کے معنی دائم و متصل کے ہیں، سَرْدٌ
سے ماخوذ ہے جس کے معنے متابعت یعنی پے
بہ پے اور لگاتار ہونے کے ہیں، اسی سے ماہ
ہائے حرام کے بارے میں عرب کا محاورہ
ہے ثلاثۃ سرد و واحد فرد (تین یعنی ذی
قعدہ، ذی حجہ، محرم، پے بہ پے ہیں اور ایک
یعنی رجب یکہ ہے) اور میم زائد ہے، اس کا
وزن فَعْمَلٌ ہے اور اس کی نظیر دُلامص
ہے دلاص سے [1]

اور بعض نحویوں کا مختار یہ ہے کہ میم اس
میں اصلی ہے اور اس کا وزن فَعْلَلٌ ہے،
کیونکہ درمیان میں میم کی زیادتی قیاس سے
نہیں کی جاتی ہے [2]، قاضی شوکانی نے اسی کو
ظاہر بتایا ہے [3]، ۲۰/۱

سُرُوْرًا سرور، جو خوشی اندر چھپ رہی ہو
اس کا نام "سرور" ہے، یہ سَرَّ یَسُرُّ کا مصدر
ہے، علامہ مرتضےٰ زبیدی، بعض اہل لغت سے ناقل ہیں کہ

---

۱ تفسیر کشاف ج ۳ ص ۱۸۱ طبع مصر ۱۳۵۴ھ ۲ روح المعانی ج ۲۰ ص ۹۳ ۳ فتح القدیر ج ۴
ص ۱۷۸ طبع مصر ۱۳۵۰ھ

"سرور" کی حقیقت یہ ہے کہ فقط قلب میں
التذاذ (مزہ پانا) وانشراح (کھلنا) حاصل
ہوتا ہے بغیر اس کے کہ ظاہر میں اس کا کوئی اثر ہو
اور "حبور" وہ ہے جس کا اثر ظاہر میں دکھائی
دیتا ہے" [۱]

سِرَّهُمْ ان کا بھید، ان کا راز، سِرّ مضاف
هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۱۴ ع ۱۳
سَرِيًّا ایک چشمہ، اَسْرِيَةٌ اور سَرِيَاتٌ جمع،
جیسے کہ رَغِيفٌ کی جمع اَرْغِفَةٌ اور رُغْفَانٌ
ہیں، تاج العروس میں ہے،
"سَرِيٌّ غَنِيٌّ کی طرح سے بمعنے نہر ہے ثعلب
نے یہی کہا ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ بمعنے
جدول ہے یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما
کا بیان ہے، اور یہی اہل لغت کا قول ہے چنانچہ
انھوں نے اس کی تفسیر اس چھوٹی نہر سے کی
ہے جو نخلستان کی طرف رواں ہو"
علامہ آلوسی لکھتے ہیں
"جدول کو سری سے اس لئے موسوم کیا
کہ پانی اس میں سیر کرتا یعنی رواں ہوتا ہے
اس معنی کے اعتبار سے اس کا لام کلمہ یا ہے

حسن بصری، ابن زید اور جبائی سے مروی
ہے کہ سری سے عیسےٰ علیہ السلام مراد ہیں
اور یہ سرو سے بمعنی رفعت ہے جیسا کہ راغب
نے کہا ہے، اس صورت میں آیہ شریفہ قَدْ
جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا کے معنی ہوں گے)
یعنی تیرے رب نے تیرے نیچے ایک رفیع الشان
بلند مرتبت لڑکا کردیا ہے اور صحاح میں اس
کے معنے مروت کے ساتھ سخاوت کے مرقوم
ہیں پر رفعت مراد لینا قدر کے اعتبار سے زیادہ
اونچا ہے، اور اس معنے کے لحاظ سے لام
کلمہ واو ہے" [۲] پ ۱۶

سَرِيْعٌ جلد کرنے والا، سُرْعَةٌ سے جس کے
معنے جلدی کرنے کے ہیں بروزن فَعِيْلٌ بمعنے
فاعل صفت کا صیغہ ہے، قاموس میں ہے
"اللہ عزوجل کے "سریع الحساب"
ہونے کے یہ معنے ہیں کہ اس کا حساب
لینا لامحالہ واقع ہو کر رہے گا یا ایک حساب
اس کو دوسرے حساب سے اور ایک شئے اس
کو دوسری شئے سے ہٹا کر اپنی طرف
مشغول نہیں کر سکتی"، .....

[۱] تاج العروس [۲] روح المعانی ج ۱۶ ص ۷۶

یا اس کے افعال جلد ظہور میں آتے ہیں اور جو وہ ارادہ فرماتے ہیں اس میں کسی بات کی دیر نہیں لگتی، کیونکہ اس کا ہر فعل بغیر کسی چیز کے ارتکاب اور کوشش کے واقع ہوتا ہے۔ پس حق سبحانہ تمام خلق سے ان کے جی اٹھنے اور جمع ہو جانے کے بعد ایک لحظہ میں بغیر کسی قسم کے شمار لگانے اور رکاوٹ کے حساب فرمالیں گے وَهُوَ أَسْرَعُ الْحَاسِبِينَ اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

راغب لکھتے ہیں:-

"فرمان الٰہی إِنَّ اللّٰهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ (اور بے شک اللہ جلد لیتا ہے حساب) اور سَرِيعُ الْعِقَابِ (جلد عذاب کرنے والا ہے) یہ تنبیہ ہے اس پر جس کے متعلق ارشاد ہے إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (اس کا حکم یہی ہے کہ جب کرنا چاہے کسی چیز کو تو کہے اس کو ہو وہ اسی وقت ہو جائے)" پ ۲/۹ پ ۳/۱۰

پ ۴/۱۲ پ ۶/۵ پ ۸/۷ پ ۹/۱۱ پ ۱۳/۱۲و۱۹ پ ۱۸/۱۱ پ ۲۴/۷

فصل الطاء المهملة

سُطِحَتْ وہ بچھائی گئی (فتح) سَطْحٌ جس کے معنے بچھانے کے ہیں۔ ماضی مجہول کا صیغہ واحد مونث غائب۔ پ ۳۰/۱۳

فصل العين المهملة

سَعَتِهٖ اس کی وسعت، اس کی گنجائش، سَعَتِ مضاف، ہ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ (ملاحظہ ہو سَعَةٍ) پ ۵/۱۲

پ ۲۸/۱۷

سُعِدُوْا وہ نیک بخت بنائے گئے، (فتح) سَعْدٌ سے جس کے معنی نیک بخت کرنے کے ہیں۔ ماضی مجہول کا صیغہ مذکر غائب

علامہ ابوجعفر بیہقی تاج المصادر میں لکھتے ہیں "سَعْدٌ اور سَعُوْدٌ کے معنے نیک بخت ہونے کے ہیں، کہا جاتا ہے، سَعِدَ يَوْمُنَا (ہمارا دن مبارک ہوا) نیز سَعْدٌ کے معنے ہیں نیک بخت کرنے کے اور اس معنی میں اہل لغت نے اختلاف کیا ہے۔ زجاج، ازہری اور فارابی نے تو اس کو جائز رکھا ہے اور ارشاد الٰہی وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا (اور لیکن جو لوگ نیک بخت کیے گئے) سے جو بضم سین ہے استدلال کیا ہے اور سیبویہ نیز محققین اہل

لغت نے اس سے انکار کیا ہے ان کا بیان
ہے کہ (اس معنے میں) عرب کا محاورہ اَسْعَدَہُ
اللہُ ہے، اور یہ روا نہیں کہ سُعِدُوْا اِسْعَادَۃً
سے (معنی نیک بخت ہونا) کیونکہ سَعَادَۃٌ
شَقَاوَۃٌ کی طرح سے لازم ہے اور اس قرأت
کے بارے میں سیبویہ نے کہا ہے کہ یہ لغت
قیاس سے خارج ہے یا باب فعل اور فعلتہ
سے ہوگی (یعنی لازم بھی اور متعدی بھی) جیسے کہ
غَاضَ (وہ گھٹ گیا) اور غِضْتُہٗ (میں نے
اس کو گھٹا دیا) ہے اور اسی طرح سے سَعَدَ
(وہ نیکبخت ہوا) اور سَعَدْتُہٗ (میں نے
اس کو نیک بخت کیا) ہیں۔ اور مَسْعُوْدٌ میں
ان کے لیے کوئی دلیل نہیں، کیونکہ جائز ہے یہ
مثل اَجَنَّہُ اللہُ فَھُوَ مَجْنُوْنٌ کے ہو (یعنی باب
اِسْعَادٌ سے مستعمل ہو) پ ۱۲/۹

سُعُرٌ سودا، جنون، بے عقلی، علامہ سمین
لکھتے ہیں

"سُعُرٌ مفرد بھی ہو سکتا ہے یعنی جنون کے کہا
جاتا ہے نَاقَۃٌ مَسْعُوْرَۃٌ یعنی اپنی رفتار میں
دیوانی سی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سَعِیْرٌ
کی جمع ہو جس کے معنی نار یعنی آگ کے ہیں اور دونوں
احتمال منقول ہیں" ۱؎

اصل میں سَعْرٌ کے معنی آگ بھڑکانے کے ہیں جب
انسان کے دماغ میں گرمی بھڑک اٹھتی ہے تو
وہ پاگل ہو جاتا ہے سُعُرٌ کا استعمال سودا اور
جنون کے معنی میں اسی اعتبار سے ہے۔

پ ۲۷/۱۰۹۹

سُعِّرَتْ وہ دہکائی گئی، وہ بھڑکائی گئی تَسْعِیْرٌ
سے جس کے معنی سخت آگ دہکانے کے
ہیں، ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب

پ ۳۰/۴

سَعَوْا وہ لپکے، انہوں نے کوشش کی
سَعْیٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب (ملاحظہ
ہو سَعٰی) پ ۱۷/۱۳ پ ۲۲/۲

سَعَۃٌ کشائش، فراخی، وسعت، طاقت،
پہنچ، یہ وَسِعَ یَسَعُ کا مصدر ہے۔ جس کے
معنے فراخ ہونے کے ہیں، اس کی تا واو کے
بدلے میں ہے عِدَۃٌ اور زِنَۃٌ کی طرح اول
سے واو کو حذف کر کے آخر میں اس کے عوض
تا لے آئے ہیں، راغب لکھتے ہیں۔

۱؎ حواشی سلیمان جمل علی الجلالین ج ۴ ص ۲۴۷ طبع مصر ۱۳۵۲ھ

"سَعَۃٌ" کا استعمال امکنہ (مقامات) کے لئے
بھی ہوتا ہے اور حالت کے لئے بھی اور فعل
کے لئے بھی، جیسے کہ قُدْرَۃٌ اور جُوْدٌ وغیرہ
الفاظ ہیں، چنانچہ مکان کے بارے میں جیسے
ارشاد ہے اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَۃٌ (میری زمین
کشادہ ہے) اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً
(کیا نہ تھی زمین اللہ کی کشادہ) اور حالت کے
بارے میں فرمانِ الٰہی ہے لِیُنْفِقْ ذُوْ سَعَۃٍ
مِّنْ سَعَتِہٖ (چاہیے خرچ کرے وسعت والا
اپنی وسعت کے موافق) اور ارشاد ہے عَلَی
الْمُوْسِعِ قَدَرُہٗ (اور مقدور والے پر اس کے
موافق ہے)"

آیت کریمہ وَمَنْ یُّھَاجِرْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ یَجِدْ
فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا کَثِیْرًا وَّسَعَۃً (اور جو
کوئی وطن چھوڑے اللہ کی راہ میں پاوے گا اس
کے مقابلہ میں جگہ بہت اور کشائش) کے بارے
میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ربیع
بن انس اور ضحاک سے مروی ہے کہ اس
سے وسعتِ رزق مراد ہے اور قتادہ سے
روایت کیا گیا ہے کہ اظہارِ دین کی طاقت
مراد ہے کیونکہ ان کو مشرکین کی جانب سے
دین کے معاملے میں سخت تنگی لاحق رہتی
تھی کہ اظہارِ دین سے روکتے تھے[1]، پ ۲/۱۶

پ ۵/۱۱، پ ۱۸/۹، پ ۲۸/۱۷

سَعٰی قصد کرنا، کام کرنا، چلنا، دوڑنا
کمانا، سَعٰی یَسْعٰی کا مصدر ہے یہ سب معانی قاموس
میں منقول ہیں، اور امام راغب، مفردات
میں فرماتے ہیں

"سَعْیٌ کے معنے "مَشْیٌ سَرِیْعٌ" (تیز روی
لپکنے) ہیں، جو عَدْوٌ (دوڑنے) سے کم ہے
اور کسی معاملہ میں کوشش کے لئے استعمال کیا
جاتا ہے خواہ خیر ہو یا شر...... اور بیشتر سعی
کا استعمال اچھے کاموں کے بارے میں ہوتا
ہے۔" پ ۱۵/۲، پ ۲۳/۷

سَعْیًا پ ۳/۲

سَعٰی اس نے کوشش کی، وہ دوڑا، اس نے
کمایا، سَعْیٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب پ ۱/۱۴
پ ۲/۹، پ ۱۵/۲، پ ۲۷/۷، پ ۳۰/۴

سَعِیْدٌ نیکبخت، سَعَادَۃٌ جس کے معنے نیکبخت
ہونے کے ہیں بروزن فَعِیْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ پ ۱۲/۹

[1] احکام القرآن از امام جصاص رازی ج ۱۰ ص ۳۰۶ طبع مصر ۱۳۴۷ھ

سَعِیْرٌ دہکتی ہوئی آگ، دوزخ سعرٌ سے جس
کے معنے آگ بھڑکانے کے ہیں بروزن فَعِیْلٌ
بمعنے مَفْعُوْلٌ ہے (ملاحظہ ہو جَحِیْم) پ۸/۱۷ پ۱۲/۲۱
پ۸و۱۳/۲۲ پ۲/۲۵ پ۱/۲۹

سَعِیْرًا پ۱۲/۴ پ۵/۵ پ۱۱/۱۵ پ۱۷/۱۸ پ۵/۲۲ پ۱۰/۲۶ پ۱۹/۲۹
پ۹/۳۰

سَعْیُکُمْ تمہاری کمائی، تمہاری کوشش،
سَعْیٌ مضاف کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف
الیہ پ۱۹/۲۹ پ۱۷/۳۰

سَعْیَہٗ اس کی کمائی، اس کی کوشش، سَعْیٌ
مضاف، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ
پ۷/۱۷ پ۷/۲۷

سَعْیَھَا اس کی کمائی، اس کی دوڑ، سَعْیٌ
مضاف ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف
الیہ پ۲/۱۵ پ۱۳/۳۰

سَعْیُھُمْ ان کی دوڑ، ان کی کوشش، سَعْیٌ
مضاف ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، پ۲/۱۵ پ۲/۱۶

فصل الفاء

سَفَاھَۃٌ بے عقلی، بیوقوفی، جہالت، سَفِہَ
یَسْفَہُ کا مصدر ہے، پ۱۶/۸

سَفَرٌ سفر، وطن کی مسافت قطع کرنے کا
نام "سفر" ہے اَسْفَارٌ جمع، اصل میں سَفْرٌ
کے معنے پردہ ہٹانے اور متفرق کرنے کے ہیں
سفر کو سفر اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ اس
میں یہ دونوں معانی محفوظ ہیں، علامہ ابن سیدہ
محکم میں لکھتے ہیں۔

"اس نام سے یہ اس لئے موسوم ہوا کہ جس طرح
ہوا سوکھے پتوں کو لاتی اور لیجاتی متفرق کرتی ہے
اسی طرح سفر میں بھی آمد و رفت ہوتی ہے"[۱]

اور امام ابو منصور ازہری، تہذیب میں رقمطراز ہیں
"سفر کا نام سفر اس لئے پڑا کہ وہ مسافروں
کے رخ اور ان کے اخلاق کو ظاہر کرتا ہے اور
جو بات ان میں چھپی ہوتی ہے اسے کھول دیتا ہے"[۲]
اور اصطلاح شرع میں سفر سے خاص قسم کی
قطع مسافت مراد ہے جس سے احکام شرعیہ
متغیر ہو جاتے ہیں[۳]، ائمہ احناف کے نزدیک
"جس سفر سے احکام متغیر ہوتے ہیں وہ یہ
ہے کہ انسان تین دن رات کی مسافت کا ارادہ
کرے . . . .

[۱و۲] تاج العروس [۳] سفر سے جو احکام متغیر ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں، نماز کا قصر کرنا،

مسافت اونٹ کی رفتار سے ہو یا پیادہ روی سے
یہ چال درمیانی ہو" ؎۱

اور یہی قول امام سفیان ثوری اور امام حسن بن صالح
کا ہے؎۲. امام ابوبکر احمد بن علی جصاص رازی فرماتے
ہیں :-

"لغت میں سفر کی کوئی حد معلوم نہیں کہ جس
سے فرق ہو سکے کہ کم سے کم سفر یہ ہے
اور اس کے علاوہ یہ ہے پس جب لغت کا معاملہ
یہ ٹھیرا، اور علما اس پر متفق ہیں کہ جو سفر افطار
کو مباح کرتا ہے اس کی مقدار شرع میں معلوم
ہے. ہاں اس مقدار کے بارے میں وہ باہم
مختلف ہیں، ہمارے اصحاب (حنفیہ)
تین دن اور تین رات کی مسافت بتاتے ہیں
اور دوسرے دو دن کی مسافت اور اور لوگ
ایک ہی دن کی مسافت اور لغت کا اس بارے
میں کوئی حصہ نہیں کیونکہ اس میں کم سے کم
سفر کی کسی وقت کے ساتھ اس طرح
تحدید ہے ہی نہیں کہ جس سے کم کرنا جائز نہ ہو
کیونکہ وہ ایسا اسم ہے جو عادت سے ماخوذ ہے اور
ہر وہ چیز جس کا حکم عادت سے ماخوذ ہو اقل قلیل
سے اس کی تحدید ناممکن ہے۔

نیز یہ بیان کیا گیا ہے کہ سَفَر، سَفْرٌ سے مشتق
ہے جس کے معنے کھولنے کے ہیں. عرب کے اس
محاورہ سے ہے سفرت المرأة عن
وجهها (عورت نے اپنا چہرہ کھولا) اور اسفر
الصبح (صبح روشن ہوئی) اور سفرت الريح
السحاب ہوا نے بادل کو کھول دیا اور مِسْفَرَةٌ
جھاڑو کے معنی میں ہے کیونکہ وہ مٹی کو جھاڑ کر
زمین کو کھول دیتی ہے اور اسفر وجهه اس کا
چہرہ تابناک اور روشن ہو، اور اسی سے ارشادِ
الٰہی ہے وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ کتنے
چہرے اس دن روشن ہیں (یعنی تاباں و درخشاں
ہیں، پس کسی دور مقام کی طرف جانے کو سفر سے
موسوم کیا گیا، کیونکہ وہ مسافر کے اخلاق و احوال کو
کھولتا ہے۔

اور معلوم ہے کہ جب سفر کے معنی وہ ہوئے

؎۱ ہدایہ باب صلاۃ المسافر ؎۲ احکام القرآن از جصاص ج ۲ ص ۳۱۲ طبع مصر ۱۳۴۷ھ

؎۳ (بقیہ حاشیہ ص ۲۲۳) روزے کے افطار کا مباح ہونا، موزوں پر مسح کی مدت کا تین دن تک بڑھ جانا، جمعہ عیدین اور قربانی کے وجوب کا ساقط ہوجانا، بغیر محرم کے آزاد عورت کے نکلنے کا حرام ہونا، (ملاحظہ ہو عنایہ شرح ہدایہ از علامہ اکمل الدین بابرتی ج ۱ ص ۳۹۲

جو ہم نے بیان کیے تو یہ تھوڑے سے وقت اور ایک دن اور دو دن میں واضح نہیں ہوسکتے کیونکہ اکثر اس قسم کی مسافت کا ارتکاب کیا جاتا اور اس میں اس کے اخلاق کی وہ باتیں ظاہر نہیں ہوپاتیں کہ جن کو دور کا سفر کھول کر رکھ دیتا ہے۔

پھر اگر عادت کا اعتبار کیا جائے تو ہم یہ جانتے ہیں کہ قریب کی مسافت کو سفر نہیں کہا جاتا اور دور کی مسافت کا نام سفر ہے۔ ہاں اس پر سب متفق ہیں کہ تین دن رات کی مسافت سفرِ صحیح ہے کہ جس کے بارے میں احکام شرع متعلق ہیں۔ پس تین دن رات کی مسافت کا سفر ہونا تو ثابت ہو گیا اور اس سے کم کا سفر ہونا ثابت نہیں کیونکہ سفر کے معنے اس میں معدوم اور توقیف (اس سے واقف کرانا) اور اس کی تحدید پر اتفاق مفقود ہے۔

نیز نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایسی حدیثیں مروی ہیں جو چاہتی ہیں کہ احکام شرع میں سفر کے ہونے میں تین دن کی مسافت کا اعتبار ہو۔ پس جملہ ان کے ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی صلعم نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی عورت بغیر اپنے محرم کے تین دن کا سفر کرے[1] پ ۲ ع ۳ پ ۵ ع ۶ پ ۶ ع ۱۵/۲۱

سَفَرًا پ ۱۰/۱۲

سَفَرِنَا ہمارا سفر، سَفَرِ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ۔ پ ۱۵/۱۲

سَفَرَةٍ لکھنے والے، سَافِرٌ کی جمع ہے جیسے کَتَبَةٌ کَاتِبٌ کی جمع۔ واضح ہے کہ سَفَرٌ کے معنی لکھنے کے بھی آتے ہیں جو اسی اعتبار سے ہیں کہ لکھنے میں وہ شئے کھلتی ہے۔ سَافِرٌ اسی سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ہے۔ تفسیر کبیر میں ہے کہ:

"کَتَبَةٌ کو سَفَرَةٌ اور کَاتِبٌ کو سَافِرٌ اس لیے کہا گیا کہ اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ اس شئے کو بیان کرنے والا اور واضح کرنے والا ہے"[2]

ابن ابی حاتم نے بروایت ابن جریج حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ نبطی زبان میں اس کے معنے قرا یعنی قرأت کرنے والوں کے ہیں۔[3] پ ۳۰/۵

[1] احکام القرآن ج ا ص ۲۰۴
[2] تفسیر کبیر ج ۸ ص ۳۳۳ طبع مصر ۱۳۲۴
[3] الاتقان از امام سیوطی ج ا ص ۱۳۸ طبع مصر

سَفَرِنَا ہمارا سفر، سَفَرِ مضاف، نَا ضمیر جمع
متکلم مضاف الیہ، ۱۵ پ ۲۱

سُفْلیٰ بہت نیچی، سُفُولٌ سے اسم تفضیل کا
صیغہ واحد مونث، عَلْیَا کی نقیض ہے، (ملاحظہ
ہو اَسْفَل) پ ۱۰ ۱

سَفِہَ وہ بیوقوف ہوا، اس نے احمق بنایا،
اس نے ہلاک کیا (سَمِعَ) علامہ محمود آلوسی زیر
آیۂ شریفہ اِلَّا مَنْ سَفِہَ نَفْسَہٗ (مگر جو بیوقوف
ہوا اپنے جی سے، یا، مگر وہی کہ جس نے احمق بنایا
اپنے آپ کو) تحریر فرماتے ہیں،
"اور سَفِہَ بالکسر (بروزن سَمِعَ) جیساکہ مبرد
و ثعلب کا بیان ہے متعدی بنفسہ ہے، اور
نَفْسَہٗ مفعول بہ، لیکن سَفُہَ بالضم (بروزن
کَرُمَ) سو وہ لازم ہے اور حدیث میں جو آیا ہے
کہ اَلْکِبْرُ اَنْ تَسْفَہَ الْحَقَّ وَتَغْمِطَ النَّاسَ (الکبر
یہ ہے کہ تو حق کا استخفاف کرے اور لوگوں کو خوار
رکھے) وہ اس کے متعدی ہونے کا شاہد ہے
اور بعض کا قول ہے کہ یہ بھی لازم ہے اور مفعول
کی طرف اس کا تعدیہ اس بنا پر ہے کہ وہ اس معنی
جہل یا اہلاک پر مشتمل ہے جس کی طرف تعدیہ
ہوتا ہے، یعنی خفتِ عقل اور عدمِ تفکر کی بنا
پر اس نے اپنے آپ کو نادان بنایا" اور یہ
زجاج کا قول ہے، یا "اس نے اپنے آپ کو
ہلاک کیا" یہ ابو عبیدہ کا قول ہے[1] پ ۱ ۱۶

سَفَہًا نادانی، کم عقلی، بیوقوفی سَفِہَ یَسْفَہُ
کا مصدر ہے، واضح رہے کہ سَفَہٌ کا استعمال
امورِ اخروی اور دنیاوی دونوں کے بارے
میں ہوتا ہے چنانچہ "سفہ دنیوی" کے متعلق
ارشاد ہے وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمْ (اور
مت پکڑا دو بیعقلوں کو اپنے مال) اور "سفہ اخروی"
کے متعلق فرمایا ہے، وَاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا
عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا (اور یہ کہ ہم میں کا بیوقوف
اللہ پر بڑھا کر باتیں کہا کرتا تھا) یہ دین کے
بارے میں سفاہت و بیوقوفی کا بیان ہے پ ۲۹

سُفَهَاءُ بے وقوف، کم عقل، بے سمجھ،
احمق، سَفِیْہٌ کی جمع، پ ۲ پ ۲ پ ۱۲ پ ۹

سَفِیْنَۃٌ کشتی، جہاز، سَفْنٌ سے جس
کے معنے پوست اکھیڑنے اور کسی شے کو اوپر
سے چھیلنے کے ہیں بروزن فَعِیْلَۃٌ
بمعنے فَاعِلَۃٌ ہے چونکہ کشتی سطحِ آب کو

[1] روح المعانی ج ۱ ص ۲۴۷ طبع مصر

چیرتی جاتی ہے اس لئے اس کا نام "سفینہ" ہوا سَفَائِنُ اور سُفُنٌ جمع، ۳ پ ۱۶ پ ۱۵ پ ۲۰ پ

سَفِيهًا بیوقوف، بے عقل سَفَهٌ اور سَفَاهَةٌ سے بروزن فَعِيلٌ صفت مشبہ کا صیغہ واحد مذکر" ۳پ

سَفِيهُنَا ہم میں کا بیوقوف، سَفِيهُ مضاف نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ" ۲۹ پ

فصل القاف

سِقَايَةَ پانی پلانا، پلانے کی جگہ، پینے کا برتن "سقایہ" کے بارے میں مفسرین و اہل لغت کے اقوال سخت پریشان ہیں کوئی اس کو سَقَى يَسْقِي کا مصدر بتاتا ہے اور کوئی أَسْقَى کا اور کوئی مصدر کو بمعنی اسم فاعل بیان کرتا ہے اور کوئی کہتا ہے اس مکان کا نام ہے جہاں حاجیوں کو پینے کے لئے پانی دیا جاتا تھا علامہ سید محمد رشید رضا مصری نے تفسیر المنار میں اس پر بڑی عمدہ تحقیقی بحث لکھی ہے جو درج ذیل ہے فرماتے ہیں

"سِقَايَة لغت میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی وغیرہ پلایا جاتا ہے، اسی معنی میں ہے

جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ (رکھدیا پینے کا پیالہ اسباب میں اپنے بھائی کے) اسے سِقَايَة سے اس لئے موسوم کیا گیا کہ اس سے پلایا جاتا تھا اور صواع اس لئے کہا گیا کہ صاع کی طرح اس سے ناپا جاتا تھا، یہ مؤنث بھی استعمال ہوتا ہے اور مذکر بھی لسان میں (اسی طرح دوسری کتابوں میں) مذکور ہے۔" اور سقایة وہ مقام ہے جس میں حج کے مواقع وغیرہ پر شراب (پینے کی چیز شربت، پانی وغیرہ) تیار کیا جاتا ہے" (اس کے بعد کہا ہے) کہ حدیث میں آتا ہے مآثر الجاهلية تحت قدمي الا سقاية الحاج وسدانة البيت (جاہلیت کے قابل ذکر کارناموں میں سے ہر کارنامہ میرے قدموں تلے ہے بجز حاجیوں کے پانی پلانے کے انتظام اور خانہ کعبہ کی خدمت گذاری اور پاسبانی کے) کہ قریش حاجیوں کو پانی میں کشمش ڈال کر پلایا کرتے تھے، اور حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ جاہلیت اور اسلام دونوں میں اس کے متولی رہے ہیں اور جس حدیث کو صاحب لسان نے بیان کیا ہے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ ۔ ۔ ۔ ۔

حجۃ الوداع کی بعض روایات میں وارد ہوئی ہے۔

اور نووی نے الاسماء واللغات میں (اس سلسلہ میں) جو فرمایا ہے حسب ذیل ہے۔

سقایۃ العباس رضی اللہ عنہ مسجد حرام زادہ اللہ شرفاً میں ایک مقام ہے جس میں لوگوں کے پینے کے لیے پانی کھینچا جاتا ہے۔ اس کے اور زم زم کے درمیان چالیس ہاتھ کا فاصلہ ہے، ازرقی نے اپنی کتاب تاریخ مکہ میں نیز دیگر علماء نے بیان کیا ہے کہ "سقایۃ چمڑے کے حوض تھے جو قصی بن کلاب کے زمانہ میں مکہ کے صحن میں رکھے جاتے تھے اور ان میں اونٹوں کے ذریعہ کنوؤں سے شیریں پانی کھینچا جاتا تھا اور حاجیوں کو پلایا جاتا تھا۔ پھر قصی نے مرتے وقت سقایہ کا منصب اپنے بیٹے عبد مناف کے سپرد کیا، اور وہ برابر عبد مناف کے ہی پاس رہا وہ اسے سرانجام دیتے رہے یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

میں (یعنی علامہ رشید رضا) کہتا ہوں اس مقام پر جو سقایۃ العباس سے موسوم ہے ایک عمارت تعمیر کر دی گئی تھی جو اب تک قائم چلی آتی ہے۔ یہ چاہ زمزم کی جانب جنوب ایک بڑا حجرہ ہے۔ مورخین مکہ نے اس کی پیمائش نیز زم زم اور کعبہ مشرفہ سے اس کے فاصلہ کا حال بیان کیا ہے۔

اور اس لفظ کے استعمال سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ اسم حرفہ بن گیا ہے، اور اسی طرح حجابۃ جو بیت اللہ کی کلید برداری اور پاسبانی تھی اور یہ دونوں حرفے قریش کے نہایت شاندار کارنامے تھے، اور اسی بنا پر اسلام نے ان دونوں کو برقرار رکھا، اور نیز اسی سے بداہت معلوم ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا کہ انا صاحب السقایۃ اور لوگوں کا بھی ان کے متعلق یہی کہنا اس سے یہ مراد نہیں لیا جائے گا کہ وہ اس مقام کے مالک تھے جہاں وہ پانی رکھا جاتا تھا جو کہ کشمش یا اس میں خرما ڈال کر شیریں کیا جاتا تھا اور نہ (سقایہ سے) وہ پانی مراد ہو گا بلاشبہ اس سے مراد یہی ہے کہ وہ اس کام کے انتظام کے متولی تھے یعنی کشمش اور خرما لاکر انہیں پانی میں ڈالنا اور اس کے برتنوں کو ان مقامات پر رکھنا جہاں آکر حاجی اس کو پیتے ہیں اور عجیب بات ہے کہ لغوی اور مفسر اس معنی سے غفلت کرے اور کوئی تو یوں کہے کہ وہ اس مکان کا نام ہے جہاں پانی پلایا جاتا تھا اور کوئی سقی یا اسقی کا مصدر بتائے، (وغیرہ وغیرہ)" [1]

آگے چل کر سید صاحب موصوف لکھتے

[1] تفسیر المنار ج ۱۰ ص ۲۱۶ و ۲۱۷ طبع مصر ۱۳۴۶ھ

ہیں۔

"موجودہ زمانہ میں حکومت سعودیہ کی توجہ ہر سال لاکھوں حاجیوں کے لیے پانی کی وافر مقدار مہیا کرنے اور اسے صاف ستھرا رکھنے کی طرف بڑھتی جاتی ہے لیکن شربت کا پلانا بہت زمانوں سے چھوٹ گیا ہے، کیونکہ حجاج کی کثرت کی بنا پر یہ دشوار بن گیا ہے، اور اگر حرمین کے اوقاف کے چوتھائی حصہ کا بھی جو اسلامی اطراف میں موجود ہیں انتظام کر کے حکومت حجاز کی طرف روانہ کیا جائے تو حکومت کے لیے اس کا اعادہ اور مکہ یا منیٰ میں اس کے لیے عام انتظام کرنا ممکن ہے"[1] پ ۹

۱۳

سَقَرُ آگ، دوزخ کے ایک طبقہ کا نام ہے۔

علامہ سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس من جواہر القاموس میں رقم طراز ہیں۔

"سقر کے بارے میں دو قول ہیں ایک یہ کہ آتش کا نام سقر رکھ دیا گیا ہے، اس لفظ کے اشتقاق کا پتہ نہیں[2]، اور معرفہ اور عجمہ ہونا منصرف ہونے سے مانع ہے اور بعض کا قول ہے کہ دوزخ کو سقر اس لیے کہا گیا کہ وہ جسم اور روح کو تحلیل کر دالتی ہے اور یہ عربی نام ہے۔ اہل عرب کے محاورہ سقرتہ الشمس سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں دھوپ نے اسے تحلیل کر دیا، اور اسے لو لگ گئی، اور جو اسے عربی اسم بتاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس کے غیر منصرف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ معرفہ مونث ہے"۔

علامہ ابو حیان اندلسی نے البحر المحیط میں لکھا ہے۔

"سقر علمیت اور تانیث کی بنا پر غیر منصرف ہے اس کے وسط کی حرکت زینب کے حرف رابع کے قائم مقام ہے" (ج ۸ ص ۳۷۲)

راغب اصفہانی مفردات میں لکھتے ہیں:۔

"چونکہ سقر اصل میں جھلسانے کو چاہتا تھا اس لیے یہ فرما کر وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ۝ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ۝ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ۝ (اور تو کیا سمجھا کیسی ہے وہ آگ نہ باقی رکھے اور نہ چھوڑے، جلا دینے والی ہے آدمیوں کو) متنبہ کر دیا گیا کہ مشاہدہ میں جو سقر [illegible]

[1] تفسیر المنار ج ۱۰ ص ۲۱۸ و ۲۱۹

[2] امام سیوطی نے الاتقان میں [illegible] ہے کہ یہ عجمی لفظ ہے (الاتقان ج ۱ ص ۱۳۸)

احوال تم جانتے ہو اس سے معاملہ جداگانہ ہے"

پ ۱۵ ع ۱ ۲۷ ۲۹

سُقِطَ وہ گرادیا گیا (نصّی) سُقُوطٌ جس کے معنی گر پڑنے کے ہیں، ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب، امام ابوجعفر احمد بن علی مقری بیہقی، اپنی کتاب نادر، تاج المصادر میں رقمطراز ہیں،

"اور ارشاد الٰہی وَلَمَّا سُقِطَ فِيۤ اَيْدِيْهِمْ یعنی وہ نادم ہوئے، اس کے معنی ہوتے ہیں سقط الندم فی ایدیھم (ندامت انکے ہاتھوں میں گر پڑی) اور ندامت کو ذکر نہیں کیا گیا ہے، اور بعض کا قول ہے کہ سُقِطَ مفعول مالم یسمّ فاعلہ آیا ہے جس طرح کہ رُغِبَ فِيْ فلان بولا جاتا ہے اور سُقِطتُ نہیں بولا جاتا جس طرح کہ رُغِبتُ نہیں بولا جاتا، بلکہ کہا جاتا ہے رُغِبَ فِيَّ اور سُقِطَ فی یدہٖ بمعنی ندم کے اور سُقِطَ فی ایدیھم اور اُسقط بھی مگر سُقِطَ کا استعمال زیادہ بھی ہے اور عمدہ بھی اور بعض نے سُقِطَ کا انکار کیا ہے، اور اس طرز استعمال کو نہ قرآن سے پہلے سنا گیا اور نہ عرب اس سے واقف تھے اور یہ ترکیب کسی شئے کے اوپر سے نیچے کی طرف آنے اور اس کے زمین پر گرنے کو بتاتی ہے پھر اس کے معنی میں وسعت کی گئی چنانچہ غلط بات کو سَقَطٌ (پڑی گری چیز) کہا جانے لگا کیونکہ انھوں نے اس کو بے ضرورت چیز کے مشابہ قرار دیا،

اور ہاتھ کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ ندامت دل میں پیدا ہوتی ہے اور اس کا اثر ہاتھوں میں ظاہر ہوتا ہے جیسے ارشاد الٰہی ہے فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَاۤ اَنْفَقَ فِيْهَا (پھر صبح کو رہ گیا ہاتھ نچاتا اس مال پر جو اس میں لگایا تھا) اور فرمایا وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ (اور جس دن کاٹ کاٹ کھائیگا گنہگار اپنے ہاتھوں کو) چنانچہ بسا اوقات ہاتھوں کی طرف اس فعل کی نسبت کردی جاتی ہے جو اس سے سرزد نہیں ہوتا، جیسے ارشاد الٰہی ہے ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدَاكَ (یہ اس کی وجہ سے ہے جو آگے بھیج چکے تیرے دو ہاتھ)" پ ۹ ع ۸

سَقَطُوْا وہ گر پڑے، سُقُوطٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ ۱ ع ۱۴

سَقْفٌ چھت، سُقُوفٌ جمع، اَلسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ (اونچی چھت) سے مراد آسمان

ہے، جو زمین کے لئے چھت کی بجائے ہے اور

یا عرش عظیم جو تمام آسمانوں کے اوپر ہے۔ پ۱۷ ع۲

سُقُفًا ع۳ پ۲۵

سُقُفًا چھتیں، اخفش نے اس کو سَقْفٌ کی جمع

بتایا ہے جیسے کہ رَهْنٌ اور رُهُنٌ ہیں، اور فراء

نے سَقِيفٌ (اس کے معنی بھی چھت ہی کے ہیں)

کی جمع بیان کیا ہے، جس طرح سے کہ کَثِيبٌ

اور كُثُبٌ بولتے ہیں، فراء نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر

چاہو تو جمع الجمع بھی قرار دے سکتے ہو کہ سَقْفٌ

کی جمع سُقُوفٌ اور سُقُوفٌ کی جمع سُقُفٌ ہے۔[1] پ۲۵ ع۹

سُقْنٰهُ ہم نے اس کو ہانک دیا، ہم اس کو ہانک

لے گئے، (نَصَرَ) سُقْنَا سَوْقٌ سے ماضی کا

صیغہ جمع متکلم ہ ضمیر واحد مذکر غائب، (ملاحظہ

ہو سَائِقٌ) پ۲۲ ع۱۴ پ۱۴ ع۱۴

سُقُوْا ان کو پلایا گیا، (ضَرَبَ) سَقْيٌ سے ماضی

مجہول کا صیغہ جمع مذکر غائب (ملاحظہ ہو سَقْيٌ)

پ۲۶ ع۹

سَقٰى اس نے پانی پلایا، سَقْيٌ سے ماضی کا

صیغہ واحد مذکر غائب، پ۲۰ ع۶

سُقْيٰهَا اس کو پانی پلانا، سُقْيَا سَقْيٌ سے

اسم ہے، مضاف ہے، اور هَا ضمیر

واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، سُقْيَا

کی جمع سُقْيَاتٌ ہے جیسے حُبْلٰی کی حُبْلَيَاتٌ

ہے، پ۳۰ ع۱۴

سَقَيْتَ تو نے پلایا، سَقْيٌ سے ماضی کا

صیغہ واحد مذکر حاضر، پ۲۰ ع۹

سَقِيْمٌ دکھی، بیمار، سُقْمٌ سے جس

کے معنے بیمار ہونے کے ہیں بر وزن فَعِيْلٌ

صفت مشبہ کا صیغہ ہے، امام راغب

اصفہانی لکھتے ہیں،

" سَقَمٌ اور سُقْمٌ اس مرض کو کہتے ہیں

جو بدن کے ساتھ مخصوص ہو، اور "مرض"

کبھی بدن میں ہوتا ہے اور کبھی نفس میں جیسے

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (ان کے دلوں میں

بیماری ہے) اور ارشاد الٰہی اِنِّيْ سَقِيْمٌ

(میں دکھی ہوں) یہ تعریض ہے، یا زمانہ

ماضی اور مستقبل کی طرف اشارہ

ہے یا اس تھوڑے سے دکھ کی طرف

جو فی الحال موجود رہتا ہے۔

. . . .

[1] تاج العروس

کیونکہ انسان کو کوئی نہ کوئی خلل لگا ہی رہتا ہے اگرچہ وہ اسے محسوس نہ کرے" ہے وہ ۱۳۔

سَقٰهُم اس نے ان کو پلایا، اس میں ھُم ضمیر جمع مذکر غائب ہے (ملاحظہ ہو سَقٰی)

۲۹/۱۹

فصل الکاف

سُکَارٰی نشہ میں مست، سکرٰی سے جس کے معنی مست ہونے کے ہیں یا جمع مکسر ہے یا اسم جمع، امام تاج الدین ابو محمد بن مکتوم قیسی حنفی نحوی الدر اللقیط میں لکھتے ہیں۔

"سُکارٰی مضموم کے بارے میں علماء کو اختلاف ہے کہ آیا وہ جمع تکسیر ہے، سیبویہ نے تکسیر صفات کے بیان میں کہا ہے" اور کبھی بعض صفات کی فعالی پر بھی تکسیر کرتے ہیں چنانچہ بعض سُکارٰی اور عُجالٰی بولتے ہیں" فعالٰی کے جمع ہونے پر یہ سیبویہ کی صاف تصریح ہے اور استاذ ابو الحسن ابن الباذش کو وہم ہو گیا جو انہوں نے سیبویہ کی طرف یہ نسبت کر دی کہ یہ اسم جمع ہے نیز یہ کہ ابنیہ کے سلسلہ میں سیبویہ نے اس کو بیان بھی کیا ہے۔ ابن الباذش کا بیان ہے کہ قیاس بھی یہی ہے کیونکہ یہ ایسے وزن پر آیا ہے جس پر کبھی کوئی جمع آئی ہی نہیں۔ حالانکہ ابنیہ کے سلسلہ میں سیبویہ کی اس کے سوا کوئی تصریح ہی نہیں کہ وہ جمع تکسیر ہے چنانچہ انہوں نے یہ کہا ہے، کہ فعالٰی کا وزن اسم میں ہوتا ہے جیسے حبارٰی، سمانٰی، کبارٰی اور صفت نہیں ہوتا۔ ہاں صرف اس صورت میں کہ اس کے وزن پر واحد کی تکسیر کر لی جائے، جیسے عجالٰی، سکارٰی اور کسالٰی ہیں اور سیرافی نے اس کے بارے میں دونوں قول بیان کیے ہیں اور اسی کو ترجیح دی ہے کہ یہ جمع تکسیر ہے نیز یہ کہ سیبویہ کا کلام اسی پر دلالت کرتا ہے"[له]

اور امام ابن جنی، المحتسب میں فرماتے ہیں:۔

"سُکارٰی بالضم اس کا ظاہر یہ ہے کہ یہ اسم مفرد غیر مکسر ہے جیسے کہ حبارٰی، سُمانٰی اور سُلامٰی ہیں۔ نیز یہ بھی جائز ہے کہ مکسر ہو اور ان الفاظ میں سے ہو کہ جو فعالٰی کے وزن پر آئے ہیں جیسے ظُؤارٌ، عُراقٌ اور رُخالٌ ہیں، مگر اتنی بات ہے کہ الف کے ذریعہ اسے مؤنث کر لیا

له الدر اللقیط من البحر المحیط ص ۲۵۵ ج ۳ طبع مصر ۱۳۲۸ھ برحاشیہ البحر المحیط

گیا ہے۔ جیسے کہ نُقَاوَۃٌ کے استعمال میں ھا کے ذریعہ تانیث کرلی گئی ہے، ابو علی نے اس کو نُقْوَۃٌ کی جمع کہا ہے، نیز جس طرح کہ حِجَارَۃ ذِکَارَۃ اور عِبَارَۃ میں فعال کی تانیث کرلی گئی ہے اسی طرح اس کی بھی تانیث عمل میں آئی ہے۔" [۱]

امام ابوبکر جصاص، آیت لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی کی تفسیر میں رقم طراز ہیں:۔

"کہ اس بارے میں اختلاف کیا گیا ہے کہ سکر سے اس آیت میں کیا مراد ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، ابراہیم اور قتادہ نے شراب کا نشہ بیان کیا ہے، مجاہد اور قتادہ نے یہ بھی کہا ہے کہ شراب کی حرمت نے اس حکم کو منسوخ کر دیا ہے اور ضحاک نے کہا ہے کہ اس سے خاص طور پر نیند کا نشہ مراد ہے۔

امام ابوبکر فرماتے ہیں کہ سکر میں صحیح تاویل یہ ہے کہ یہ شراب کا نشہ ہے اس کی دو وجہیں ہیں ایک یہ کہ سونے والے کو اور جس کی آنکھوں میں نیند بھری ہو اسے سکران نہیں کہا جاتا، اور جو شراب میں مست ہو اس کو حقیقت میں سکران کہا جاتا ہے اس لیے لفظ کو حقیقت پر محمول کرنا ضروری ہے۔ اور بغیر کسی دلالت کے مجاز کی طرف پھیرنا روا نہیں، دوسری وہ روایت جو سفیان نے عطاء بن السائب سے بواسطہ ابو عبدالرحمٰن حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ ایک انصاری نے کچھ لوگوں کی دعوت کی اور پھر انہوں نے مے نوشی کی پھر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نماز مغرب کے لیے کھڑے ہوئے اور قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ کی تلاوت کی تو تشابہ لگنے لگا، اس پر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی (نزدیک نہ جاؤ نماز کے جس وقت کہ تم نشہ میں ہو" [۲] ۱۸-۴

سَکَتَ وہ تھم گیا، اس نے خاموشی اختیار کی، (نصر) سُکُوْتٌ سے جس کے معنی خاموش ہونے کے ہیں۔ ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، راغب لکھتے ہیں

"سکوت ترک کلام کے ساتھ مخصوص ہے اور چونکہ

[۱] تاج العروس [۲] احکام القرآن ج ۲ ص ۲۴۴ و ۲۴۵

سکوت بھی سکون ہی کی ایک قسم ہے اس لئے ارشاد الٰہی وَلَمَّا سَکَتَ عَنْ مُّوْسَی الْغَضَبُ (اور جب تھم گیا موسیٰ کا غصہ) میں سکوت بطور استعارہ سکون ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے، [۹]

سَکَرًا جس چیز سے نشہ ہو، نبیذ، امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں،

"سلف نے سَکَر کی تاویل میں اختلاف کیا چنانچہ حسن اور سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ کھجور اور انگور کی جو چیز حرام ہو چکی ہے سَکَر ہے اور جو اس میں حلال ہے "رزق حسن" ہے اور ابراہیم، شعبی اور ابو رزین سے روایت ہے کہ سکر خمر ہے اور جریر نے حضرت عبد اللہ (بن مسعود) رضی اللہ عنہ سے بھی بروایت مغیرہ عن ابراہیم یہی روایت کیا ہے، اور ابن شبرمہ، ابو زرعہ بن عمرو بن جریر سے راوی ہیں کہ سکر شراب خرما ہے اور ان سب نے کہا ہے کہ اس کی اباحت تحریم خمر سے منسوخ ہو چکی ہے،

اس کے بعد امام جصاص رازی اپنی سند سے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سکر کے معنی نبیذ کے اور رزق حسن کے معنے کشمش کے نقل کر کے یہ فرماتے ہیں،

"جب کہ سلف نے اس کے معنے خمر اور نبیذ نیز فرمایا انگور کی اس چیز کے لئے ہیں کہ جس کا استعمال حرام ہے تو یہ ثابت ہوا کہ یہ اسم سب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور ان کا یہ کہنا کہ تحریم خمر سے یہ حکم منسوخ ہے، اس بات کو بتاتا ہے آیت اباحت سکر کی مقتضی ہے اور سکر خمر اور نبیذ ہے اور جس کا نسخ ثابت ہے وہ صرف خمر ہے اور نبیذ کی حرمت ثابت نہیں لہٰذا ظاہر آیت سے نبیذ کی تحلیل ثابت ہے، کیونکہ اس کا نسخ ثابت نہیں" [۱۴] [۱۵]

ابن مردویہ نے بطریق عوفی حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حبشی زبان میں سکر کے معنی سرکہ کے ہیں [۱۶]

سَکْرَتِھِمْ ان کی مستی، ان کا نشہ، ان کی مدہوشی، سَکْرَۃٌ مضاف ھِمْ ضمیر جمع مذکر غائب

سُکِّرَتْ اس کی نظر بندی کر دی گئی، تَسْکِیْرٌ سے جس کے معنی نظر بندی کرنے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، [۱۴]

---

[۱] احکام القرآن ج۔ ۲ ص ۲۴۴ و ۲۴۵ [۲] ملاحظہ ہو احکام القرآن ج۔ ۳ ص ۲۲۷ و ۲۲۸ [۳] الاتقان امام سیوطی، ج۔ ۱ ص ۱۳۰ طبع مصر

مضاف الیہ، پ ۱۴ ۵

سَکْرَۃ بے ہوشی، مدہوشی، مستی، راغب لکھتے ہیں کہ

"سُکر وہ حالت ہے جو انسان اور اس کی عقل کے درمیان پیش آتی ہے، اور اکثر اس کا استعمال شراب کے بارے میں ہوتا ہے، اور کبھی غضب و عشق کی بنا پر بھی یہ حالت طاری ہو جاتی ہے، شاعر کہتا ہے

سکران سکر ھوی و سکر مدام

نشۂ محبت اور شراب کی مستی سے مدہوش ہو

سکرات الموت اسی سے ماخوذ ہے، اللہ فرماتا ہے وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ (اور وہ بیہوشی موت کی)"

علامہ مجدالدین فیروزآبادی، بصائر ذوی التمیز فی لطائف کتاب اللہ العزیز میں فرماتے ہیں

"نزع کی سختی کے باعث عقل کے گڑبڑ ہو جانے کا نام "سکر الموت" ہے" پ ۲۶ ۱۶

سَکَنَ وہ ٹھیرا، وہ بسا، وہ رہا، اس نے آرام پکڑا، "سُکُوْنٌ" سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب

علامہ محمد مرتضےٰ زبیدی لغوی، تاج العروس میں ابن الکمال سے ناقل ہیں

"سکون" جس میں حرکت کی صلاحیت ہو اس کے حرکت نہ کرنے کا نام ہے پس جس میں متحرک ہونے کی صلاحیت نہ ہو اس سے حرکت کا نہ ہونا سکون نہیں ہوگا اور جو ایسا ہوگا وہ نہ متحرک ہوگا نہ ساکن"

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ

"ارشاد الٰہی وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ابن الاعرابی نے سکن کے معنی حَلَّ (وہ فروکش ہوا) کے لئے ہیں اور ثعلب نے کہا ہے کہ ساکن کا استعمال انسان اور بہائم ہی کے لئے خاص ہے سکن کا ترجمہ ہے حرکت کے بعد ٹھیر گیا اور یہاں اس کے معنی (اور اللہ تعالیٰ دانا تر ہے) پیدا کرنے کے ہیں"

غرض ابن الاعرابی کے قول پر آیت کا ترجمہ ہوگا، اور اسی کا ہے جو بستا ہے رات میں اور دن میں" اور ثعلب کے قول پر یہ معنی ہوں گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لہ تاج العروس ج۔ ۳ ص ۲۷۵ مادہ سکر

"اور اسی کا ہے جو پیدا کیا رات میں اور دن میں"

(ملاحظہ ہو اُسْکُنْ) پ۷

سَکَنٌ تسکین، آرام، رحمت، برکت، جس سے سکون حاصل ہو، بسنے کی جگہ سُکُوْنٌ سے اسم ہے

پ۱ **سَکَنًا** پ۸ پ۱۱

سَکَنْتُمْ تم بسے، تم آباد ہوئے، تم رہے، سُکُوْنٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر پ۱۳/۱۹

پ۲۵/۱۴

سِکِّیْنًا چھری، چاقو، سَکَاکِیْنُ جمع، لفظ "سکین" مذکر بھی استعمال ہوتا ہے اور مونث بھی اور غالب اس پر تذکیر ہی ہے۔ راغب لکھتے ہیں کہ اس کا نام سکین اس لیے ہوا کہ وہ مذبوح کی حرکت کو زائل کر دیتی ہے، یہ سکُوْنٌ سے بروزن فِعِّیْلٌ اسم مشتق ہے، پ۱۲

سَکِیْنَتَهٗ اس کی طرف کی تسکین، اس کی طرف کا اطمینان سکینۃ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ۱۰ پ۲۶

سَکِیْنَةٌ تسکین، تسلی خاطر، اطمینان، سُکُوْنٌ سے بروزن فَعِیْلَةٌ مصدر ہے جو اسم کی جگہ استعمال ہوا ہے، جیسے کہ عَزِیْمَةٌ۔ پ۲

علامہ لغوی سید محمد مرتضیٰ زبیدی لکھتے ہیں:-

"سکینۃ وہ اطمینان، چین، قرار اور سکون ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندہ کے قلب میں اس وقت نازل فرماتا ہے جب کہ وہ ہولناکیوں کی شدت سے مضطرب ہو جاتا ہے پھر اس کے بعد جو کچھ بھی اس پر گذرے وہ اس سے گھبراتا نہیں، یہ اس کے لیے ایمان کی زیادتی، یقین میں قوت اور استقلال کو ضروری کر دیتا ہے اسی وجہ سے حق سبحانہٗ نے "یوم الغار" اور "یوم حنین" جیسے قلق و اضطراب کے مواقع پر اپنے رسول اور مومنین پر اس کے نازل کرنے کی خبر دی ہے۔" ؎۲

واضح رہے کہ قرآن مجید میں سکینۃ کا لفظ چھ جگہ استعمال ہوا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ بجز سورہ بقرہ کے قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی "سکینہ" آیا ہے اس کے معنے اطمینان کے ہیں۔ ؎۳ سورہ بقرہ کی جس آیت کا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے استثنا فرمایا ہے وہ آیۂ کریمہ اِنَّ اٰیَةَ مُلْكِهٖ

؎۱ غرائب القرآن رغائب الفرقان معروف بہ تفسیر نیشاپوری ج ۲ ص ۲۷۷ طبع مصر بحاشیہ تفسیر ابن جریر ؎۲ تاج العروس

اَنْ یَّاْتِیَکُمُ التَّابُوْتُ فِیْہِ سَکِیْنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ (طالوت کی سلطنت کی نشانی یہ ہے کہ آوے تمہارے پاس ایک صندوق کہ جس میں تسلی خاطر ہے، تمہارے رب کی طرف سے)

یہاں "سکینہ" سے کیا مراد ہے، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے تو یہاں بھی حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اطمینان ہی کے معنے روایت کیے ہیں[1]. اور یہی صحیح ہیں اس کے علاوہ اس بارے میں تفسیر کی کتابوں میں جو بہت سی بے سروپا روایتیں منقول ہیں نہ عقلاً صحیح ہیں نہ نقلاً اور پھر سخت متعارض کہ ان کا باہم جمع کرنا غیر ممکن ہے[2]

پ ۳/۱۴ ۲۶ و ۱۱

فصل اللام

سَلْ تو پوچھ، تو دریافت کر، سُؤَالٌ سے امر کا صیغہ واحد مذکر حاضر (ملاحظہ ہو اِسْئَلْ اور سُؤَالٌ پ ۲)

سَلَاسِلُ زنجیریں، سِلْسِلَۃٌ کی جمع، پ ۲۹/۱۳

سَلْسَلًا پ ۲۹/۱۹

سُلَالَۃٍ چنی ہوئی، نچوڑی ہوئی، نچوڑ، خلاصہ سَلٌّ سے جس کے معنی کسی چیز کو کسی چیز سے کھینچنے سونتنے اور نچوڑنے کے ہیں۔ اسم مشتق ہے۔ پ ۱۸/۱۴ ۲۱

سَلْمٌ سلامتی، امان، سلام، سالم، یہ سَلِمَ یَسْلَمُ کا مصدر ہے۔ اس کے معنے عیوب و آفات سے سلامت رہنے، ان سے چھٹکارا پانے اور بری ہونے کے ہیں۔ امام راغب مفردات القرآن میں رقم طراز ہیں،

"سَلْمٌ اور سَلَامَۃٌ کے معنی ہیں ظاہری اور باطنی آفتوں سے الگ رہنے کے، ارشاد ہے بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ یعنی ایسا دل جو دغا سے خالی ہو یہ باطن کے بارے میں ہے اور مُسَلَّمَۃٌ لَّاشِیَۃَ فِیْھَا بے عیب ہے کوئی داغ اس میں نہیں ا یہ ظاہر کے بارے میں ہے سَلِمَ یَسْلَمُ سَلَامًا وَسَلَامَۃً وسلمہ اللّٰہ، فرمایا وَلٰکِنَّ اللّٰہَ سَلَّمَ (اور لیکن اللہ نے بچا لیا) اور ارشاد ہے اُدْخُلُوْھَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ (جاؤ ان میں سلامتی سے بے کھٹکے) یہاں سلامتی مراد ہے اسی طرح اِھْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا (اتر سلامتی

---

[1] الدر المنثور امام سیوطی ج ۱ ص ۳۱۷ طبع مصر۔ [2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر المنار ج ۲ ص ۴۸۴ طبع مصر اور تفسیر فتح القدیر ج ۱ ص ۲۳۹

کے ساتھ ہماری طرف سے) ہے اور حقیقی
سلامتی جنت کے سوا اور کہیں نہیں کیونکہ
وہاں بقا ہے فنا نہیں، غنا ہے احتیاج
نہیں، عزت ہے ذلت نہیں، صحت ہے
بیماری نہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَهُمْ
دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ (ان ہی کے لئے
ہے سلامتی کا گھر اپنے رب کے ہاں) یہاں
"سلام" بمعنی سلامتی ہے اور وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا
اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ (اور اللہ بلاتا ہے سلامتی
کے گھر کی طرف) اور يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ
اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ (جس سے اللہ
ہدایت کرتا ہے اس کو جو تابع ہوا اس کی رضا
کا سلامتی کی راہیں) ان سب جگہ سلامتی کے
معنی ہو سکتے ہیں، اور بعض کا قول ہے کہ السلام
اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے اور اسی طرح
لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ کے بارے میں کہا گیا ہے ؎
اور اَلسَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ (سب عیبوں
سے سالم، امان دینے والا، پناہ میں لینے والا)
کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سلام ہے اس لئے
موصوف کیا گیا کہ جس طرح خلق کو عیوب و
آفات ہوتی ہیں اس کو لاحق نہیں ہوتیں"
اور فرمایا سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ
(سلام، بولنا ہے رب مہربان سے) سَلٰمٌ
عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ
(سلامتی تم پر بدلے اس کے کہ تم نے صبر کیا
سو خوب ملا عاقبت کا گھر) سَلٰمٌ عَلٰٓى
اِلْ يَاسِيْنَ (سلام ہے الیاس پر) یہ سب
(یعنی سلام علیکم) لوگوں کی جانب سے
تو بذریعہ قول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف
سے بذریعہ فعل یعنی جنت میں جس سلامتی کے
ہونے کا سابق میں مذکور ہوا ہے اس کو عطا
فرمانا،

اور آیہ شریفہ وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ
قَالُوْا سَلٰمًا (اور جب بات کرنے لگیں ان
سے بے سمجھ لوگ تو کہیں صاحب سلامت) کا
مطلب یہ ہے کہ ہم تم سے سلامتی چاہتے ہیں
اس صورت میں سَلٰمًا کو نصب اضمار فعل
کی بنا پر ہوگا (اور مطلب کو مضمر مانا جائیگا) اور بعض
نے کہا ہے کہ قَالُوْا سَلٰمًا کے معنی ہیں اچھی بات
کہنے کے اس صورت میں یہ مصدر محذوف

؎ اس صورت میں "دار السلام" کے معنی اللہ کے گھر اور "سبل السلام" کے معنی اللہ کی راہوں کے ہوں گے"

(یعنی قولاً) کی صفت ہوگا، اور آیہ شریفہ اِذْ
دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ
(جب اندر پہنچے اس کے پاس تو بولے سلام وہ
بولا سلام ہے) میں ثانی پر رفع (دینا) اس لئے
ہے کہ دعا کے باب میں رفع زیادہ بلیغ ہے
گویا اس ادب کا لحاظ رکھا جس کا اس آیت میں
حکم دیا گیا ہے، وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ
مِنْهَا (اور جب تم کو دعا دیوے کوئی تو تم بھی
دعا دو اس سے بہتر)،

اور آیہ شریفہ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا
تَاْثِيْمًا اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (نہیں سنیں
گے وہاں بکواس اور نہ گناہ کی بات مگر ایک بولنا
سلام سلام) تو یہ چیز ان کے واسطے صرف
قول ہی قول سے نہیں ہوگی بلکہ قول اور فعل دونوں
کے ذریعہ ہوگی، اور اسی طرح آیہ کریمہ فَسَلٰمٌ
لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ (تو سلامتی پہنچے تجھ کو
داہنے والوں سے ہے)،

اور آیہ شریفہ وَقُلْ سَلٰمٌ (اور کہہ سلام ہے)
اس کا ظاہر مطلب تو یہ ہے تو ان پر سلام کر، اور
حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا ان کفار سے مطالبہ ہے
اور یہ جو فرمایا ہے سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِى الْعٰلَمِيْنَ
(سلام ہے نوح پر سارے جہان والوں میں)
سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ (سلام ہے موسیٰ
اور ہارون پر) سَلٰمٌ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ (سلام
ہے ابراہیم پر) یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف
سے اس امر کا بیان ہے کہ ان کو اس حیثیت
کا بنایا ہے کہ ان کی ثنا کی جاتی رہے گی اور ان
کے لئے دعا ہوتی رہے گی"

امام سہیلی، الروض الانف میں فرماتے ہیں
"اکثر اہل لغت اس طرف گئے ہیں کہ رضاع
اور رضاعۃ کی طرح سلام اور سلامۃ
کے بھی ایک ہی معنے ہیں اور اگر وہ کلام عرب
میں تامل کرتے اور ہاء تانیث اس میں جس قسم
کی تحدید پیدا کرتی ہے اس پر غور کرتے تو ان
کو نظر آتا کہ ان دونوں کے درمیان بڑا فرق ہے

اور اللہ جل جلالہٗ کو سلام کہا جاتا ہے
کہ تمام خلق کے لئے اختلال اور تفاوت
سے سالم رہنے کو اس نے وسیع اور عام
کر دیا ہے کیونکہ ہر چیز نظام حکمت پر چل رہی ہے
اسی طرح جن وانس حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف
سے کسی ظلم یا جور کے ہونے سے سلامت ہیں
پس اللہ تعالیٰ اپنے تمام افعال میں "سلام" ہے

کہ نہ زیادتی ہے نہ ظلم، نہ فرق ہے نہ خلل۔

اور مفسرین میں سے جس نے اس اسم کے متعلق یہ دعوی کیا کہ حق سبحانہ کو اس سے اس لیے موسوم کیا جاتا ہے کہ عیوب و آفات سے سالم ہے، تو اس نے نامناسب بات کی سلام وہ ہے جس سے دوسرا سلامت رہے اور سالم وہ ہے جو دوسرے سے سلامت رہے۔ دیوار کو یہ نہیں کہا جاتا کہ وہ نکان سے سالم ہے اور نہ پتھر کو کہا جاتا ہے کہ وہ زکام سے سالم ہے سالم اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جس پر آفت کا آنا ممکن اور متوقع ہو، اور پھر وہ اس سے سلامت رہے۔ اور حق سبحانہ آفتوں کے واقع ہونے اور نقائص کے آنے سے منزہ ہیں اور جس کی یہ صفت ہو اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ ان سے سلامت رہا اور نہ اسے سالم سے موسوم کیا جائے گا، ان لوگوں نے سلام کو سالم کے معنی میں کر دیا۔ جو چیز ہم نے پہلے ذکر کی اکثر سلف کے قول سے وہی مراد ہے اور سلامۃ سلام کے خصائص میں سے صرف ایک خصلت ہے[۱]

امام ابن جریر طبری نے قتادہ سے سلام کے معنے یہی نقل کیے ہیں السلام ھو الذی یسلم خلقہ من ظلمہ[۲] (سلام وہ ذات ہے کہ جس کے ظلم سے اس کی مخلوق سالم رہے)

ب ۵/۱۰ ب ۶/۶ ب ۸/۲،۹،۱۲ ب ۱۱/۶،۸ ب ۱۲/۴،۷ ب ۱۳/۹،۹،۱۶ ب ۱۴/۴،۹،۱۰

ب ۱۶/۴،۵،۶،۶،۱۱ ب ۱۹/۲۰ ب ۲۰/۹ ب ۲۲/۴ ب ۲۳/۱۲،۷،۸،۹

ب ۲۴/۵ ب ۲۵/۱۳ ب ۲۶/۲۷،۱۹ ب ۲۷/۱۶ ب ۲۸/۹ ب ۳۰/۳۲

سَلٰمًا ب ۱۲/۴ ب ۱۴/۷ ب ۱۶/۵ ب ۱۹/۴ ب ۲۶/۱۹ ب ۲۷/۱۴

سَلْسَبِيْلًا سلسبیل، جنت کے ایک چشمہ کا نام ہے[۳]، جس کے معنے ہیں: "بہتا ہوا صاف پانی" جوالیقی کا بیان ہے کہ یہ عجمی لفظ ہے[۴]، ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ میں نے سلسبیل کو قرآن کے سوا اور کہیں نہیں سنا، اس صورت پر اس کے اشتقاق کا پتہ نہیں لگایا جا سکتا[۵] اور زمخشری کشاف میں لکھتے ہیں، "شراب، سلسل، سلسال اور سلسبیل بولا جاتا ہے، اس میں ترکیب کے اندر بار

---

۱ تاج العروس ۲ جامع البیان فی تفسیر القرآن معروف بہ تفسیر ابن جریر ج ۲۸ ص ۳۳ طبع میمنیہ مصر ۳ الاتقان ج ۱ ص ۱۳۸ طبع مصر ۴ ابن ابی حاتم نے عکرمہ سے یہی روایت کیا ہے (ملاحظہ ہو فتح الباری ج ۸ ص ۲۴۵) تفسیر کبیر ج ۸ ص ۲۶۱ طبع عامرہ مصر

زائد کر دی گئی ہے جس سے کلمہ خماسی ہو گیا ہے
اور انتہائی خوش گواری پر دلالت کرتا ہے زجاج
کا بیان ہے کہ سلسبیل لغت میں اس چیز
کی صفت ہے جس میں انتہائی خوش گواری ہو[1]
علامہ ابو حیان، زمخشری کے بیان کو نقل کر کے لکھتے
ہیں،
"اگر زمخشری کی مراد یہ ہے کہ باء حقیقت میں
زائد کر دی گئی تو درست نہیں کیونکہ علم نحو کے اندر
باء ان حروف میں سے نہیں ہے کہ جو زیادت
کے لیے مقرر ہیں، اور اگر یہ مطلب ہے کہ
حرف باء اثناء کلمہ میں آگیا ہے اور سلسل
اور سلسال میں نہیں ہے تو صحیح ہے اور یہ
ان الفاظ میں سے ہوگا کہ جو معنی میں متفق ہیں اور
مادہ میں مختلف ہیں"[2] پ ۲۹ / ۱۹

سِلْسِلَةٌ زنجیر، سَلَاسِلُ جمع "سلسلہ" کے
معنے اصل میں ایک شئے کے دوسری شئے سے
اتصال کے ہیں زنجیر میں بھی چونکہ کڑیاں ایک
دوسرے سے ملی جلی ہوتی ہیں اس لیے اس کو
سلسلۃ کہتے ہیں، پ ۲۹ / ۵

سُلْطٰنٌ زور، قوت، حجت، برہان، سند
حکومت، تاج العروس میں ہے،
"سلطان" کے معنے حجت و برہان کے ہیں، اسی
معنی میں ارشاد الٰہی ہے لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا
بِسُلْطٰنٍ (نہیں نکل سکو گے بدون سند کے)
اور کبھی اس سے معجزہ بھی مراد لیا جاتا ہے، چنانچہ
فرمایا ہے اِذْ اَرْسَلْنٰہُ اِلٰی فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ
مُّبِیْنٍ (جب بھیجا ہم نے اس کو فرعون کے پاس
دے کر کھلی سند (یعنی معجزہ) اور جب "سلطان"
کے معنے حجت ہوں تو اس کی جمع نہیں آتی کیونکہ
اس صورت میں وہ مصدر کا قائم مقام ہوتا ہے
محمد بن یزید نے کہا ہے کہ یہ سلیط سے جس کے
معنے زیتون کے تیل کے ہیں اس کے روشن کرنے
کی بنا پر ماخوذ ہے کیونکہ دلیل ایسی ہونی چاہیے
جو روشن ہو، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے
فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں ہر جگہ سلطان بمعنی حجت
(دلیل) ہے، اور البصائر میں ہے کہ حجت کو
سلطان اس لیے کہا گیا کہ دلوں پر اس کا دباؤ
ہوتا ہے لیکن اکثر اس کا تسلط اہل علم و حکمت
ہی پر ہوتا ہے، اور لیث نے کہا ہے کہ سلطان
کے معنے بادشاہ کی طاقت نیز اس شخص کی طاقت

[1] کشاف، ج ۴ ص ۱۷۰ [2] البحر المحیط، ج ۸ ص ۳۹۰

کے ہیں جو کو بادشاہ نہ ہو مگر اس کو شاہی طاقت حاصل ہو، جیسے کہتے ہیں قد جعلت لک سلطانا علی اخذ حقی من فلان (فلاں سے میرا حق لینے کے لیے میں نے تیرے لیے سند کر دی ہے) اور اس کے لام کو ضمہ بھی دیا جاتا ہے، یہ لفظ مذکر و مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، ابن السکیت کا بیان ہے کہ سلطان مؤنث ہے، بولا جاتا ہے قضیت بہ علیہ السلطان اور قد آمنتہ السلطان، ازہری نے کہا ہے کہ چونکہ سلطان کا لفظ مذکر ہے اس لیے کبھی مذکر بھی استعمال ہوا ہے، اللہ تعالٰے کا ارشاد ہے۔ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ"

پ ۸/۱۶ پ ۱۱/۱۲ پ ۱۲/۹ و ۱۵ پ ۱۳/۱۴ و ۱۶ پ ۱۴/۳ و ۱۹ پ ۱۵/۷ و ۱۴
پ ۱۸/۳ پ ۱۹/۱۶ پ ۲۲/۸ پ ۲۳/۶ و ۹ پ ۲۴/۸ و ۹ و ۱۱ پ ۲۵/۱۴
پ ۲۷/۱ و ۴ و ۵ و ۱۲

سُلْطٰنًا پ ۴/۷ پ ۵/۹ و ۱۸
پ ۶/۲ پ ۷/۱۵ پ ۸/۱۱ پ ۱۵/۶ و ۹ پ ۱۷/۱۶ پ ۲۰/۷ پ ۲۱/۷

سُلْطٰنُہٗ اس کا زور، سُلْطَانُ مضاف، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۱۴/۱۹

سُلْطٰنِیَہْ میری حکومت، سُلْطَانِ مضاف، ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ، ہٗ سکتہ کی ہے، پ ۲۹/۸

سَلَّطَهُمْ اس نے ان کو زور دیا، اس نے ان کو مسلط کیا، سَلَّطَ تَسْلِیْطٌ سے جس کے معنے مسلط کرنے اور غلبہ دینے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، پ ۵/۹

سَلَفَ وہ ہو چکا، وہ گذر گیا، (نَصَرَ) سَلْفٌ سے جس کے معنے گذرنے اور ہو چکنے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب
پ ۳/۶ پ ۴/۱۴ و ۱۵ پ ۷/۳ پ ۹/۱۹

سَلَفًا گیا گذرا، اصل میں یہ مصدر ہے اور بطور اسم کے متقدم یعنی گذرے ہوے کے معنے میں استعمال ہوتا ہے، پ ۲۵/۱۱

سَلَقُوْكُمْ وہ تم سے چڑھ چڑھ بولے، وہ تم سے بڑھ بڑھ کے بولے، (ضَرَبَ) سَلَقُوْا سَلْقٌ سے جس کے معنے زبان سے ستانے کے ہیں، ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، پ ۲۱/۱۸

سَلَكَ اس نے چلائیں، (نَصَرَ) سَلْکٌ سے جس کے معنے چلانے اور داخل کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ ۱۶/۱۱

سَلَكَكُمْ اس نے تم کو چلایا، اس نے تم کو داخل کیا، اس میں کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر ہے، پ ۱۹/۱۶

سَلَكْنٰهُ ہم نے اس کو گھسا دیا، ہم نے اس کو داخل کر دیا، ہم نے اس کو چلایا، سَلَكْنَا سَلَكَ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، پ ۱۹/۱۵

سَلَكَهٗ اس نے اس کو چلایا، اس نے اس کو داخل کیا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے، پ ۲۳/۱۶

سَلْمٌ صلح، اسم ہے، مذکر بھی استعمال ہوتا ہے اور مؤنث بھی، پ ۲۶/۸

سِلْمٌ اسلام، اسم ہے، مذکر و مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، پ ۲/۹

سَلَمٌ صلح، انقیاد، فرمانبرداری و اطاعت، عاجزی، تَسْلِيْمٌ سے بمعنی سپرد کرنے کے اسم ہے، (ملاحظہ ہو تسلیماً) پ ۵ پ ۱۴/۱۸،۱۹

سَلَمًا پورا، سالم سَلِمَ يَسْلَمُ کا مصدر ہے جس کے معنے خالص اور پورے طور پر کسی دوسرے کے لئے ہو جانے کے آتے ہیں۔ پ ۲۳/۱۷

سَلَّمَ اس نے بچا لیا، تَسْلِيْمٌ سے بمعنے بچانے کے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تَسْلِيْمًا) پ ۱

سُلَّمٌ سیڑھی، زینہ، سیڑھی کے ذریعہ چونکہ آدمی سلامتی کے ساتھ اوپر پہنچ جاتا ہے اس لیے اس کا نام سُلَّم ہوا، سَلَالِمُ اور سَلَالِيْمُ جمع، پ ۲۷/۳ سُلَّمًا پ ۷

سَلَّمْتُمْ تم نے حوالہ کر دیا، تم نے سپرد کر دیا، تم نے سونپ دیا، تَسْلِيْمٌ سے بمعنے سپرد کرنے کے، ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر (ملاحظہ ہو تَسْلِيْمًا) پ ۲/۱۴

سَلِّمُوْا تم سلام کرو، تم سلام بھیجو، تَسْلِيْمٌ سے بمعنے سلام کرنے کے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، پ ۱۸/۱۴ پ ۲۲/۴

سَلْوٰى سلوی، ایک پرندہ ہے جس کو بٹیر کہتے ہیں، ناموس میں اس کا واحد سَلْوَاةٌ مرقوم ہے اور صحاح میں اخفش سے منقول ہے کہ میں نے اس کا واحد نہیں سنا ان کا بیان ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا واحد جمع ہی کی طرح ہے[1]۔ پ ۱ پ ۹/۱۰ پ ۱۶/۱۳

---

[1] تاج العروس

سَلْهُمْ ان سے پوچھ، اس میں هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب ہے۔ ملاحظہ ہو سَلْ ا پ ۲۹/۲

سَلِيْمٌ چنگا، بے روگ، ستھرا، تندرست، سَلَامَةٌ سے صفت مشبہ کا صیغہ، ملاحظہ ہو سَلَام ا پ ۱۹/۹ ۲۳/۷

سُلَيْمَانَ علیہ الصلوٰۃ والسلام، مشہور جلیل القدر نبی کا اسم گرامی، جو حضرت داؤد علیہ السلام کے فرزند ارجمند تھے، اور ان کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے آپ کی ذات بابرکات میں نبوت اور سلطنت دونوں کو مکمل طور پر جمع فرمایا، اور ایسی بادشاہی عطا فرمائی جو اگلوں پچھلوں میں سے کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ جن، ہوا اور پرندوں کو آپ کے لیے مسخر فرمایا، سب جانوروں کی بولیاں جانتے تھے چیونٹی تک کی بات سمجھ لیتے، آپ کے فضائل وکمالات اور آپ کی پیغمبرانہ سیرت کا تذکرہ جابجا قرآن مجید میں تفصیل سے مذکور ہے، حافظ ابوحیان اندلسی، البحر المحیط میں لکھتے ہیں،

"سلیمان عجمی نام ہے، علمیت اور عجمہ کی بنا پر غیر منصرف ہے، عجمیت میں اس کی نظیر اس امر میں کہ اس کے بھی آخر میں الف اور نون ہو، ھامان ماھان اور سامان ہیں۔ اور اس کا غیر منصرف ہونا علمیت اور الف ونون کی زیادت کی بنا پر نہیں کیونکہ الف ونون کا زیادہ ہونا اشتقاق و تصریف پر موقوف ہے، اور عجمی ناموں میں عربی اشتقاق وتصریف کا دخل نہیں ہوتا" [1]

آپ کی والدہ ماجدہ بڑی عابدہ زاہدہ تھیں، سنن ابن ماجہ میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کی ماں نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا تھا کہ بیٹا رات میں زیادہ نہ سونا کیونکہ رات میں زیادہ سونا مرد کو قیامت کے دن محتاج کر کے چھوڑتا ہے۔[2]

فصل خصومات میں اصابت رائے کا ملکہ بچپن ہی سے آپ کو عطا ہوا تھا، صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دو عورتیں تھیں جن کے ساتھ ان کے دو بیٹے تھے، بھیڑیا آیا اور دونوں میں سے ایک کے

---

[1] البحر المحیط ج ۱ ص ۳۱۸ و ۳۱۹ طبع مصر ۱۳۵۱ھ [2] سنن ابن ماجہ ص ۹۵ طبع فاروقی دہلی

لڑکے کو لے گیا تھا بنا جس کو یہ حادثہ پہنچا تھا وہ کہنے لگی تیرے لڑکے کو اٹھا کر لے گیا ہے، دوسری بولی نہیں تیرے لڑکے کو ..... لے گیا ہے چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس فیصلہ کے لیے پہنچیں، آپ نے بڑی کے حق میں فیصلہ صادر فرمایا پھر وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے آئیں اور ان سے اس واقعہ کا ذکر کیا ......
آپ نے فرمایا کہ میرے پاس چھری لاؤ میں اسے کاٹ کر دونوں کو دیدوں، تب چھوٹی کہنے لگی اللہ آپ پر رحم کرے ایسا تو نہ کیجیے یہ اسی کا بیٹا ہے، اس پر آپ نے چھوٹی کے حق میں فیصلہ فرمادیا، نیز صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ ایک زبردست جن گذشتہ شب اچانک ظاہر ہوا تاکہ میری نماز میں خلل ڈالے، حق تعالیٰ شانہ نے مجھے اس پر قابو عطا فرمایا میں نے اسے پکڑ لیا اور ارادہ کیا کہ اسے مسجد کے ستونوں میں سے کسی ستون سے باندھ دوں، کہ تم سب اسے دیکھ لو، پھر مجھے اپنے بھائی سلیمان کی دعا یاد آئی رَبِّ هَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّن بَعْدِي (اور بخش مجھ کو وہ بادشاہی کہ نہ پھبے کسی پر میرے پیچھے) تو میں نے اس کو ذلیل کر کے لوٹا دیا[1] امام احمد، نسائی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب بیت المقدس کی تعمیر کی تو اللہ عزوجل سے تین چیزیں مانگیں دو چیزیں تو اللہ نے ان کو عطا فرمائیں اور ہمیں امید ہے کہ تیسری ہمارے لیے ہو، وہ[1] حکم مانگا جو اس کے حکم کے موافق ہو اور اللہ نے عطا فرمایا، دو[2] بادشاہی مانگی جو آپ کے بعد کسی کے لیے مناسب نہ ہو اور اللہ نے عطا فرمائی، تیسرے[3] مانگا کہ جو شخص بھی گھر سے چلے اور اس کا ارادہ اس مسجد میں نماز ادا کرنے کے سوا اور کچھ نہ ہو تو وہ اپنے گناہ سے اس طرح نکل جائے جیسا کہ اس دن جب کہ اس کی ماں نے اسے جنا تھا، ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ یہ چیز اللہ نے ہمیں عطا فرمادی[2]

انگشتری سلیمان کا جو قصہ مشہور ہے وہ اسرائیلی فسانہ ہے جس کی کوئی اصل حقیقت نہیں ہے

[1] ان دونوں روایتوں کیلیے ملاحظہ ہو صحیح البخاری کتاب احادیث الانبیاء، قول اللہ تعالیٰ ووهبنا لداؤد سلیمان

[2] البدایۃ والنہایۃ ج ۲ ص ۲۶ طبع مصر ۱۳۵۱ھ

پ ۱/۱۲ پ ۶/۳ پ ۷/۱۶ پ ۱۷/۲ پ ۱۹/۱۷ و ۱۸ پ ۲۲/۸ پ ۲۳/۱۲

فصل المیم

سَمٌّ ناکہ، سوراخ، ہر تنگ سوراخ کو سَمٌّ کہتے ہیں جیسے کہ سوئی کا ناکہ اور ناک اور کان کا بندھا ہوا سوراخ ہوتا ہے۔ سُمُوْمٌ جمع ہے۔ ۱۲

سَمَآءٌ آسمان، ابر، بارش، امام راغب مفردات میں لکھتے ہیں

"ہر شئے کا جو بالا ہے وہ سماء ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ بعض نے کہا ہے کہ ہر "سماء" اپنے نیچے کی نسبت سے سماء اور اپنے اوپر کی نسبت سے ارض ہے، بجز سماء علیا کے کہ وہ "سماء" ہی ہے "ارض" نہیں ہے اور آیت شریفہ اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَھُنَّ (اللہ وہ ہے جس نے بنائے سات آسمان اور زمین بھی اتنی ہی) کو اسی پر محمول کیا ہے،

نیز مطر (بارش، مینہ) کو سماء سے موسوم کیا گیا کیونکہ وہ اسی سے نکلتا ہے، بعض نے کہا ہے کہ جب تک زمین پر نہ گرے "سماء" سے موسوم ہے، یہ اسی اعتبار سے ہے جو سابق میں مذکور ہوا،

اور "نبات" (اُگنے والی چیز) کا نام سماء یا تو اس بنا پر رکھا گیا کہ وہ "مطر" سے جو کہ سماء ہے وجود میں آتا ہے اور یا اس لیے کہ زمین سے مرتفع ہوتا ہے،

اور وہ سماء جو ارض کے مقابل ہے مؤنث ہے اور کبھی مذکر بھی آتا ہے، اور واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، کیونکہ ارشاد ہے ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰھُنَّ (پھر قصد کیا آسمان کی طرف سو ٹھیک کر دیا ان کو) اور کبھی اس کی جمع میں سَمٰوٰتٌ بھی کہا جاتا ہے فرمایا خَلَقَ السَّمٰوٰتِ (پیدا کیا آسمانوں کو) قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ (پوچھ کون ہے رب آسمانوں کا) اور اَلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِہٖ (آسمان پھٹ جائے گا اس دن میں) فرمایا تو مذکر استعمال کیا اور اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ (جب آسمان پھٹ جائے) اور اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ (جب آسمان چر جائے) کہا تو مؤنث استعمال کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نخل اور شجر اور ان کے قائم مقام دیگر اسماء اجناس کی طرح ہے کہ مذکر بھی استعمال کیے جاتے ہیں اور

مونث بھی۔ اور واحد نیز جمع کے لفظ سے ان
کی تعبیر کی جاتی ہے،

جو سماء کہ بمعنی مطر (یعنی بارش) ہے
وہ مذکر ہی استعمال ہوتا ہے اور اس کی جمع اَسْمِیَۃٌ
آتی ہے"

اور ابن خالویہ لغوی لکھتے ہیں

"ہر وہ شئے جو تجھ پر بلند ہو سماء ہے اور اسی لیے
گھر کی چھت سماء سے موسوم ہے۔ اللہ تبارک
وتعالیٰ کا ارشاد ہے مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ
يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ یعنی
ان کافروں میں سے جو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم سے حسد کرتے ہیں جس کو بھی یہ خیال ہو کہ
اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد نہ فرمائے گا تو اس
بسبب اسے چاہیے کہ ایک رسی تان لے،
اِلَى السَّمَاءِ یعنی گھر کی چھت میں ثُمَّ لْيَقْطَعْ
پھر گلا گھونٹ ڈالے فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ
كَيْدُهٗ مَا يَغِيظُ اب دیکھے کچھ جاتا رہا اس کی
اس تدبیر سے اس کا غصہ" ؎2

امام نووی تہذیب الاسماء واللغات میں رقم طراز
ہیں،

"سماء یعنی سقف معروف (آسمان) ہے،
سُمُوٌّ سے مشتق ہے جس کے معنے بلندی کے ہیں
اس میں دونوں لغتیں ہیں، تذکیر بھی اور تانیث بھی،
ابو الفتح ہمدانی نے کہا ہے، تذکیر تین وجوہ میں سے
کسی ایک وجہ کی بنا پر ہوتی ہے اوّل یہ کہ چھت
کے معنے ہوں دوسرے باعتبار لفظ کے تیسرے
اس بنا پر کہ وہ جمع مذکر ہے خواہ جمع واقع ہوئی
ہو یا نہ ہو اس صورت میں یہ سَمَاءَۃٌ کی جمع ہو گا۔
جیسے عطا عطاءۃ کی جمع ہے ابو الفتح نے اس کو جمع
سے ہی موسوم کیا ہے جو اہل لغت کی اصطلاح
ہے، لیکن اہل نحو صرف اس کو اسم جمع یا اسم جنس
سے موسوم کرتے ہیں اور اس کو جمع نہیں کہتے

؎1 واضح رہے کہ مفردات راغب کے مطبوعہ نسخہ میں طباعت کی غلطی کی وجہ سے عبارت اس طرح چھپ گئی ہے ووجہ ذلک انھا کالنخل فی الشجر ماجری مجراہ من اسماء الجنس الذی یذکر ویونث لیکن تاج العروس میں یہ عبارت اس طرح منقول ہے ووجہ ذلک انہ کالنخل فی الشجر ما یجری مجراہ من اسماء الاجناس التی تذکر وتونث ہم نے اسی عبارت کو سامنے رکھ کر ترجمہ کیا ہے،

؎2 کتاب اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن العظیم ص ۳۷، ۳۸ طبع دار الکتب المصریہ ۱۳۶۰ھ

ابو الفتح کا بیان ہے کہ تانیث دو وجہوں سے ہوتی ہے ایک یہ وہ ان اسماء کے باب سے ہے جو تانیث کے لیے موضوع ہیں جیسے اتان اور عناق ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ اہل حجاز کی لغت پر سماء کی جمع ہے کیونکہ وہ اس قسم کو مؤنث استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ ھذہ الصخر، ھذہ النمر، اور ھذہ السعیر کو بمعنی صخور اور غور بولتے ہیں"[1]

پ۱ ۲ و ۳ و ۴، پ۲ ۱ و ۴، پ۳ ۹،
پ۶ ۲، پ۷ ۵ و ۷ و ۱۰ و ۱۰، پ۸ ۲ و ۱۲، پ۹ ۲ و ۱۰ و ۱۶ و ۱۸، پ۱۱ ۸ و ۹،
پ۱۱ ۱۲، پ۱۲ ۴ و ۵، پ۱۳ ۸ و ۱۶ و ۱۷ و ۱۸، پ۱۴ ۲ و ۸ و ۱۳ و ۱۷،
پ۱۵ ۱۰ و ۱۱ و ۱۷ و ۱۸، پ۱۶ ۱۱، پ۱۷ ۱ و ۲ و ۳ و ۶ و ۷ و ۹ و ۱۱ و ۱۵ و ۱۶،
پ۲۰ ۱ و ۲ و ۱۴ و ۱۶، پ۲۱ ۲ و ۶ و ۸ و ۱۰ و ۱۴،
پ۲۳ ۱۶، پ۲۴ ۷ و ۱۲ و ۱۶، پ۲۵ ۷ و ۱۳ و ۱۴ و ۱۷، پ۲۶ ۱۵ و ۱۸، پ۲۷ ۲ و ۳،
پ۲۷ ۴ و ۸ و ۱۱ و ۱۲ و ۱۷ و ۱۹، پ۲۹ ۱ و ۲ و ۵ و ۷ و ۹ و ۱۱ و ۱۳،
پ۲۹ ۱ و ۲، پ۳۰ ۱ و ۴ و ۶ و ۷ و ۹ و ۱۰ و ۱۱ و ۱۳ و ۱۶

سَمّٰعُوْنَ خوب کان لگا کر سننے والے، جاسوس، سَمْعٌ سے مبالغہ کا صیغہ جمع مذکر، سَمّاعٌ کی جمع، واضح رہے کہ خوب کان لگا کر سننا کبھی تو جاسوسی کے لیے ہوتا ہے، اور کبھی قبول کرنے اور ماننے کے لیے، چنانچہ سَمّاعٌ کا استعمال جاسوس اور مطیع دونوں کے لیے ہوتا ہے، یہاں بھی دونوں معنے بن سکتے ہیں بعض مفسرین نے پہلے معنے اختیار کیے ہیں اور بعض نے دوسرے، پ۶ ۱۰، پ۱۰ ۱۳

یَمَانٍ موتی۔ سِمِیْنٌ کی جمع (ملاحظہ ہو سَمِیْنٍ) پ۱۲ ۹

سَمْعٌ قوت سامعہ۔ کان، سننا، پہلے دونوں معنی کے اعتبار سے اسم ہے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے سَمِعَ یَسْمَعُ کا مصدر،

امام راغب، مفردات میں تحریر فرماتے ہیں، "کان کی وہ قوت کہ جس سے آوازیں دریافت کی جاتی ہیں، سَمْعٌ ہے اور اس کے فعل کو بھی سَمْعٌ کہتے ہیں سَمِعَ سَمْعًا آتا ہے اور کبھی سمع سے کان مراد لیا جاتا ہے جیسے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ (اللہ نے مہر کر دی ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر) اور کبھی لفظ سَمَاعٌ کی طرح اس کا فعل (یعنی سننا) مراد ہوتا ہے جیسے اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ (وہ تو سننے سے برطرف کر دیے گئے ہیں) اور ارشاد ہے اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ

[1] تہذیب الاسماء واللغات ج ا ص ۱۵۶ طبع منیریہ مصر

ریا قوت سماعت سے کام نے دل لگا کر) اور کبھی سمجھنا اور کبھی ماننا اس سے مراد لیا جاتا ہے بولتے ہیں اِسْمَعْ مَا اَقُوْلُ لَكَ (سن جو میں تجھ سے کہتا ہوں) اور لَمْ تَسْمَعْ مَا قُلْتُ (تو نے سنا نہیں جو میں نے کہا) تمہارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تو سمجھا نہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا (اور جو کوئی پڑھے ان پر ہماری آیتیں تو کہیں ہم سن چکے اگر ہم چاہیں تو ہم بھی کہہ لیں) اور فرمایا سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا (سنا ہم نے اور نہ مانا) یعنی ہم نے تیری بات کو سمجھا اور تیرے حکم کو نہ مانا اور اسی طرح ارشاد سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (ہم نے سنا اور قبول کیا) ہے، یعنی ہم نے سمجھا اور حکم مانا اور آیت شریفہ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ (اور ان جیسے مت ہو جنہوں نے کہا ہم نے سن لیا اور وہ سنتے نہیں) میں یہ بھی معنے ہو سکتے ہیں کہ "ہم نے سمجھا حالانکہ وہ سمجھتے نہیں" اور یہ بھی کہ "ہم نے سمجھا حالانکہ وہ اس کے مطابق عمل نہیں کرتے" اور جب کسی نے اس کے مطابق عمل نہ کیا تو وہ گویا اس شخص کے حکم میں ہوا کہ جس نے سنا ہی نہیں

اور اس کے بعد ارشاد فرمایا وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِیْهِمْ خَیْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا (اور اگر اللہ جانتا ان میں کچھ بھلائی تو ان کو سنا دیتا اور اگر ان کو اب سنا دے تو ضرور بھاگیں) یعنی ان کو سمجھانا بایں طور کہ ان میں وہ قوت کہ جس سے وہ سمجھ لیتے عطا فرما دیتا۔

اور ارشاد وَاسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ (اور کہتے ہیں سن نہ سنایا جائیو) یہ دو طرح پر بولا جاتا ہے ایک انسان پر بہرا ہونے کی بد دعا کے لیے دوسرے اس کے لیے دعا کے واسطے[۱]، پس اول کی مثال تو جیسے اَسْمَعَكَ اللّٰهُ ہے یعنی اللہ تجھے بہرا کرے اور دوسرے کی یہ کہ کہا جاتا ہے اَسْمَعْتُ فُلَانًا (میں نے فلانے کو سنائی) جب کہ تم نے اس کو گالیاں دی ہوں، اور اس کا استعمال گالی دینے کے بارے میں متعارف ہے، اور مروی ہے کہ اہل کتاب نبی علیہ السلام والصلوات سے یہی کہا کرتے تھے، اس گمان میں ڈالنے کے لیے کہ وہ آپ کی تعظیم کرتے اور آپ کے حق میں دعا کرتے ہیں، حالانکہ اس کے ذریعہ آپ پر بد دعا کرتے تھے،

اور ہر وہ مقام کہ جہاں اللہ نے اہل ایمان

[۱] پہلی صورت میں غَیْرَ مُسْمَعٍ کے معنے ہوں گے "کچھ سنائی نہ دے" اور دوسری صورت میں "گالی نہ سنائی جائے"

کے لیے سمع کا اثبات فرمایا ہے یا کافروں سے اس کی نفی کی ہے یا سننے پر رغبت دلائی ہے وہاں مقصود معنی پر دھیان کرنا اور اس میں غور و فکر کرنا ہے جیسے اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا (یا ان کے کان ہیں جن سے سنتے ہیں) اور صُمٌّ بُكْمٌ (بہرے ہیں گونگے) اور فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ (ان کے کانوں میں ہے بوجھ)،

اور جب اللہ تعالیٰ کو آپ سمع سے موصوف کیجئے گا تو اس سے مراد اللہ کا مسموعات کا علم اور ان کی جزا دینے کا ارادہ فرمانا ہے جیسے قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا (سن لی اللہ نے بات اس عورت کی جو جھگڑتی تھی تجھ سے اپنے خاوند کے حق میں) اور لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا (بے شک اللہ نے سنی ان کی بات جنھوں نے کہا)،

اور آیت شریفہ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاۗءَ (البتہ تو نہیں سنا سکتا مُردوں کو اور نہیں سنا سکتا بہروں کو اپنی پکار) یعنی تم انہیں سمجھا نہیں سکتے کیونکہ وہ اپنی بدعملی کی بنا پر قوت عاقلہ کو جو کہ انسانیت کی مخصوص حیات ہے گم کر دینے میں مُردوں کی طرح سے ہیں،

اور ارشاد ہے اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ (کیا عجیب دیکھتا اور سنتا ہے) یعنی اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ اس شخص کی زبان سے نکلے گا جو اس کی عجائب حکمت پر مطلع ہوگا، اور اس کے بارے میں مَآ اَبْصَرَهٗ وَمَآ اَسْمَعَهٗ نہیں کہا جائے گا کیونکہ سابق میں یہ مذکور ہو چکا کہ حق تعالیٰ شانہ کو صرف اسی صفت سے موصوف کیا جا سکتا ہے جو ذکر مسموع میں وارد ہوا ہو،

اور کفار کے بارے میں جو ارشاد ہے اَسْمِعْ بِهِمْ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا (کیا خوب سنتے اور دیکھتے ہوں گے جس دن آئیں گے ہمارے پاس) اس کے معنے یہ ہیں کہ جو چیزیں اپنی جانوں پر ظلم کرنے اور غور و فکر کے ترک کر دینے کی بنا پر آج ان سے مخفی اور گم ہیں، اس دن ان کو سن رہے ہوں گے اور دیکھ رہے ہوں گے"،

سَمْعٌ بمعنی کان کا استعمال واحد اور جمع دونوں کے لیے ہوتا ہے ارشاد ہے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ (اللہ نے مہر کر دی ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر) کیونکہ حسب

تصریح صحاح یہ اصل میں مصدر ہے، جمع اَسْمَاعٌ
اور جمع قلت اَسْمُعٌ اور جمع الجمع اَسَامِعُ ہے
پ ۱۱/۹، پ ۱۲/۲، پ ۱۴/۲و۱۷، پ ۱۵/۴، پ ۱۸/۵، پ ۱۹/۱۵، پ ۲۲/۱۷
پ ۲۹/۲و۱۱ **سَمْعًا** پ ۱۲/۲، پ ۲۶/۳

سَمِعَ اس نے سنا، سَمْعٌ اور سَمَاعَۃٌ سے
ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ ۴/۱۰، پ ۲۸/۱

سَمِعَتْ اس (عورت) نے سنا، سَمْعٌ سے
ماضی کا صیغہ واحد مونث غائب، پ ۱۲/۱۴

سَمِعْتُمْ تم نے سنا، سَمْعٌ سے ماضی کا
صیغہ جمع مذکر حاضر، پ ۵/۱۷

سَمِعْتُمُوْہُ تم نے اس کو سنا، اس میں واو
اشباع کا ہے اور ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، پ ۱۸/۸

سَمْعُکُمْ تمہارے کان، تمہاری قوت سماعت،
سَمْعٌ مضاف، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ،
پ ۷/۱۱، پ ۲۳/۱۷

سَمِعْنَا ہم نے سنا، ہم نے سمجھا، سَمْعٌ سے
ماضی کا صیغہ جمع متکلم، پ ۱/۱۱، پ ۳/۸، پ ۴/۱۱، پ ۵/۴، پ ۶/۲
پ ۹/۱۷و۱۸، پ ۱۷/۵، پ ۱۸/۲و۱۳، پ ۲۰/۷، پ ۲۱/۱۵، پ ۲۳/۱۰، پ ۲۶/۴
پ ۲۹/۱۱

سَمِعُوْا انہوں نے سنا، سَمْعٌ سے ماضی کا
صیغہ جمع مذکر غائب، پ ۷/۱، پ ۱۸/۱۷، پ ۲۰/۹، پ ۲۲/۱۴

پ ۲۹/۱و۴
سَمْعِہٖ اس کا کان، اس کی قوت سماعت،
سَمْعٌ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف
الیہ، پ ۲۵/۱۹

سَمِعَہٗ اس نے اسے سنا، سَمِعَ صیغہ
ماضی، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، پ ۲/۶

سَمْعِہِمْ ان کے کان، سمع مضاف،
ہِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ،
پ ۱/۱و۲، پ ۱۴/۲۰، پ ۲۴/۱۷، پ ۲۶/۳

سَمْکَہَا اس کا ابھار، اس کی چھت،
اس کی بلندی، سَمْکَ مضاف، ہَا ضمیر
واحد مونث غائب مضاف الیہ، سَمْکٌ
اصل میں سَمَکَ یَسْمُکُ کا مصدر ہے،
اس کے معنے بلند کرنے کے ہیں، چھت بھی
چونکہ بلند ہوتی ہے اس لیے اس کو بھی سَمْکٌ
کہتے ہیں، پ ۳۰/۴

سَمٰوٰتٍ آسمان، سَمَآءٌ کی جمع،
(ملاحظہ ہو سَمَآء) پ ۱/۳و۴و۱۳و۱۴
پ ۲/۴، پ ۳/۲و۸و۱۱و۱۷، پ ۴/۲و۴و۵و۹و۱۰و۱۱
پ ۵/۱۵و۱۹، پ ۶/۳و۷و۱۰، پ ۷/۳و۹و۷و۸و۱۵و۱۹
پ ۸/۱۴، پ ۹/۱۰و۱۳، پ ۱۰/۱۱، پ ۱۱/۳و۹و۷و۱۱و۱۲و۱۵

پ ۱۲ — ۱ و ۲ و ۹ و ۱۰ ، پ ۱۳ — ۵ و ۶ و ۷ و ۸ و ۱۰ و ۱۳ و ۱۴ و ۱۵ و ۱۶ و ۱۷ و ۱۹

پ ۱۴ — ۶ و ۷ و ۱۲ و ۱۳ و ۱۶ و ۱۷ ، پ ۱۵ — ۵ و ۶ و ۱۱ و ۱۲ و ۱۴ و ۱۶ و ۱۹

پ ۱۶ — ۷ و ۹ و ۱۰ ، پ ۱۷ — ۲ و ۳ و ۵ و ۹ و ۱۵ ، پ ۱۸ — ۴ و ۵ و ۱۱ و ۱۲ و ۱۵ و ۱۶

پ ۱۹ — ۳ و ۶ و ۱۷ ، پ ۲۰ — ۱ و ۳ و ۱۷ ، پ ۲۱ — ۲ و ۴ و ۵ و ۶ و ۱۰ و ۱۱ و ۱۲ و ۱۳

پ ۲۱ — ۱۴ ، پ ۲۲ — ۶ و ۷ و ۹ و ۱۳ و ۱۷ ، پ ۲۳ — ۴ و ۵ و ۱۰ و ۱۴ و ۱۵

پ ۲۴ — ۱ و ۲ و ۳ و ۶ و ۹ و ۱۱ و ۱۶ ، پ ۲۵ — ۲ و ۳ و ۴ و ۶ و ۷ و ۱۳ و ۱۴ و ۱۶

پ ۲۵ — ۱۵ و ۱۷ و ۱۸ و ۱۹ و ۲۰ ، پ ۲۶ — ۱ و ۴ و ۹ و ۱۰ و ۱۴ و ۱۷ ، پ ۲۷ — ۴ و ۹

پ ۲۷ — ۶ و ۱۲ و ۱۷ ، پ ۲۸ — ۲ و ۴ و ۶ و ۹ و ۱۱ و ۱۳ و ۱۵ و ۱۸ و ۱

پ ۲۹ — ۱ و ۹ ، پ ۳۰ — ۲ و ۱۰

سَمُوْمٌ (لو) تیز بھاپ، وہ گرم ہوا جو زہر کا سا اثر کرے "سموم" کہلاتی ہے، مؤنث ہے، سَمَائِمُ جمع، پ ۱۴ / ۳ ، ۲۷ / ۱۵ و ۳

سَمُّوْهُمْ تم ان کا نام لو، سَمُّوْا تَسْمِیَۃٌ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، راغب اصفہانی مفردات میں لکھتے ہیں،

"آیت شریفہ وَجَعَلُوْا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ قُلْ سَمُّوْھُمْ (اور مقرر کرتے ہیں اللہ کے لیے شریک کہہ ان کا نام لو) سے یہ مراد نہیں ہے کہ لات، عزّیٰ وغیرہ ان کے ناموں کا ذکر کرو بلکہ معنی یہ ہیں کہ جن کو تم معبود کہتے ہو ان کے متعلق تحقیق بتاؤ نیز یہ کہ ان اسماء کے معانی آیا ان میں موجود بھی ہیں، اسی لیے بعد میں ارشاد ہے "اَمْ تُنَبِّئُوْنَہٗ بِمَا لَا یَعْلَمُ فِی الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ (یا اللہ کو بتلاتے ہو جو وہ نہیں جانتا زمین میں یا کرتے ہو اوپری اوپری باتیں)"

(ملاحظہ ہو تسمیۃ) پ ۱۳ / ۱۱

سَمِیًّا ہم نام، نظیر، امام راغب لکھتے ہیں،

"آیت کریمہ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا (کسی کو پہچانتا ہے تو اس کے نام کا) یعنی اس کی کوئی نظیر جانتے ہو جو اس کے نام کا مستحق ہو یا اس کی صفت سے متصف کہ حقیقتاً اس کا استحقاق رکھتا ہو، اور یہ معنی نہیں ہیں کہ "آیا کسی کو جانتے ہو جو اس کے نام سے موسوم ہو" کیونکہ اللہ کے بہت سے اسماء ہیں جن کا غیر پر بھی اطلاق ہوتا ہے لیکن اللہ کے لیے جب ان کا استعمال ہو تو وہ معنی نہیں ہوتے جو غیر کے لیے استعمال کرتے وقت ہوتے ہیں" پ ۱۶ / ۷ و ۴

سَمَّيْتُمُوْهَا تم نے ان کا نام رکھ لیا ہے، سَمَّيْتُمْ تَسْمِیَۃٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر

حاضر، واو اشباع کا اور ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے جو جمع کے لیے استعمال کی گئی ہے، راغب لکھتے ہیں،

"آیت کریمہ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ اِلَّا اَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوْهَا (کچھ نہیں پوجتے ہو سوائے اس کے، مگر نام ہیں جو رکھ لیے ہیں تم نے) کے معنے یہ ہیں کہ جن ناموں کا تم ذکر کرتے ہو ان کے مسمیات نہیں ہیں بلکہ یہ اسماء ایسے ہیں جو بغیر مسمے کے ہیں کیونکہ ان ناموں کے اعتبار سے بتوں کے بارے میں جو وہ اعتقاد رکھتے ہیں اس کی حقیقت ان میں پائی ہی نہیں جاتی"

پ ۲۷/۵، پ ۱۲/۱۵، پ ۱۶ ث

سَمَّيْتُهَا میں نے اس کا نام رکھا، سَمَّيْتُ تَسْمِيَةٌ سے ماضی کا واحد متکلم، ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب، (ملاحظہ ہو تَسْمِيَة) پ ۳/۱۲

سَمِيْعٌ سننے والا، سَمْعٌ سے بر وزن فَعِيْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ، اسماء حسنی میں سے ہے، جب یہ حق تعالیٰ شانہ کی صفت واقع ہو تو اس کے معنے ہیں "ایسی ذات جس کی سماعت ہر شئے پر حاوی ہے"، پ ۱/۱۵ و ۱۶، پ ۲/۶ و ۱۲ و ۱۶، پ ۳/۲ و ۱۲

پ ۴/۳، پ ۶/۱۴، پ ۷/۸، پ ۸/۱، پ ۹/۱۴ و ۱۶، پ ۱۰/۱ و ۳ و ۴

پ ۱۱/۱ و ۲ و ۱۲، پ ۱۲/۲ و ۱۴، پ ۱۳/۱۸، پ ۱۵/۱، پ ۱۶/۱ و ۱۵ و ۱۶، پ ۱۸/۱ و ۹ و ۱۴

پ ۱۹/۱۵، پ ۲۰/۱۳، پ ۲۱/۲ و ۱۲، پ ۲۲/۱۲، پ ۲۴/۷ و ۱۱ و ۱۹

پ ۲۵/۲ و ۱۴، پ ۲۶/۱۳، پ ۲۸/۱ **سَمِيْعًا** پ ۵/۵ و ۱۶

پ ۶/۱، پ ۲۹/۱۹

سَمَّاكُمْ اس نے تمہارا نام رکھا، سَمّٰى تَسْمِيَةٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر، (ملاحظہ تسمیۃ) پ ۱۷

سَمِيْنٍ فربہ، موٹا تازہ، سِمَنٌ سے جس کے معنے فربہ ہونے کے ہیں، بر وزن فَعِيْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ، سِمَانٌ جمع پ ۲۶/۱۹

فصل النون

سِنٌّ دانت، اَسْنَانٌ جمع، پ ۶/۱۱

سَنَا چمک دار روشنی، بعض اہل لغت نے اس کو "بجلی کی چمک" کے ساتھ مخصوص کیا ہے، لیکن صحیح یہی ہے کہ لفظ عام ہے، بجلی کی کوندہ ہو یا آگ کی چمک، ہر تیز روشنی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے[۱] حافظ ابن حجر عسقلانی نے ایک نظم کی ہے جن میں ان الفاظ کو شمار کرایا ہے جن کو معرب بتایا گیا ہے اس میں سنا بھی مذکور ہے[۲]

[۱] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو تاج العروس [۲] یہ نظم فتح الباری ج ۸ ص ۲۰۳ و ۲۰۴ طبع مصر سنہ ۱۳۲۸ھ سر ہند گورہی

لیکن امام سیوطی نے لکھا ہے کہ مجھے پتہ نہیں چلا کہ کسی اور نے بھی ایسا کہا ہو، [۱] پ ۱۵/۱۲

سَنَابِلَ بالیں، خوشے، سُنْبُلُ کی جمع، پ ۳/۴

سُنْبُلٰتٍ بالیں، خوشے، سُنْبُلَۃٌ کی جمع پ ۱۲/۱۶

سُنْبُلَۃٍ بال، خوشہ، پ ۳/۴

سُنْبُلِہٖ اس کی بال، اس کا خوشہ، سُنْبُلِ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۱۲/۱۶

سُنَّتَنَا ہمارا دستور، سُنَّۃَ مضاف، نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، (ملاحظہ ہو سُنَّۃ) پ ۱۵/۸

سُنْدُسٍ باریک ریشم، لاہی، باریک دیبا، علامہ سیوطی، الاتقان میں لکھتے ہیں

"جوالیقی نے کہا ہے کہ فارسی میں اس کے معنی باریک دیبا کے ہیں، اور لیث کہتے ہیں کہ ارباب لغت اور مفسرین میں کسی کا اس میں اختلاف نہیں کہ یہ معرب ہے۔ شیدلہ نے اس کو ہندی بتایا ہے" [۲] پ ۱۵/۱۶ پ ۲۵/۱۶ پ ۲۹/۱۹

سُنَنٌ راہیں، طریقے، سُنَّۃٌ کی جمع پ ۴/۵ پ ۵/۲

سَنَۃٌ سال، برس، سِنُوْنَ، سَنَہَاتٌ سَنَوَاتٌ جمع سَنَۃٌ کی اصل سَنْہَۃٌ تھی، جَبْہَۃٌ کی طرح پھر اس کا لام کلمہ حذف کر کے اس کی حرکت نون کی طرف نقل کر دی گئی تو سَنَۃٌ باقی رہ گیا، اور بعض کا قول ہے کہ اس کی اصل سَنَوَۃٌ تھی واو کے ساتھ (اور جس طرح کہ ہا کو حذف کیا گیا) واو کو حذف کر دیا گیا ہے۔ علامہ مجدالدین فیروزآبادی نے قاموس میں اس کو باب ہا میں تو اس بنا پر ذکر کیا کہ اس کا لام کلمہ ہا ہے اور معتل میں دوبارہ اس لیے بیان کیا کہ اس کا لام کلمہ واو ہے اور دونوں وجہیں صحیح ہیں گو بعض نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے، کیونکہ تصریف لفظی دونوں کی شاہد ہے [۳] امام راغب مفردات میں لکھتے ہیں،

"السنۃ، اس کی اصل کے بارے میں دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ اس کی اصل سَنْہَۃٌ ہے، کیونکہ وہ بولتے ہیں سانہت فلانا یعنی

[۱، ۲] الاتقان ج ۱ ص ۱۳۸ طبع مصر

[۳] تاج العروس باب الہا فصل السین

میں نے فلاں سے سال کے سال معاملہ کیا، نیز (تصغیر میں) اُسْنَیْهَۃٌ کہتے ہیں، بعض نے کہا ہے کہ اسی سے لَمْ یَتَسَنَّہْ ہے یعنی سالوں کے اس پر گذر جانے سے نہیں بدلا اور اس کی طراوت نہیں گئی، اور کہا گیا ہے کہ اس کی اصل واو سے ہے کیونکہ سَنَوَاتٌ بولتے ہیں، اور اسی سے سَانَیْتُ ہے اور ہا وقف کے لیے ہے جیسے کہ کِتَابِیَہْ اور حِسَابِیَہْ میں ہے۔

ابن السکیت جو لغت کے امام ہیں فرماتے ہیں،

"اہل عرب کے یہاں سنۃ بارہ مہینوں کا نام ہے انہوں نے سنہ کو دو حصوں (شتاء اور صیف) میں تقسیم کر دیا ہے اور سنہ کی ابتدا اول شتاء (ابتداء سرما) سے شروع کی کیونکہ وہ مذکر ہے اور صیف (گرما) مؤنث ہے پھر شتاء کے بھی دو حصے کیے نصف اول کا نام شتوی ہے اور نصف آخر کا ربیع پس شتوی بھی تین مہینے کا ہوا اور ربیع بھی تین مہینے کا، اور تین مہینے صیف کے رکھے اور تین قیظ کے" [1]

سنہ کی دو قسمیں ہیں ایک قمری یا ہلالی دوسری شمسی، قمری سال کا شمار رویت ہلال سے ہے، سال میں بارہ مرتبہ چاند ہلال بن کر افق آسمان پر نمودار ہوتا ہے جس سے سنہ قمری کے بارہ مہینے شمار ہوتے ہیں اور شمسی سنہ آفتاب کے بارہ برجوں کو قطع کرنے کی مدت کا نام ہے [2]، احکام شرعیہ میں سنہ قمری معتبر ہے،

عَامٌ اور سَنَۃٌ میں آیا کوئی فرق ہے یا نہیں، تو واضح رہے کہ قاموس میں عامٌ کی کی تشریح میں لفظ سَنَۃٌ اور سَنَۃٌ کی تشریح میں لفظ عَامٌ مذکور ہے، علامہ سید مرتضے زبیدی لغوی، اپنے شیخ (محمد بن الطیب فاسی لغوی شارح قاموس) سے ناقل ہیں کہ "ان دونوں کے اتحاد پر ہی مصنف (قاموس) گئے ہیں لہذا انہوں نے ان میں سے ہر ایک کی تفسیر

[1] تاج العروس فصل السین من باب الواو والیاء

[2] بطرس بستانی نے دائرۃ المعارف میں قاموس کے حوالے سے سنہ شمسی کی مذکورہ بالا تحدید نقل کی ہے لیکن مجھے قاموس میں نہیں ملی، (ملاحظہ دائرۃ المعارف لفظ سنہ ج ۱۰ ص ۲۴۲ طبع الہلال مصر ۱۸۹۸ء

دوسرے لفظ سے کی ہے" لیکن دیگر علماء عربیت
نے ان دونوں کے باہم فرق بیان کیا ہے، چنانچہ
علامہ موہوب بن احمد جوالیقی فرماتے ہیں
"کہ عوام الناس عامٌ اور سنۃٌ میں باہم فرق
نہیں کرتے اور دونوں کے ایک ہی معنے قرار
قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ غلط ہے اور صحیح وہ ہے
جس کے متعلق مجھے احمد بن یحییٰ سے اطلاع
ملی ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ سنۃٌ جس
دن سے بھی تم شمار کرو (آئندہ سال کے) اسی
دن تک ہے اور عامٌ بغیر "شتاء" اور "صیف"
کے نہیں ہوتا۔ سنۃ اور عام ایک شئے سے
مشتق نہیں ہیں، لہذا جب تم آج سے لے کر
آج ہی دن تک شمار کروگے تو وہ سنۃ ہوگا
اس میں نصف شتاء اور نصف صیف داخل ہو جائیگا
اور عام جب تک کہ صیف اور شتاء دونوں
موسم کامل طور پر انہوں نہیں ہوتا، چنانچہ اول
میں تو چوتھائی (اس برس کا) اور چوتھائی (اگلے
برس کا) اور نصف (اس سال کا) اور نصف
(اس سال کا) آجائے گا، اور جب یہ قسم کھائے

کہ لا یکلمہ عاماً (اس سے ایک عام تک
یہ بات نہ کرے گا) تو کچھ اس میں کا اور کچھ اس
میں کا شامل نہیں ہوگا بلکہ "شتاء" اور "صیف"
ہی مراد ہوں گے پس لفظ "عامٌ" "سنۃ" سے
اخص ہے اور اس بنا پر تم کہو گے کہ ہر "عام" "سنۃ"
ہے اور ہر "سنۃ" "عام" نہیں ہے"
اور علامہ ازہری کہتے ہیں
" عام وہ سال ہے جو موسم سرما اور موسم گرما کے
ساتھ آتا ہے اور اس بنا پر عام، سنۃ کی نسبت
سے اخص مطلق ہے اور جب کسی دن سے لے کر
اسی دن تک (سال کا) شمار کرو، تو وہ "سنۃ"
کہلائے گا، اور اس میں کبھی نصف گرما اور نصف
سرما بھی ہوگا، اور "عام" میں صیف و شتاء لگاتار
ہوتے ہیں،
اور امام سہیلی؛ الروض الانف میں ان کے باہمی
فرق میں یوں رقم طراز ہیں،
" "سنۃ" عام سے لمبا ہوتا ہے یہ آفتاب کے
دوروں میں سے ایک دورہ ہے اور برخلاف
سنہ کے عام کا استعمال عربی مہینوں کے

ــه اہل عرب نے سال کی جو دو حصوں پر تقسیم کی ہے اس کا بیان ہے "شتاء" سے موسم سرما نصف اول مراد ہے اور "صیف" (موسم گرما) سے نصف ثانی۔ ــه اس اصطلاح کے لیے ملاحظہ ہو نقطہ سوئم

ہے ہوتا ہے۔ [۱]

اور امام راغب اصفہانی نے ایک اور فرق بیان کیا ہے،

"عام، سنۃ کی طرح ہی سے ہے لیکن بسا اوقات سنہ کا استعمال اس سال کے لیے ہوتا ہے جس میں سختی یا قحط ہو، اور اسی لیے قحط کی تعبیر لفظ سنہ سے کی جاتی ہے، اور عام کا استعمال اس برس کے لیے ہوتا ہے جس میں فراخی اور سرسبزی ہو، ارشاد ہے فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ (ایک برس اس میں مینہ برسے گا لوگوں پر اور اس میں رس نچوڑیں گے)" پ ۱/۱۱، پ ۶/۱۲، پ ۱۷/۱۳، پ ۲۰/۱۴، پ ۲۱/۱۴، پ ۳/۲۶، پ ۲۹/۶

سِنَةٌ اونگھ، غفلت، غنودگی، وَسِنَ يَوْسَنُ کا مصدر ہے اس کے معنے غنودگی سے بے ہوش ہونے کے آتے ہیں، سِنَةٌ اصل میں وَسْنٌ تھا عِدَةٌ کی طرح سے اس کی ہاء، واو محذوف کے بدلہ میں ہے، پ ۳/۲

سُنَّةٌ راہ، رسم، دستور، طریقہ جاریہ، اسم ہے۔ سُنَنٌ جمع، سَنَّ کا استعمال متعدد معانی میں ہوتا ہے من جملہ اس کے دستور جاری کرنے کے معنی بھی ہیں، چنانچہ تاج المصادر میں مرقوم ہے،

"السن ..... ونہادن وسنہ الحدیث سَنَّ لَكُمْ مَعَاذٌ"

سنۃ اسی معنی کے اعتبار سے اس کا اسم ہے، راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

"سنۃ النبی سے مراد وہ طریقہ ہے جس کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انتخاب فرماتے تھے، اور "سنۃ اللہ" کا استعمال حق تعالیٰ کے دستور حکمت اور طریقِ طاعت کے لیے ہوتا ہے جیسے سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (رسم پڑی ہوئی اللہ کی جو چلی آتی ہے پہلے سے، اور تو ہرگز نہ دیکھے گا اللہ کی رسم کو بدلتے) اور وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَحْوِيلًا (اور ہرگز نہ پائے گا اللہ کا دستور ٹلتا) یہ اس پر تنبیہ ہے کہ شریعتوں کے احکام فروعی کی اگرچہ صورتیں مختلف ہیں، لیکن جو غرض کہ ان سے مقصود ہے یعنی نفس کی پاکیزگی اور اللہ تعالیٰ کے ثواب اور اس کے قرب تک رسائی

[۱] ان تینوں حوالوں کے لیے ملاحظہ ہو تاج العروس، فصل العین من باب المیم،

کے لیے آراستگی مختلف و متغیر نہیں ہوتی" پ ۹/۱۹

پ ۱۴/۱ پ ۱۵/۸و۴۸ پ ۲۲/۱و۵و۶و۷ پ ۲۴/۱۴ پ ۲۶/۱۱

سِنِیْنَ سال، برس، قحط، سَنَۃٌ کی جمع،
مصباح میں ہے کہ
"سَنَۃٌ کی جمع، جمع مذکر سالم کی طرح آتی ہے،
چنانچہ سِنُوْنَ اور سِنِیْنَ بولا جاتا ہے اور اضافت
کے لیے نون حذف ہو جاتا ہے، اور ایک لغت
(بولی) میں تمام حالتوں میں یا برقرار رہتی ہے،
اور نون کو حرف اعراب قرار دیا جاتا ہے جس کو
نکرہ ہونے کی حالت میں تنوین دی جاتی ہے
اور اضافت میں حذف نہیں کیا جاتا گویا کہ وہ
اصول کلمہ میں ہے اور اسی لغت پر یہ حدیث
ہے اللھم اجعلھا سنین کسنین یوسف"
سابق میں راغب کی تصریح گذر چکی ہے کہ سنۃ
کا استعمال بسا اوقات سال قحط کے لیے ہوتا
ہے وَلَقَدْ اَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ
(اور ہم نے پکڑ لیا فرعون والوں کو قحطوں میں)
میں سنین سے سالہائے قحط ہی مراد ہیں،
تاج العروس میں تصریح ہے کہ یہ اس کے
مجازی معنے ہیں، پ ۹/۶ پ ۱۱/۶ پ ۱۲/۱۵و۱۶ پ ۱۵/۱۳و۱۴و۱۶

پ ۱۶/۱۱ پ ۱۸/۶ پ ۱۹/۶و۱۵ پ ۲۱/۴

فصل الواو

سُوْءٌ برائی، آفت، گناہ، براکام، عیب"
سُوْءٌ سے اسم ہے، علامہ سید مرتضیٰ زبیدی
نے لکھا ہے کہ یہ آفات و امراض کا ایک
جامع نام ہے، [۱] امام راغب فرماتے
ہیں،
"سُوْءٌ ہر وہ چیز ہے جو انسان کو غم میں ڈال
دے، خواہ دنیوی امور میں سے ہو یا اخروی
امور سے، احوال نفسیہ میں سے ہو یا احوال
بدنیہ میں سے، یا ان حالات میں سے ہو کہ جو
جاہ و مال کے چھوٹ جانے اور دوست کے
بچھڑ جانے سے پیدا ہوتے ہیں"
قرآن مجید میں اس کا استعمال جن معانی میں ہوا
ہے امام سیوطی نے ان کو تفصیل کے ساتھ
قلم بند کیا ہے، فرماتے ہیں
"سُوْء کئی طرح استعمال ہوتا ہے، شدت
کے لیے یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ
(وہ کرتے تھے تم پر سخت عذاب) کو پنچیں[۲]

[۱] تاج العروس فصل السین من باب الھمزہ

کاٹنے کے لیے وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ (اور اس کو ہاتھ نہ لگاؤ بری طرح یعنی ناقہ کی کونچیں نہ کاٹ ڈالنا) زنا[۳] کے لیے مَا جَزَاۤءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا (اور کچھ سزا نہیں ہے ایسے شخص کی جو چاہے تیرے گھر میں برائی یعنی زنا) برص[۴] کے لیے بَیْضَاۤءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ (سفید بغیر عیب یعنی برص کے) عذاب[۵] کے لیے اِنَّ الْخِزْیَ الْیَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ (بے شک رسوائی آج کے دن اور برائی منکروں پر ہے) شرک[۶] کے لیے مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ (ہم تو کرتے نہ تھے کچھ برائی یعنی شرک) گالی گلوچ[۷] کے لیے لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ (اللہ پسند نہیں کرتا کسی بری بات کو یعنی کسی کی دشنام طرازی کو) وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ (اور کھولیں اپنی زبانیں برائی کے ساتھ) گناہ[۸] کے لیے یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ (کرتے ہیں براکام جہالت سے) بِئْسَ[۹] (برا ہے) کے معنے میں وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ (اور ان کے لیے ہے برا گھر) ضرر[۱۰] کے لیے وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ (اور دور کر دیتا ہے سختی) وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ (اور مجھ کو برائی کبھی نہ پہنچتی) قتل و ہزیمت[۱۱] کے لیے لَمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ (نہ پہنچی ان کو کچھ آنچ)"[۱]

پ۱/۶، پ۲/۵، پ۳/۱۱، پ۴/۹و۱۴، پ۵/۱۳و۱۵، پ۶/۱، پ۷/۱۲، پ۸/۷و۱۷، پ۹/۶،۱۱و۱۳، پ۱۰/۱۱، پ۱۲/۵و۶و۱۳و۱۷، پ۱۳/۱،۸و۹و۱۳، پ۱۴/۱۰و۱۳،۱۹،۲۱، پ۱۶/۱۰، پ۱۹/۱۲و۱۶، پ۲۰/۱و۷، پ۲۱/۱۸، پ۲۲/۱۴، پ۲۳/۱۷، پ۲۴/۲و۳و۵و۱۰و۱۱، پ۲۶/۶، پ۲۸/۷

سَوْءٌ برا ہونا، سَاۤءَ یَسُوْٓءُ کا مصدر ہے

پ۱۱/۱، پ۱۶/۵، پ۱۷/۵و۶، پ۱۹/۲، پ۲۶/۹و۱۰

سَوَاۤءٌ برابر، اسم مصدر ہے بمعنی استوار یعنی دونوں طرف سے بالکل برابر ہونے کے نہ اس کا تثنیہ بنایا جاتا ہے نہ جمع،[۲] امام سیوطی، اتقان میں لکھتے ہیں

"(سواء) بمعنی مستوی (برابر) ہوتا ہے کسرہ کے ساتھ اس میں قصر ہوگا جیسے مَكَانًا سُوًى (جگہ برابر یعنی صاف اور ہموار) اور فتحہ کے ساتھ مد جیسے سَوَاۤءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ (برابر ہے ان کو تو ڈرائے یا نہ ڈرائے) اور بمعنے وسط بھی آتا ہے

---

[۱] الاتقان ج ۱ ص ۲۴۰ طبع مصر ۱۳۴۳ھ

[۲] روح المعانی ج ۱ ص ۱۱۹ طبع مصر

اس صورت میں بھی فتحہ کے ساتھ مدہو گا جیسے فِیْ سَوَاءِ الْجَحِیْمِ (بیچوں بیچ دوزخ کے) اور بمعنی تمام کے بھی اس صورت میں بھی ایسا ہی ہوگا جیسے فِیْ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ سَوَاءً (چار دن میں پورا ہوا) اور وَاهْدِنَا اِلٰی سَوَاءِ الصِّرَاطِ (اور بتلا دے ہم کو پوری راہ) بھی اسی معنی میں ہوسکتا ہے، قرآن مجید میں یہ لفظ بمعنے غیر (سوائے) کے نہیں آیا ہے، اور کہا گیا ہے کہ آیا ہے، چنانچہ البرہان[1] میں آیت فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِیْلِ (وہ بہک گیا غیر راستہ کو) کو اسی سے قرار دیا ہے، حالانکہ یہ وہم ہے اور اس سے بہتر تو کلبی کا قول ہے جو ارشاد الٰہی وَلَا اَنْتَ مَکَانًا سُوًی (اور نہ تو سوائے اس جگہ کے) کے بارے میں ہے کہ سوی استثنائیہ ہے اور مستثنیٰ محذوف ہے ای مکانا سوی هٰذا المکان، کرمانی نے اس کو اپنی کتاب عجائب میں بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں بعد ہے کیونکہ سوی استثنائیہ بغیر مضاف ہوئے استعمال ہی نہیں ہوتا"[2] پ ۱/۱۳۱، پ ۳/۱۵

پ ۴/۳، پ ۵/۹، پ ۶/۱۳۰، ۱۴۹، پ ۹/۱۴، پ ۱۰/۳، پ ۱۳/۸ و ۱۵، پ ۱۴/۱۶، پ ۱۷/۷ و ۱۰، پ ۱۹/۱۱، پ ۲۰/۹، پ ۲۱/۷، پ ۲۲/۱۸، پ ۲۳/۶ و ۱۱، پ ۲۴/۱۶، پ ۲۵/۱۶ و ۱۸، پ ۲۷/۳، پ ۲۸/۷ و ۱۳

سَوْاٰتِکُمْ تمہاری شرم گاہیں، سَوْاٰتِ سَوْءَةٌ کی جمع مضاف ہے کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، (ملاحظہ ہو سَوْءَةٌ) پ ۸

سَوْاٰتِهِمَا ان دونوں کی شرم گاہیں، سَوْاٰتِ مضاف، هُمَا ضمیر تثنیہ غائب، مضاف الیہ، پ ۸/۹، پ ۱۶/۱۶

سُوَاعًا ایک بت کا نام، مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں،

"اس لفظ کا مشتق منہ کلام عرب میں نہیں میں نہیں ملتا، ممکن ہے کہ سوع سے مشتق ہو جس کے معنے زمانہ کے ہیں"[3]

قرآن مجید میں سورہ نوح کے اندر وَدّ، سُوَاع، یَغُوْث، یَعُوْق اور نَسْر کے نام آئے ہیں، ابن جریر طبری، اور ابن المنذر نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے

[1] البرہان فی مشکلات القرآن، علامہ ابو المعالی عزیزی بن عبد الملک المعروف بشیدلہ کی مشہور تصنیف۔ [2] الاتقان ج ۱ ص ۱۶۳ طبع مصر [3] ارض القرآن ج ۲ ص ۶ ۲۳ طبع معارف پریس اعظم گڈھ

کہ یہ وہ بت تھے جن کی حضرت نوح علیہ السلام کے عہد میں پرستش کی جاتی تھی[1]، بعد میں زمانہ جاہلیت کے اندر عرب کے مختلف قبیلوں میں بھی ان کی پوجا کا سلسلہ جاری تھا، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی ارض القرآن میں اصنام عرب پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

"ایک غیر مرفوع روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بت گذشتہ بزرگوں کے مجسمے تھے جن کو اہل عرب نے بعد میں پوجنا شروع کر دیا تھا، ممکن ہے کہ ان میں بعض ایسے بھی ہوں لیکن زیادہ صحیح خیال یہ ہے کہ اصل میں یہ مختلف ستاروں کی خیالی صورتیں تھیں، نسر کے متعلق تو تحقیق ثابت ہے کہ وہ ایک آسمانی شکل کا نام ہے، اسی پر دوسرے بتوں کو بھی قیاس کرنا چاہیے، بعد میں مرور زمانہ سے ان کی اصلیتیں ذہنوں سے اتر گئیں اور وہ صرف پتھر اور مٹی کا ڈھیر بن کر رہ گئے، چنانچہ لات، عزّیٰ اور مناۃ کی یہی صورت تھی، لات، گول سپید پتھر تھا اور اس پر ایک عمارت بنی تھی، عزّیٰ، ایک درخت تھا اس کے نیچے ایک بت تھا، چاروں طرف چہار دیواری تھی

مناۃ، پتھر کی ایک چٹان تھی، دوسرے بتوں کی مختلف صورتیں تھیں

وَدّ دراز قد مرد کی صورت ایک تہمد کمر میں لپیٹے، ایک چادر اوڑھے، گلے میں تلوار حمائل، کمان لٹکی ہوئی، ایک طرف ترکش پڑا ہوا، سامنے نیزہ اس میں جھنڈا بندھا ہوا، ستارہ جبار کی تقریباً یہی شکل ہے، سواع کی شکل عورت کی تھی، آسمان میں مرۃ مسلسلہ، ذات الکرسی، وغیرہ عورت کی شکلیں ہیں، یغوث (فریادرس) کی شکل شیر کی تھی، ستارہ اسد ہوگا، ایک فریادرس اور مددگار کی صورت شیر سے بہتر کیا خیال کی جاسکتی ہے؟ یعوق (مصیبتوں کو روکنے والا) کی صورت گھوڑے کی تھی، ستاروں کی ایک شکل فرس بھی ہے، عربوں کے نزدیک تو فرس حقیقۃً ان کے مصائب کا چارہ گر ہے، نسر ایک پرندہ کی شکل پر تھا، نسر طائر اور واقع ستاروں کی دو مشہور شکلیں ہیں، بابل میں نسروک کی جو سنگی صورت ملی ہے وہ بالکل گدھ کی شکل ہے"[2]

لیکن ہمارے نزدیک اس سارے بیان میں اتنی حقیقت تو بلاشبہ صحیح ہے کہ نسر طائر اور نسر

[1] تفسیر امام ابن جریر طبری ج ۲۹ ص ۵۸ طبع میمنیہ مصر، اور الدر المنثور امام سیوطی ج ۶ ص ۲۶۹ طبع میمنیہ مصر [2] ارض القرآن ج ۲ ص ۳۴

واقع آسمان میں ستاروں کی دو مشہور شکلوں کے نام ہیں، باقی اس سے زیادہ جو کچھ ہے اس کے پیچھے جب تک تاریخی شواہد نہ ہوں قیاس آرائی سے زیادہ اس کی کیا وقعت ہے، چنانچہ سید صاحب نے بھی اس کو "زیادہ صحیح خیال" ہی فرمایا ہے۔ نیز اس کے قیاس ہونے کی بھی بایں الفاظ تصریح کر دی ہے کہ،

"نسر کے متعلق تو تحقیق ثابت ہے کہ وہ ایک شکل کا نام ہے اسی پر دوسرے بتوں کو بھی قیاس کرنا چاہیے"

گویہ قیاس بھی مطّرد نہیں کہ بعض میں تو یہ تکلف چلتا ہے اور بعض میں سرے سے اس کی گنجائش ہی نہیں رہتی، ہوا یہ کہ اولاً "نسر" سے ذہن "نسر واقع" اور "نسر طائر" کی طرف منتقل ہوا، پھر وَدّ اور سُواع کے بارے میں قیاس سے کام لیا تو تیر نشانہ پر بیٹھتا نظر آیا، چونکہ یہاں زمینی مورتوں اور آسمانی شکلوں میں مشابہت نظر آئی اس لیے ان دونوں کے بارے میں معنوی مناسبت کو نظر انداز کیا گیا "یغوث" اور "اسد" "یعوق" اور "فرس" میں بہ تکلف معنوی مناسبت پیدا کی گئی، اور "شیر" کو جو حیوان مفترس اور حقیقت میں ایک خونخوار درندہ ہے فریادرس بنا کر ستارہ "اسد" کی خیالی صورت کا بت قرار دیا گیا "لات"، "عزّیٰ" اور "مناۃ" میں قیاس کیا کام دیتا اس لیے یہ کہہ دیا کہ "مرور زمانہ سے ان کی اصلیتیں ذہنوں سے اتر گئیں اور وہ صرف پتھر اور مٹی کا ڈھیر بن کر رہ گئے" ہم پوچھتے ہیں کہ اگر عرب کے بت اصل میں مختلف ستاروں کی خیالی صورتیں تھیں، تو بتایا جائے کہ لات، عزّیٰ اور مناۃ کن ستاروں کی خیالی صورتیں ہیں، نیز ستارہ جبار کی خیالی صورت کی مورت کا نام وَدّ کس مناسبت سے پڑ گیا، تاریخی چیزوں میں محض قیاس سے کیا کام چل سکتا ہے، پھر یہ امر خود اپنی جگہ ثبوت طلب ہے کہ یغوث کی شکل شیر کی اور "یعوق" کی صورت گھوڑے کی اور نسر کی مورت پرندہ کی تھی، سید صاحب نے لکھا ہے کہ "بتوں کی یہ شکلیں فتح الباری تفسیر سورہ نوح میں مذکور ہیں"[1] لیکن دشواری یہ ہے کہ حافظ ابن حجر عسقلانی جو فتح الباری کے مصنف ہیں وہ خود اس بات پر اعتماد نہیں کرتے، چنانچہ حافظ صاحب نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے درج ذیل ہے، فرماتے

---

[1] ملاحظہ ہو حاشیہ ارض القرآن ج ۲ ص ۲۳۸

ہیں،

وحکی الواقدی قال — اور واقدی نے بیان
کان ود علی صورۃ رجل — کیا ہے کہ وُدّ مرد کی شکل
وسواع علی صورۃ امرأۃ — پر تھا اور سواع عورت
ویغوث علی صورۃ اسد — کی شکل پر اور یعوق
ویعوق علی صورۃ فرس — گھوڑے کی شکل پر اور نسر
ونسر علی صورۃ طائر و — پرندہ کی شکل پر اور یہ بیان
ھذا شاذ والمشھور — شاذ ہے اور مشہور یوں
انھم کانوا علی صورۃ — ہے کہ یہ سب بت
البشر وھو مقتضی — انسانی شکل کے تھے اور
ما تقدم من الآثار — یہی ان آثار کا مقتضے ہے
فی سبب عبادتھا[1] — جو ان کی پوجا کی وجہ کے
سلسلہ میں گذر چکے ہیں،

ایسی حالت میں واقدی کے بیان کی خصوصاً آثار کی سلف کی موجودگی میں جو وقعت ہو سکتی ہے ظاہر ہے،

اور بالفرض اگر واقدی کا بیان صحیح بھی تسلیم کیا جائے تب بھی اس کے معارض نہیں کہ یہ بت گذشتہ بزرگوں کے مجسمے تھے، کیونکہ ممکن ہے کہ یہ معنوی طور پر ان کی صفات کے مجسمے ہوں۔ وُدّ مردانگی میں کامل شخص کا مجسمہ ہو اور سواع عبادت میں کامل عورت کی مورت، اور یغوث مرد شجاع کی صورت اور یعوق سبقت لے جانے والے اور توانا کی شکل، اور نسر بڑی عمر والے بزرگ کی شبیہ، چنانچہ علامہ بقاعی کی یہی رائے ہے[2]

علاوہ ازیں یہ خیال زیادہ صحیح اس وقت قرار دیا جا سکتا ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ بت پرستی کے شروع ہونے سے پہلے ستاروں کی خیالی صورتیں متعین ہو چکی تھیں اور بحیثیت دیوتا کے ان کی پرستش کی جاتی تھی، حالانکہ خود سید صاحب ابتدائے بحث میں فرما چکے ہیں کہ "مذہب کی ابتدائی تاریخ کا مظہر یعنی "اعاظم پرستی" عرب میں موجود تھی صحیح بخاری میں عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ عرب کے مشہور بت لات، ودّ، یغوث وغیرہ پہلے زمانہ کے بزرگوں کے نام ہیں، بعد میں اہل عرب ان کی مورتیں بنا کر پوجنے لگے، قرآن مجید ذیل کی آیت پاک میں اسی مذہب کی تردید کرتا ہے،

---

[1] فتح الباری شرح صحیح بخاری ج ۸ ص ۳۴۵ طبع مصر ۱۳۴۸ھ [2] الفتوحات الالہیہ بتوضیح تفسیر الجلالین للدقائق الخفیہ معروف بہ حاشیہ جمل علی الجلالین ج ۴ ص ۴۱۴ طبع مصر ۱۳۵۲ھ

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ	خدا کے سوا اور جن کو
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ	پکارتے ہو تمہاری ہی
اَمْثَالُكُمْ (اعراف)	طرح مخلوق ہیں،
اِنْ كُلُّ مَنْ فِي	آسمان و زمین میں جو چیز بھی
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	ہے وہ خدا کے سامنے
اِلَّا اٰتِي الرَّحْمٰنِ	غلام بن کر آنے والی
عَبْدًا (مریم)	ہے، [1]

صحیح بخاری کی جس روایت کا حوالہ سید صاحب نے دیا ہے وہ بروایت عطا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس طرح مروی ہے کہ وہ بت جو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں تھے بعد میں عرب میں رائج ہو گئے چنانچہ وُدّ دومۃ الجندل میں کلب کا بت تھا، ہذیل کا سواع تھا، یغوث پہلے مراد کا تھا، پھر سبا کے نزدیک جرف میں بنی غطیف کا ہوا، یعوق ہمدان کا تھا، اور نسر حمیر میں سے آل ذی الکلاع کا، یہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے نیک مردوں کے نام تھے جب وہ مر گئے تو شیطان نے ان کی قوم کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ جن مجالس میں یہ لوگ بیٹھتے تھے وہاں ان کے مجسمے کھڑے کر کے ان مجسموں کو ان ہی کے نام پر موسوم کر دیا جائے چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا اُس وقت ان کی پرستش ہوئی نہیں تا آنکہ یہ لوگ مر کھپ گئے اور ان مجسموں کے متعلق خصوصی معلومات جاتی رہی تب ان کی پوجا ہونے لگی، [2]

گو حسب تصریح ائمہ بخاری کی یہ روایت منقطع [3] ہے، لیکن مفسرین سلف میں سے عکرمہ، ضحاک، قتادہ، اور ابن اسحٰق سے بھی اسی کے قریب قریب منقول ہے، [4] ابن ابی حاتم نے عروہ بن زبیر سے جو مشہور تابعی ہیں روایت کیا ہے کہ یہ پانچوں حضرت آدم علیہ السلام کی صلبی اولاد میں سے تھے، [5] ابو الشیخ نے کتاب العظمۃ [6] میں اور عمر بن شبہ نے کتاب مکہ میں محمد بن کعب قرظی کا بھی یہی قول نقل کیا ہے، [7]

[1] ارض القرآن ج ۲ ص ۱۹۱ [2] صحیح بخاری کتاب التفسیر، سورہ نوح، باب وُدًّا ولا سواعا ولا یغوث ویعوق [3] ملاحظہ ہو ہدی الساری مقدمہ فتح الباری ج ۲ ص ۱۰۴ و ۱۰۵ طبع منیریہ مصر ۱۳۴۷ھ اور عمدۃ القاری ج ۹ ص ۲۴۴ طبع مصر، [4] تفسیر حافظ ابن کثیر ج ۴ ص ۴۲۶ طبع مصر ۱۳۵۶ھ [5] الاتقان از امام سیوطی ج ۱ ص ۱۴۲ طبع مصر [6] روح المعانی ج ۲۹ ص ۷۷ طبع مصر [7] فتح الباری ج ۸ ص ۵۴۲

ابو عبیدہ کا بیان ہے کہ لوگوں کا خیال ہے یہ مجوسی تھے ان کے مجسمے طوفان میں غرق ہوگئے تھے جب پانی خشک ہوا تو ابلیس نے ان کو نکال کر زمین میں پھیلایا، لیکن حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ان کو مجوس کہنا غلط ہے کیونکہ مجوسیت اس کے زمانۂ دراز کے بعد پیدا ہوئی ہے[1]۔

امام سہیلی، التعریف والاعلام فیما ابہم فی القرآن من الاسماء والاعلام میں لکھتے ہیں کہ

"مجھے یہ پتہ نہیں کہ یہ نام عربوں تک کس طرح پہنچے آیا ہندوستان کی طرف سے آئے کیونکہ یہ کہا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد بت پرستی کا مبدا یہی لوگ تھے یا شیطان نے عرب کو اس کا الہام کیا"

علامہ محمد بن علی معروف با بن عسکر نے اس کتاب پر ایک ذیل لکھا ہے جس کا نام ہے التکمیل والاتمام اس میں انہوں نے تصریح کی ہے کہ امام موصوف کا یہ بیان تفسیر شیخ الاسلام بقی بن مخلد سے ماخوذ ہے اس میں مذکور ہے کہ یہ نام ہندوستان پہنچے تو اہل ہند نے اپنے بتوں کو ان اسماء سے موسوم کیا، پھر عرب کی سرزمین میں عمرو بن لحی نے ان ناموں کو داخل کیا ہے[2]"

ابو المنذر ہشام بن محمد بن السائب الکلبی المتوفی ۲۰۴ھ کی کتاب الاصنام احمد زکی پاشا کی تصحیح وتحشیہ کے ساتھ مصر میں شائع ہوچکی ہے جو عرب کی بت پرستی کی تاریخ پر دور اول کے مسلمان مورخین کی قدیم یادگار ہے، ہشام بن الکلبی اگرچہ حدیث میں معتبر نہیں لیکن تاریخ ونسب کا بڑا علامہ تھا، اس نے اپنے باپ محمد بن السائب الکلبی سے نقل کیا ہے کہ عمرو بن لحی کاہن تھا اسے جن نظر آتا تھا، جن نے اس سے کہا تھا کہ تہامہ سے جدہ کے ساحل پر جا، وہاں تجھے تیار شدہ بت ملیں گے انہیں وہاں سے لا کر عرب کو ان کی پرستش کی دعوت دے اہل عرب تیری دعوت کو مان لیں گے، چنانچہ وہ جدہ پہونچا بتوں کو کھود کر اپنے ساتھ لیا اور حج کے موقع پر سارے عرب کو ان کی پرستش کی طرف دعوت دی، عوف بن عذرہ نے جو بنی کلب میں سے تھا اس کی دعوت کو قبول کیا، اور عمرو نے اسے ودّ دیدیا، عوف اسے اپنے ساتھ لے کر دومۃ الجندل آیا، بنو مضر بن

[1] فتح الباری ج ۸ ص ۵۴۲ [2] ایضاً

نزار نے بھی عمرو کی بات مانی تو اس نے ہذیل کے ایک شخص کو جسے حارث بن تمیم بن سعد بن ہذیل بن مدرکہ بن الیاس بن مضر کہا جاتا تھا سواع کو سپرد کیا چنانچہ سواع بطن نخلہ میں اس مقام پر تھا جس کو "رہاط" کہا جاتا ہے، مضر کے آس پاس جو لوگ رہتے تھے اس کی عبادت کرتے تھے، چنانچہ عرب کے ایک شاعر نے کہا ہے

تراهم حول قيلهم عكوفا

كما عكفت هذيل على سواع

(تو ان کو اپنے بادشاہ کے گرد اگرد اس طرح جھکا ہوا دیکھے گا جس طرح کہ ہذیل، سواع کے آگے جھکے ہوئی)[1]

ب ۲۹

سُؤَال مانگنا، پوچھنا، سَأَلَ یَسْأَلُ کا مصدر ہے، امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں،

"سوال کے معنی ہیں، معرفت کی استدعا یا اس چیز کی استدعا جو معرفت تک پہنچا دے نیز مال کی استدعا یا اس چیز کی استدعا جو مال تک پہنچا دے، معرفت کی استدعا کا جواب زبان سے ہوتا ہے اور ہاتھ بذریعہ کتابت یا اشارت اس کا قائم مقام ہوتا ہے اور مال کی استدعا کا جواب ہاتھ سے ہوتا ہے اور زبان وعدہ کی صورت میں یا انکار کی شکل میں اس کی قائم مقام ہوتی ہے،

اگر یہ کہا جائے کہ یہ کہنا کس طرح صحیح ہے کہ سوال معرفت کے لیے ہوتا ہے حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ اللہ تعالے بندوں سے سوال کرے گا جیسے وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ (اور جب کہے گا اللہ اے عیسے مریم کے بیٹے) تو کہا جائے گا کہ یہ لوگوں کو بتلانے اور ان کو سرزنش دینے کے لیے ہے نہ کہ اللہ تعالے کے علم میں لانے کے لیے کیونکہ وہ تو علام الغیوب ہے، لہذا یہ بھی معرفت سے سوال سے خارج نہیں رہتا،

معرفت کے لیے سوال کبھی تو آگاہی حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے اور کبھی سرزنش کے لیے جیسے ارشاد الٰہی ہے وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ (اور جب زمین میں جیتی گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا) اور کبھی مسئول کو جتلانے اور تنبیہ کرنے کے لیے نہ کہ خود اپنی علم و اطلاع کے لیے،

[1] ملاحظہ ہو کتاب الاصنام ص ۴ ۵ لغایت ۵۷ طبع دار الکتب المصریہ ۱۳۴۳ھ

سوال جب کہ معلوم کرنے کے لیے
ہو تو مفعول ثانی کی طرف اس کا تعدیہ کبھی تو بنفسہ
ہوگا اور کبھی بواسطہ حرف جر چنانچہ کہو گے سالتہ
کذا وسالتہ عن کذا وبکذا اور عن کے
ذریعہ تعدیہ زیادہ ہے ارشاد ہے یَسْئَلُوْنَکَ
عَنِ الرُّوْحِ (وہ تم سے روح کے متعلق پوچھ
ہیں) وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ (اور
تجھ سے پوچھتے ہیں ذو القرنین کو) وَیَسْئَلُوْنَکَ
عَنِ الْاَنْفَالِ (تجھ سے پوچھتے ہیں حکم غنیمت
کا) وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ (اور جب تجھ
سے پوچھیں میرے بندے مجھ کو) اور فرمایا سَاَلَ
سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ (مانگا ایک مانگنے والے
نے عذاب پڑنے والا)

اور جب سوال مال کی استدعا کا ہو تو
تعدیہ بنفسہ بھی ہوتا ہے اور بذریعہ من بھی جیسے
وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ
مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (اور جب مانگنے لگو بیبیوں
سے کچھ چیز کام کی تو مانگو پردہ کے باہر سے) اور
وَاسْئَلُوْا مَا اَنْفَقْتُمْ وَلْیَسْئَلُوْا مَا اَنْفَقُوْا
(اور تم مانگ لو جو تم نے خرچ کیا اور وہ کافر مانگ
لیں جو انہوں نے خرچ کیا) اور فرمایا وَسْئَلُوا
اللّٰہَ مِنْ فَضْلِہٖ (اور مانگو اللہ سے اس کا فضل)
فقیر کو بھی جب وہ کسی چیز کی استدعا کرے
تو سائل کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسے
وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (اور سائل کو مت
جھڑک) اور لِلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ"

اور امام ابو جعفر بیہقی، تاج المصادر میں رقم طراز
ہیں

"سَاَلْتُ کے بارے میں دو لغتیں ہیں، ہمزہ
کی تحقیق یعنی اس کو ثابت رکھنا اور یہی لغت
شائع ہے اور اس سے اِسْاَلْ ہوگا، اور اس
کی تخفیف، اور اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ
اس کو اس باب سے (یعنی فَتَحَ یَفْتَحُ ہی سے
رہنے دیجیے) (دوسرے باب کی طرف) نقل نہ کیجیے،
اور دوسری یہ کہ اسے باب فَعِلَ یَفْعَلُ
سے قرار دیجیے اور خِفْتُ اَخَافُ کی طرح
سِلْتُ اَسَالُ کہیے، اس قول پر عین کلمہ واو
ہوگا۔ اور امر دونوں سے سَلْ آئے گا۔

سَئَلَ ایسا فعل ہے جس کا تعدیہ دو مفعولوں
کی طرف ہوتا ہے اور مفعول ثانی تین طرح پر ہوتا
ہے اول یہ کہ اس کی طرف تعدیہ بغیر کسی حرف
ظاہر یا مضمر کے ہو جیسے کہ راجز (رجز خواں) کا

قول ہے ع سالت عمرًا بعد بکر حقا
دوم یہ کہ فعل کا اس کی طرف تعدیہ کسی حرف کے
اضمار کے ساتھ ہو جیسے حق تعالے کا قول ہے
وَلَا يَسْئَلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا (اور نہ پوچھے گا دوست
دوست کو) کہ یہ عن حمیم ہے (عن مضمر
ہے) اور اظہار بھی جائز ہے جیسے وَسْئَلْهُمْ
عَنِ الْقَرْيَةِ (اور پوچھ ان سے حال بستی کا)
سوم یہ کہ مفعول ثانی کے موقع پر استفہام واقع
ہو جیسے سَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَمْ آتَيْنَاهُمْ
(پوچھ بنی اسرائیل سے کس قدر عنایت کیں ہم نے
ان کو) اور وَسْئَلْ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ
مِنْ رُسُلِنَا أَجَعَلْنَا (اور پوچھ دیکھ جو رسول
بھیجے ہم نے تجھ سے پہلے کبھی ہم نے رکھے ہیں)
نیز اس میں ایک مفعول پر بھی اقتصار
جائز ہے اور یہ دو طرح پر ہوتا ہے ایک یہ کہ متعدی
بنفسہ ہو جیسے وَاسْئَلُوا مَا أَنْفَقْتُمْ دوسرے
یہ کہ (باء اور عن) دو حرف کے ذریعہ اس کا تعدیہ
ہو، باء کے ذریعہ جیسے ارشاد ہے سَأَلَ
سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ اور عن کے ذریعہ
جیسے سال عن زید

علامہ ابو السعادات مبارک بن محمد معروف
با بن الاثیر جزری ؒ ارقام فرماتے ہیں کہ
"کتاب اللہ اور حدیث میں دو طرح کا سوال
ہے ایک تو وہ جو ان چیزوں کی وضاحت
کرنے اور سیکھنے کے لیے ہے کہ جن کی ضرورت
پیش آتی ہے ایسا سوال مباح ہوگا یا مستحب
یا مامور بہ، اور دوسرا وہ کہ جو تکلف و تعنت
(غلطیاں ڈھونڈھنا) کے طریقہ پر ہے ایسا سوال
مکروہ اور ممنوع ہے، اور ہر وہ سوال جو اس قسم
کا ہو اور اس کے جواب سے سکوت واقع ہو وہ
سائل کے لیے سرزنش اور زجر ہے اور اگر اس کا
جواب آیا تو وہ عقوبت اور سخت گرفت ہے"[1]

سُوْاٰی ۲۳

سُوْاٰی بر افعل، بر وزن فُعْلٰی اَسْوَءُ کی
تانیث ہے، جس طرح سے کہ اچھے عمل کا نام حُسْنٰی
ہے اسی طرح فعل بد کا نام سُوْاٰی ہے یہ بسبب
صفت ہونے کے افعل التفضیل پر محمول[2] ہے،
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مصدر ہو بر وزن فُعْلٰی

[1] النہایہ فی غریب الحدیث والاثر فصل السین مع الہمزہ
[2] تاج العروس

جیسے کہ نُرْجِعُنَے ہے اس سے مراد جہنم ہے[1]،

پ ۲۱ / ۴

سَوْءَةٌ لاش، عیب، فضیحت، علامہ زمخشری فرماتے ہیں کہ سَوْآۃٌ کے معنے فضیحت کے ہیں کیونکہ اس میں برائی ہوتی ہے[2]، امام راغب نے لکھا ہے کہ فرج (شرم گاہ) کا سَوْءَۃٌ سے کنایہ کیا گیا ہے، اور علامہ ابن الاثیر کا بیان ہے کہ

"اصل میں سَوْءَۃٌ کے معنے فرج (شرم گاہ) کے ہیں، بعد میں اس کو ہر اس شے کے معنے میں نقل کر لیا گیا کہ جب وہ ظاہر ہو تو اس سے حیا آنے لگے خواہ قول ہو یا فعل"[3]

لیث کہتے ہیں کہ

"اس کا اطلاق مرد کی شرم گاہ پر بھی ہوتا ہے اور عورت کی شرم گاہ پر بھی اللہ تعالےٰ فرماتا ہے بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا (کھل گئیں ان پر شرم گاہیں ان کی) اور سَوْءَۃٌ ہر وہ عمل یا امر ہے کہ عیب ناک ہو"[4]

یہاں سَوْءَۃٌ سے کیا مراد ہے اس کے متعلق علامہ ابوحیان لکھتے ہیں

"یہاں سوءۃ سے مراد بعض نے کہا ہے کہ عورت ہے اور اہتمام کے لیے خاص طور پر اسے ذکر کیا گیا گو سارے جسم کا چھپانا مقصود ہے نیز اس کے ستر کی زیادہ تاکید ہوا اور کہا گیا ہے کہ پوری لاش مراد ہے کیونکہ میت سب کی سب عورت اور اسی بنا پر اسے کفن میں لپیٹا جاتا ہے،

ابن عطیہ نے کہا ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ سواۃ سے یہی حالت مراد لی جائے جو کہ مجموعی طور پر دیکھنے والے کو بری لگتی ہے"[5]

پ ۶ / ۹

سُوْدٌ کالے، اَسْوَدُ کی جمع (ملاحظہ ہو اَسْوَدُ)

پ ۲۲ / ۱۶

سُوَرًا سورتیں، سُوْرَۃٌ کی جمع، باجماع علماء معتبرین قرآن مجید کی کل سورتوں کی تعداد[1] ایک سو چودہ ہے

واضح رہے کہ اول کی سات سورتیں

---

[1] ملاحظہ ہو البحر المحیط ج ۷، ص ۱۶۴ طبع مصر ۱۳۲۸ھ [2] تفسیر کشاف ج ۱ ص ۳۳۴ طبع مصر ۱۳۵۴ھ

[3] نہایہ ج ۲ ص ۲۰۵ طبع مصر فصل السین مع الواو [4] تاج العروس

[5] البحر المحیط ج ۳ ص ۶۵-۴۶۶

بقرہ سے لے کر براءۃ تک سبع طوال کہلاتی
ہیں کیونکہ یہ لمبی سورتیں ہیں ان کے بعد کی سورتیں
مئین سے موسوم ہیں کہ ان میں سے ہر سورت
سو آیت سے زیادہ کی یا اس کے قریب قریب
ہے، پھر جو سورتیں ہیں ان کو مثانی کہا جاتا ہے
یا تو اس لیے کہ یہ مئین کے بعد ہیں لہذا مئین
اوائل (پہلی) ہوئیں اور یہ ثوانی (دوسری) ہیں
اور یا اس سبب سے کہ ان کے مضامین مکرر ہیں یہ وہ
سورتیں ہیں جن کی تعداد سو سے کم ہے، مثانی
کے بعد جو چھوٹی سورتیں ہیں انہیں مفصل کہتے
ہیں کیونکہ ان سورتوں میں بسم اللہ کے ذریعہ کثرت
سے فصل واقع ہے نیز محکم بھی ہیں کہ ان کی تفصیل
کر دی گئی ہے[1]،

پھر مفصل بھی طوال، اوساط
اور قصار تین ٹکڑوں میں منقسم ہیں اور ان کی
تعیین میں علما باہم مختلف ہیں، علامہ زین بن
نجیم مصری بحر الرائق شرح کنز الدقائق میں لکھتے
ہیں کہ

"ہمارے اصحاب (فقہاء حنفیہ) جس پر ہیں
وہ یہ ہے کہ سورۃ الحجرات سے لے کر والسماء
ذات البروج تک طوال ہیں اور وہاں سے
لے کر لم یکن تک اوساط اور لم یکن سے
اخیر قرآن تک قصار ہیں، نقایہ میں اسی کی
تصریح کی ہے[2]" ۱۲/پ

سُور دیوار، فصیل، شہر پناہ، شہر کی
چار دیواری کو سُور کہتے ہیں، آسوار اور
سیران جمع جیسے نور کی جمع انوار اور
کوز کی جمع کیزان ہے ۲۷/پ

سُورۃ سورت، علامہ زمخشری کشاف
میں رقم طراز ہیں

"سورۃ قرآن کے متعینہ حصہ کا نام ہے یہ کم سے
کم تین آیت کا ہے اور اس کا واو اگر اصلی ہے
تو یا سورۃ المدینہ پر موسوم ہے جس کے
معنے شہر کی چار دیواری کے ہیں کیونکہ یہ بھی
قرآن کا ایک محدود ٹکڑا ہے جو مستقل طور پر
احاطہ کیے ہوئے ہے جیسے وہ شہر کہ جس کے
گرد فصیل کھنچی ہوتی ہے، اور یا اس لیے کہ فنون
علمیہ اور انواع اقسام کے فوائد پر حاوی ہے
جس طرح کہ شہر پناہ اپنے اندرون کو گھیرے
ہوئے ہوتی ہے

[1] ملاحظہ ہو الاتقان ج ۱ ص ۶۳ و ۶۴ طبع مصر سنہ ۱۳۴۳ھ

[2] البحر الرائق ج ۱ ص ۳۶۰ طبع مصر

اور یا اس "سورۃ" سے موسوم ہے جس
کے معنے رتبہ کے ہیں، یہ دو معنی کی بنا پر ہو سکتا
ہے (۱) اس لیے کہ سورتیں بھی بمنزلہ درجوں
اور مرتبوں کے ہیں کہ جن پر قاری ترقی کرتا جاتا
ہے، نیز خود سورتیں طوال، اوساط اور قصار
پر مرتب ہیں، اور یا اس لیے کہ دین میں ان کی
رفعت شان اور جلالت مرتبت مسلم ہے،
اور اگر اس کے واو کو ہمزہ سے بدلا ہوا
قرار دیا جائے تو جس طرح کہ "سؤرۃ" کے معنے
کسی شئے کے بقیہ اور بچے ہوئے حصہ کے ہیں
یہ بھی قرآن کا ایک ٹکڑا اور حصہ ہے" [1]

پ ۱/۳ پ ۱۰/۱۴و۱۷ پ ۱۱/۵و۹ پ ۱۸/۷ پ ۲۶/۷

سَوْط چمڑے کا کوڑا، اَسْوَاط اور سِیَاط
جمع سَوْط کے معنے اصل میں کسی شئے کے باہم خلط ملط
ہونے کے ہیں، کوڑے کو سوط اسی لیے کہتے
ہیں کہ اس کے تسمے آپس میں بٹے ہوئے
ہوتے ہیں [2] ابن درید کا بیان ہے کہ جب
کوڑے لگائے جاتے ہیں تو کوڑا چونکہ گوشت
کو خون سے خلط ملط کر دیتا ہے اس لیے اس کا
نام سوط ہوا [3] پ ۳۰/۱۴

سَوْفَ عن قریب، جلد، اب، آخر، امام
راغب، مفردات میں فرماتے ہیں:
"سَوْفَ حرف ہے، جو افعال مضارع کو
استقبال کے ساتھ خاص کر کے حال سے علیحدہ
کر دیتا ہے جیسے سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ
(میں بخشواؤں گا تم کو اپنے رب سے) اور
ارشاد الٰہی فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (اب آگے
جان لوگے) اس امر پر تنبیہ ہے کہ جو چیز وہ
طلب کر رہے ہیں گو فی الوقت حاصل نہیں مگر
بعد میں وہ لامحالہ ہو کر رہے گی اور یہ ڈھیل اور
تاخیر کے معنے کا مقتضی ہے"

اور امام سیوطی لکھتے ہیں:
"سوف، سین کی طرح سے ہے بصریوں کے
نزدیک زمانہ کے لحاظ سے یہ سین سے زیادہ
وسیع ہے، کیونکہ حروف کی کثرت معنی کی کثرت
پر دلالت کرتی ہے، اور دیگر علماء کے نزدیک
یہ سین کا مرادف (ہم معنی) ہے البتہ لام کے
داخلہ کے سلسلہ میں سین اس سے علیحدہ ہے
جیسے وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ (اور آگے دے گا
تجھ کو) ابوحیان نے کہا ہے کہ حرکات کے پے درپے

[1] تفسیر کشاف ج ۱ ص ۸۴ ط مصر ۱۳۵۴ھ [2] مفردات راغب [3] تاج العروس

نامناسب ہونے کے باعث سین پر لام کا آنا
ممتنع ہے جیسے کہ سین کا حرج ہے، پھر اتی
میں بھی یہی قاعدہ جاری ہو گیا، ابن باب شاہ کا
بیان ہے کہ سوف کا غالب استعمال وعید اور
تہدید میں ہے اور سین کا وعدہ میں، اور کبھی
سوف وعدہ میں استعمال ہوتا ہے اور سین
وعید میں،[1] پ ۵/۲ و ۷ و ۱۴ و ۱۸، پ ۶/۱ و ۷ و ۱۲
پ ۷/۷ و ۱۴، پ ۸/۳، پ ۹/۶ و ۷، پ ۱۰/۱۰، پ ۱۲/۴ و ۸، پ ۱۳/۵
پ ۱۴/۹ و ۱۳، پ ۱۶/۲ و ۷ و ۸، پ ۱۹/۲ و ۴ و ۷، پ ۲۱/۳ و ۷
پ ۲۳/۹، پ ۲۴/۱ و ۱۳، پ ۲۵/۱۰ و ۱۳، پ ۲۶/۷، پ ۳۰/۹ و ۱۷ و ۱۸
پ ۳۰/۲ و ۷

سُوْقٌ پنڈلیاں، سَاقٌ کی جمع، پ ۲۳/۱۲

سُوْقِہٖ (کھیتی) کی نالیں، اس کی جڑیں، اس کے تنے، سُوْقِ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۲۶/۱۲

سَوَّلَ اس نے بات بنائی، اس نے اچھا کرکے دکھایا، تَسْوِیْلٌ سے جس کے معنے نفس کے اس چیز کو کہ جس پر وہ حریص ہے مزین کرنے اور بری کو اچھی شکل میں پیش کرنے کے ہیں ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ ۲۶/۷

سَوَّلَتْ اس نے بات بنائی، اس نے اچھا کرکے دکھایا، تَسْوِیْلٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب، پ ۱۲/۱۲، پ ۱۳/۴، پ ۱۶/۱۴

سُؤْلَکَ تیری تمنا، تیرا سوال، سُؤْلٌ اس حاجت کو کہتے ہیں جس کی طبیعت کو حرص ہو سُؤْلَ مضاف، کَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ، امام راغب کہتے ہیں،

"سُؤْلٌ اُمْنِیَّۃٌ کے قریب ہے لیکن اُمْنِیَّۃ (تمنا) اس چیز کے لیے بولا جاتا ہے جس کو انسان نے تجویز کیا ہو اور سُؤْلٌ اس تمنا کو کہا جاتا ہے جو طلب بھی کی جا چکی ہو گویا سُؤْلٌ اُمْنِیَّۃٌ کے بعد ہوتا ہے"،

علامہ جاراللہ زمخشری، رقم طراز ہیں

"سُؤْلٌ بروزن فُعْلٌ بمعنے مَفْعُوْلٌ ہے جیسے کہ خُبْزٌ بمعنے مَخْبُوْزٌ اور اُکُلٌ بمعنے مَاکُوْلٌ ہے"[2] پ ۱۶/۱۱

سُوًی صاف، درمیانی، راغب کہتے ہیں،

"جس کی دونوں طرفیں برابر ہوں وہ سوی ہے یہ وصف ہو کر بھی مستعمل ہے اور ظرف ہو کر بھی

[1] الاتقان ج ۱ ص ۱۶۳ طبع مصر

[2] تفسیر کشاف ج ۲ ص ۳۲۴ طبع مصر ۱۳۵۴ھ

اور اصل میں یہ مصدر ہے" پ۱۶ / ۱۲

سَوِيّ سیدھا، درست، صحیح بروزن فَعِيْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ ہے، امام راغب لکھتے ہیں،

"سَوِیّ اس کو کہا جاتا ہے جو مقدار اور کیفیت دونوں حیثیت سے افراط و تفریط سے محفوظ ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا (تین رات تک بھلا چنگا) اور فرمایا مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ (کون ہیں سیدھی راہ والے) اور رجل سَوِیّ وہ ہے جس کے اخلاق بھی اور خلقت بھی افراط و تفریط کے اعتبار سے معتدل ہوں"

ابوالہیثم کا بیان ہے کہ یہ بروزن فَعِيْلٌ بمعنے مُفْتَعِلٌ یعنی مُسْتَوِیٌ ہے، جو کہ خلق اور عقل میں انتہاء کو پہنچا ہوا ہو، اَسْوِيَاءُ جمع[1]

سَوِيًّا پ۱۶ / ۱۷ پ۱۶ / ۵ و ۶ و ۷

پ۲۹ / ۲

سَوّٰى اس نے پورا پورا بنایا، اس نے برابر کیا، تَسْوِيَةٌ سے جس کے معنے کسی چیز کے بلندی یا پستی میں برابر بنا سکنے میں ماضی

کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ۲۹ / ۱۸ پ۳۰ / ۱۲

سَوَّيْتُهٗ میں نے اس کو پورا پورا بنایا، میں نے اس کو برابر کیا، سَوَّيْتُ تَسْوِيَةٌ سے ماضی کا صیغہ واحد متکلم ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب، پ۱۴ / ۳ پ۲۳ / ۱۴

سَوّٰىكَ اس نے تجھ کو پورا پورا بنا دیا، اس نے تجھ کو برابر کیا، اس میں کَ ضمیر واحد مذکر حاضر ہے، پ۱۵ / ۱۷ پ۳۰ / ۷

سَوّٰىهُ اس کو برابر کیا، اس کو پورا پورا بنایا، اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے،

پ۲۱ / ۱۴

سَوّٰىهَا اس کو برابر کیا، اس کو پورا پورا بنایا، اس میں هَا ضمیر واحد مؤنث غائب ہے، امام راغب لکھتے ہیں"

"آیت شریفہ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا (اور قسم ہے جی کی اور جیسا کہ اس کو ٹھیک بنایا) میں هَا سے ان قوتوں کی طرف اشارہ ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے نفس کا قائم رکھنے والا بنایا ہے، چنانچہ فعل کو ان ہی کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور یہ دوسرے مقام پر مذکور ہے

[1] تاج العروس

کہ فعل کی نسبت جس طرح فاعل کی طرف درست ہے اسی طرح آلہ نیز ان تمام اشیاء کی طرف بھی کہ جن کی فعل کو احتیاج ہوتی ہے منسوب کرنا صحیح ہے، جیسے کہ سیف قاطع (شمشیر برندہ) ہے، اور یہ وجہ اس کے قول سے بہتر ہے جس نے یہ کہا ہے کہ اس سے اللہ تعالےٰ مراد ہیں کیونکہ ما کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے تعبیر نہیں کی جاتی کہ وہ جنس کے لیے وضع کیا گیا ہے، اور نہ صحیح روایت میں اللہ تعالیٰ کے لیے اس کا استعمال سننے میں آیا ہے" پ ۳۰ / ۱۶ و ۱۴

سَوّٰهُنَّ اس نے ان کو ٹھیک کر دیا، اس نے ان کو پورا پورا بنایا، اس میں هُنَّ ضمیر جمع مؤنث غائب ہے، پ ۱ / ۲

فصل الهاء

سُهُوْلِهَا اس کے نرم مقامات سُهُوْلٌ سَهْلٌ کی جمع، جس کے معنے نرم زمین کے ہیں، مضاف ہے، هَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، پ ۸ / ۱۷

فصل الیاء المثناة

سِیْٓءَ وہ غمگین ہوا اسے برا معلوم ہوا، وہ ناخوش ہوا، سُوْءٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو سُوْء) پ ۱۲ / ۷، پ ۲۰ / ۱۹

السَّیِّئُ بد، برا، سُوْءٌ سے صفت مشبہ کا صیغہ، پ ۲۲ / ۱۴، سَیِّئَاتُ پ ۱۱ / ۲

سَیِّاٰتِ برے کام، گناہ، سَیِّئَةٌ کی جمع، (ملاحظہ ہو سَیِّئَةٌ) پ ۴ / ۱۴، پ ۹ / ۱۱۹ پ ۱۱ / ۸، پ ۱۲ / ۲ و ۷ و ۱۰، پ ۱۴ / ۱۰ و ۱۲، پ ۳۰ / ۱۲ و ۱۳، پ ۲۳ / ۱۴ پ ۲۴ / ۲ و ۴ و ۱۰، پ ۲۵ / ۴ و ۱۸ و ۲۰

سَیِّاٰتِکُمْ تمہارے گناہ، تمہارے اعمال بد، سَیِّاٰتِ مضاف، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، پ ۳ / ۵، پ ۵ / ۲ پ ۶ / ۷، پ ۹ / ۱۸، پ ۲۸ / ۲۰

سَیِّاٰتِنَا ہماری برائیاں، ہمارے گناہ، سَیِّاٰتِ مضاف، نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، پ ۴ / ۱۱

سَیِّاٰتِهٖ اس کی برائیاں، اس کے گناہ، سَیِّاٰتِ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۲۸ / ۱۵ و ۱۷

سَیِّاٰتِهِمْ ان کی برائیاں، ان کے گناہ

سَیِّاٰتِ مضاف، ھِمْ ضمیر جمع مذکر
غائب مضاف الیہ، پ۴/۱۹ پ۱۱/۶ پ۱۳/۴
پ۱۳/۲۰ پ۲۶ ۹، ۵، ۲، ۶

سَیَّارَۃٌ کارواں، قافلہ، چلنے والے مسافر،
سَیَّارٌ کا مؤنث جو کہ سَیْرٌ سے صفت کا صیغہ
ہے، اس کی تانیث جمع کے معنے کے لحاظ
سے ہے پ۱۲/۱۲

سِیْٓئَتْ وہ بُری کر دی گئی، ان کو بُرا معلوم
ہوا، سُوْءٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مؤنث
غائب، (ملاحظہ ہو بُسَمَّتْ) پ۲/۲۹

سِیْحُوْا تم پھر لو، تم سیاحت کرو، (ضَرَبَ)
سَیْحٌ سے جس کے معنے زمین پر چلنے اور سفر
کرنے کے ہیں، امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، پ۱۰/۱

سَیِّدًا سردار، سِیَادَۃٌ سے جس کے معنے
سرداری کرنے اور سردار ہونے کے ہیں صفت
مشبہ کا صیغہ سَادَۃٌ جمع، راغب اصفہانی فرماتے
ہیں،

"سَیِّدٌ کے معنے... متولی سواد" یعنی
جماعت کے متولی کے ہیں اور اسی کی طرف
اس کی نسبت ہوتی ہے چنانچہ سید القوم
بولا جاتا ہے اور سید الثوب یا سید

الفرس نہیں بولا جاتا، اور کہا جاتا ہے۔
القوم یعنی ھم اور چونکہ مہذب النفس
ہونا متولی جماعت کی شرط ہے اس لیے ہر
اس شخص کو کہ جو اپنی ذات کے اعتبار سے
بزرگ ہو سید کہا جاتا ہے اسی معنی میں ارشاد
ہے وَسَیِّدًا وَّحَصُوْرًا (اور سردار ہوگا
اور عورت کے پاس نہ جانے گا) اور فرمایا
وَّاَلْفَیَا سَیِّدَھَا (اور دونوں نے پایا اس
کے خاوند کو) یہاں شوہر کو اپنی بیوی کا نگراں
ہونے کے باعث سید سے موسوم کیا گیا
ہے" پ۱۲/۳

سَیِّدَھَا اس کا شوہر، اس کا خاوند،
سَیِّدَ مضاف، ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب
مضاف الیہ، پ۱۲/۱۳

سَیْرٌ چلنا "سیر" کے معنے زمین پر چلنے
کے ہیں یہ سَارَ یَسِیْرُ کا مصدر ہے، جو
ضَرَبَ یَضْرِبُ سے آتا ہے، پ۸/۲۲

سَیْرًا پ۲۷/۳

سُیِّرَتْ وہ چلائی گئی، وہ چلائے گئے،
تَسْیِیْرٌ سے جس کے معنے چلانے کے
ہیں ماضی کا صیغہ واحد مؤنث غائب،

راغب لکھتے ہیں،

"تسییر کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو سائر
یعنی جو چلنے والے کے امر و اختیار اور ارادہ
سے ہو جیسے ھُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ (وہی
تو ہے جو تم کو پھراتا ہے) اور دوسرے وہ جو
بذریعہ قہر و تسخیر ہو جیسے کہ پہاڑوں کی تسخیر ہے
وَاِذَا الْجِبَالُ سُیِّرَتْ (اور جب پہاڑ
چلائے جاویں)" (ملاحظہ ہو سُیِّرَتْ) پ ۱۳/۱۱

پ ۳۰/اول

سِیْرَتَھَا اس کی چال، اس کی سیرت،
اس کی حالت، جس حالت پر کہ انسان یا غیر
انسان ہوتا ہے خواہ وہ اس کی طبعی ہو یا اکتسابی
اس کا نام سیرۃ ہے، سَیْرٌ سے اسم ہے
سِیْرَۃٌ مضاف، ھَا ضمیر واحد مؤنث غائب
مضاف الیہ، پ ۱۶/۱

سِیْرُوْا تم پھرو، تم چلو، تم سیر کرو، سَیْرٌ
سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، راغب نے
لکھا ہے کہ

"ارشاد الٰہی سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ (سیر
کرو ملک کی) میں کہا گیا ہے کہ زمین پر حسیات
جیسی مراد ہے، اور بعض نے فکر و جولان
کرنے اور اس کے احوال کی نگرانی کرنا بیان
کیا ہے، جس طرح کہ خبر میں مروی ہے کہ
اولیاء کے وصف میں کہا گیا ہے اَبْدَانُہُمْ
فِی الْاَرْضِ سَائِرَۃٌ وَقُلُوْبُہُمْ فِی
الْمَلَکُوْتِ جَائِلَۃٌ (ان کے بدن تو زمین
پر رواں ہیں اور ان کے دل ملکوت میں
جولاں ہیں) اور بعض نے اس کو بقوت
تمام اس طرح عبادت میں لگنے پر محمول
کیا ہے کہ جو ثواب تک رسائی کر دے"
پ ۴/۵ پ ۶/۸ پ ۱۴/۱۱ پ ۲۰/۲ و ۱۴ پ ۲۱/۸ پ ۲۲/۸

سِیْقَ وہ ہانکا گیا، (نَصَرَ) سَوْقٌ
سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب،
(ملاحظہ ہو سَائِقٌ) پ ۲۴/۵

سَیْلُ بہاؤ، سیلاب، یہ اصل میں
سَالَ یَسِیْلُ کا مصدر ہے جس کے معنے
بہنے کے ہیں، پھر مصدر بطور اسم سیلاب
کے معنی میں استعمال ہونے لگا، اس کی
جمع سُیُوْلٌ آتی ہے، قرآن مجید میں اس
کا استعمال بطور اسم ہی ہوا ہے پ ۱۳/۸

پ ۲۲/۸

سُئِلَ (اس مرد سے) پوچھا گیا، سوال

کیا گیا، سُؤَالٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب۔ پ ۱۳

سُئِلَتْ (اس عورت سے) پوچھا گیا، سوال کیا گیا، سُؤَالٌ سے ماضی مجہول کا صیغہ واحد مؤنث غائب، پ ۳۰

سُئِلُوْا ان سے سوال کیا گیا، سُؤَالٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ ۲۱/۱۸

سِیْمَاهُمْ ان کا چہرہ، ان کی نشانی، سِیْمَا کے معنے نشانی اور علامت کے ہیں، یہ اصل میں وِسْمٰی تھا، واو کو فا کلمہ کی بجائے عین کلمہ کی جگہ پر رکھا گیا جس طرح کہ ما اطیب اور ایطبہ بولتے ہیں تو سِوْمٰی ہوا پھر واو کے ساکن اور ما قبل کے مکسور ہونے کی وجہ سے واو کو یا کر لیا گیا اور سِیْمٰی ہو گیا سِیْمٰی مضاف هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۳/۵

پ ۸/۱۳ و ۱۲، پ ۲۶/۱۲ و ۸، پ ۲۷/۱۲

سِیْنَاءَ سینا، مشہور پہاڑ ہے، علامہ یاقوت حموی، معجم البلدان میں لکھتے ہیں

"سِینا بکسر اول، اور فتحہ بھی آتا ہے، شام میں ایک موضع کا نام ہے، جس کی طرف طور کی نسبت کی جاتی ہے اور طور سیناء کہا جاتا ہے۔ یہ وہی پہاڑ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسےٰ بن عمران علیہ السلام سے کلام فرمایا تھا، اور اسی مقام پر ان کو ندا کی گئی تھی، یہ گھنے درختوں کا ہے،

ہمارے شیخ ابو البقاء کا بیان ہے کہ یہ مشہور پہاڑ کا نام ہے جب سین کو فتحہ دیا جائے گا تو اس کی ہمزہ قطعی طور پر تانیث کے لیے ہو گی، کیونکہ الحاق اور تکثیر کے لیے ہمزہ کا ہونا باطل ہے اس لیے فَعْلَاءُ غیر مضاعف میں نہیں آیا جیسے کہ زِلْزَالٌ اور قِلْقَالٌ ہے اور سین کا کسرہ بھی جائز ہے اس صورت میں یا اس میں زائد ہو گی، اور فِیعَال کے وزن پر ہو گا جیسے کہ دیباج اور دیماس ہیں، اور ممکن ہے کہ یا اصلی ہی ہو اور علیاء کی طرح ہو اور اس صورت میں ہمزہ کے بدلے الحاق ہونے کی بنا پر اسے علیاء کی طرح رکھا گیا ہے،

اور اگر تم یہ دریافت کرو کہ پھر یہ منصرف کیوں نہیں ہوا تو ہم کہیں گے کہ یہ تعریف اور تانیث کے اجتماع کی وجہ سے کیونکہ یہ ایک جگہ کا نام ہے اور یہ اس امر میں کہ اس کی تانیث بغیر علامت کے ہے مثل دمشق کے ہے۔

اور اس مقام کے نام کے لیے
سِیْنِیْنَ بھی آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا
ہے وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ (اور قسم ہے
طور سینین کی

عربی زبان میں کوئی ایسا اسم کہ جو
س ا ی، ن سے مرکب ہو بجز اس حرف کے
کہ جس کا نام سین ہے نہیں ہے"[۱]

علامہ سید محمود آلوسی بغدادی، تحریر کرتے ہیں،
"اکثر اس پر ہیں کہ "سیناء" عربی نہیں ہے بلکہ
یا تو نبطی ہے یا حبشی اور اس کے اصلی معنے
اچھے یا مبارک کے ہیں، بعض اس کا عربی ہونا
بھی تجویز کرتے ہیں یا تو سَنَاءُ بالمد سے کہ جس
کے معنے رفعت کے ہیں یا سَنَا بالقصر سے کہ
جس کے معنے نور کے ہیں، ابوحیان نے اس
پر یہ رد کیا ہے کہ دونوں مادے مختلف
ہیں کیونکہ سَنَاءُ ہو یا سَنَا (دونوں) کا عین کلمہ
نون ہے اور سیناء کا عین کلمہ یا ہے، مگر یہ
اس طرح رد کر دیا گیا ہے کہ جو اس کا قائل ہے
وہ اس کا وزن فِیْعَالٌ بتاتا ہے اور عین کلمہ
نون اور یا کو زائد اور ہمزہ کو واو سے تبدیل شدہ
قرار دیتا ہے"[۳]

اور شیخ سلیمان جمل، علامہ سمین سے ناقل ہیں
کہ

"صحیح یہی ہے کہ سِیْنَاءُ عجمی نام ہے، عرب
جب اس کو بولنے لگے تو ان کے تلفظ مختلف
ہو گئے چنانچہ انہوں نے سَیْنَاءُ حَمْرَاءُ
کی طرح سے اور سِیْنَاءُ عِلْبَاءُ کی طرح
سے اور سِیْنِیْنَ قِنْدِیْل کی طرح سے کہا"[۲]

واضح رہے کہ جس طرح اس کے تلفظ میں
اختلاف ہے اسی طرح اس کے معنے میں بھی
اختلاف ہے بعض نے اس کے معنے مبارک
کے بعض نے حسن یعنی اچھے کے بعض نے
گھنے درختوں والے کے بیان کیے ہیں اور
بعض نے اس کو مشہور پہاڑ کا نام بتایا ہے

امام ابن جریر طبری ان سب اقوال کو اپنی تفسیر میں
نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں،

"صحیح قول اس بارے میں یہ ہے کہ یوں کہا جائے
کہ سیناء اسم ہے طور کی طرف اس کی اضافت ہے

---

۱ معجم البلدان ج ۵ ص ۲۰۱ طبع مصر ۱۳۲۳ھ
۲ حاشیہ الجمل علی الجلالین ج ۳ ص ۱۸۶ طبع مصر
۳ روح المعانی ج ۱۸ ص ۲۰ طبع مصر

جس کے ذریعہ وہ مشہور ہے، جس طرح سے کہ
جبلا طی کہا گیا ہے کہ طی کی طرف ان کی اضافت
ہے اور اگر اس بارے میں بات وہ ہوتی جو کہ
ان لوگوں نے بیان کی ہے جنہوں نے اس کے
معنے جبل مبارک (کوہ مبارک) کے
بیان کیے ہیں یا جنہوں نے کہ اس کے معنے
حسن (اچھا) کے بتائے ہیں تو طور پر
تنوین ہونی چاہیے تھی اور سیناء اس کی صفت
ہوتی، علاوہ ازیں سینا یعنے مبارک یا حسن،
کلام عرب میں مشہور نہیں، کہ اس کو پہاڑ کی
صفت قرار دیا جائے، لیکن بات اس سلسلہ
میں انشاء اللہ وہی ہے جو حضرت ابن عباس
رضی اللہ عنہما نے فرمائی ہے کہ سینا پہاڑ ہے
جو اس نام سے مشہور ہے حضرت موسیٰ صلی اللہ
علیہ وسلم کو اسی پر خطاب کیا گیا تھا، اور بایں
ہمہ وہ پہاڑ مبارک بھی ہے نہ کہ سیناء کے
معنے مبارک کے ہیں"[۵] پ ۱۸

سِینِیْنَ سینین، کوہ سینا، کو سینین بھی
کہا جاتا ہے، پ ۳۰

سَیِّئَۃٌ برائی، گناہ، فعل بد، حَسَنَۃٌ کی
ضد ہے، سَیِّئَۃٌ اصل میں سَوْأَۃٌ تھا
واو کو ی سے بدل کر یا کا یا میں ادغام کر دیا
گیا ہے، راغب لکھتے ہیں
حَسَنَۃ اور سیئۃ دو قسم پر ہیں،
ایک باعتبار عقل و شرع جیسے وہ کہ جن کا مذکور
آیۃ شریفہ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَۃِ فَلَہٗ عَشْرُ
اَمْثَالِھَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَۃِ
فَلَا یُجْزٰی اِلَّا مِثْلَھَا (جو کوئی لاتا
ہے ایک نیکی تو اس کیلئے اس کا دس گنا ہے
اور جو کوئی لاتا ہے ایک برائی سو سزا پاویگا
اسی کے برابر) میں ہے، دوسرے "حسنہ"
اور "سیئہ" باعتبار طبع، کہ طبیعت پسند کرے
یا گراں جانے، جیسے ارشاد ہے فَاِذَا
جَآءَتْھُمُ الْحَسَنَۃُ قَالُوْا لَنَا ھٰذِہٖ
وَاِنْ تُصِبْھُمْ سَیِّئَۃٌ یَّطَّیَّرُوْا بِمُوْسٰی
وَمَنْ مَّعَہٗ (پھر جب پہنچی ان کو بھلائی
کہنے لگے یہ ہے ہمارے لائق اور اگر پہنچی
برائی تو نحوست بتلانے لگے موسیٰ کی اور
اس کے ساتھ والوں کی" پ ۹ پ ۴
پ ۸ پ ۷ پ ۹ پ ۱۱ پ ۱۳

[۵] تفسیر امام ابن جریر ص ۱۰۰ ج ۱۸ طبع مصر

پ ۱۸/۶ پ ۱۹/۱۹ پ ۲۰/۳و۹و۱۲ پ ۲۱/۷ پ ۲۴/۱۰و۱۹
پ ۲۵/۵و۶

سَیِّئُہٗ اس کی بری چیز

سَیِّئُ مضاف، ہٗ ضمیر واحد
مذکر غائب مضاف الیہ، (ملاحظہ ہو
سَیِّئًا) پ ۱۵/۴

باب الشین المعجمۃ

فصل الالف

شَآءَ اس نے چاہا، اس نے ارادہ کیا، (سمع) مَشِیْئَۃً ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، شَآءَ اصل میں شَیِئَ تھا ی متحرک ماقبل مفتوح اس لیے ی کو الف سے بدل لیا گیا امام راغب لکھتے ہیں۔

"اکثر متکلمین کے نزدیک مَشِیْئَۃٌ بالکل اِرَادَۃٌ کی طرح ہے، اور بعض کے نزدیک مشیئۃ نام ہے اصل میں کسی شئے کے ایجاد کرنے اور چاہنے کا گر عرف میں اس کا استعمال ارادہ ہی کی جگہ ہوتا ہے لہذا اللہ تعالےٰ کی طرف سے مشیئۃ کے معنے ایجاد کرنے کے ہیں اور لوگوں کی طرف سے مشیت کے معنے چاہنے کے، ان کا بیان ہے کہ (کسی شئے کے متعلق) اللہ تعالےٰ کی مشیت ہونا اس امر کا مقتضی ہے کہ (اس) شئے کا وجود عمل میں آجائے اور اللہ کے ارادہ کا ہونا اس کا مقتضی نہیں کہ مراد لامحالہ وجود پذیر ہو کر ہی رہے۔ دیکھتے نہیں، ارشاد ہے یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا تم پر دشواری) اور وَمَا اللّٰہُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (اور اللہ بے انصافی نہیں چاہتا بندوں پر) حالانکہ یہ معلوم ہے کہ کبھی کبھی تنگی بھی ہوتی ہے اور لوگوں کے مابین ظلم بھی،

یہ لوگ ان دونوں کے مابین یہ فرق بتاتے ہیں کہ انسانی ارادہ کبھی بغیر ارادہ الٰہی کے تقدم کے بھی حاصل ہو جاتا ہے، چنانچہ انسان کا ارادہ ہوتا ہے کہ اسے موت نہ آئے اور اللہ تعالےٰ اس سے ابا فرماتا ہے لیکن مشیت انسانی بغیر مشیت الٰہی کے وجود میں نہیں آتی، کیونکہ ارشاد ہے وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ

(اور تم نہیں چاہو گے مگر جو چاہے اللہ) مروی
ہے کہ جب یہ آیت اتری لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ
اَنْ يَّسْتَقِيْمَ (جو کوئی چاہے تم میں سے کہ
سیدھا چلے) تو کافر کہنے لگے معاملہ تو ہمارے
اختیار میں ہے چاہیں سیدھے چلیں چاہیں نہ
چلیں اس پر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا وَمَا
تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ،

اور بعض علماء نے کہا ہے کہ اگر امور
تمام تر اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف نہ ہوتے
اور ہمارے افعال کی اس پر تعلیق وانحصار نہ ہوتا
تو لوگ اپنے تمام کاموں میں انشاء اللہ کے
ذریعہ استثنا کی تعلیق پر متفق نہیں ہو سکتے تھے
جیسے سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ،
سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا ، يَاْتِيْكُمْ
بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ ، اُدْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ
اللّٰهُ ، قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّ
لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ، وَمَا يَكُوْنُ
لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ
رَبُّنَا ، وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ
ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ،"

پ۱ (۲ و ۸) پ۲ (۱۱) پ۳ (۱ و ۲) پ۵ (۹) پ۶ (۱۱) پ۷ (۱۰ و ۱۹)
پ۸ (۱ و ۲ و ۳ و ۵) پ۹ (۱۳) پ۱۰ (۱۰) پ۱۱ (۷ و ۱۰ و ۱۵)
پ۱۲ (۲ و ۹ و ۱۰) پ۱۳ (۵) پ۱۴ (۷ و ۱۱ و ۱۹) پ۱۵ (۱۶ و ۱۷ و ۲۱)
پ۱۸ (۲ و ۱۷) پ۱۹ (۳) پ۲۰ (۳ و ۶) پ۲۱ (۱۹) پ۲۳ (۷) پ۲۴ (۶ و ۱۶)
پ۲۵ (۲ و ۸) پ۲۶ (۱۲) پ۲۹ (۱۳ و ۱۶ و ۲۰) پ۳۰ (۲ و ۵ و ۷ و ۱۲)

شَاخِصَةٌ کھلی کی کھلی رہ جانے والی،
شُخُوْصٌ سے جس کے ٹھیٹ معنے آنکھوں
کے کھلے کے کھلے رہ جانے کے ہیں اسم
فاعل کا صیغہ واحد مؤنث غائب (ملاحظہ
ہو تَشْخَصُ) پ۱۷ (۵)

شَارِبُوْنَ پینے والے، شُرْبٌ سے
اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، شَارِبٌ کی جمع،
بحالت رفع، (ملاحظہ ہو اِشْرَبُوْا اور شُرْبٌ
پ۲۷ (۱۵)

شَارِبِيْنَ پینے والے، شُرْبٌ سے
اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر شَارِبٌ کی جمع بحالت
نصب وجر، پ۲۳ (۶) پ۲۶ (۶)

شَارِكْهُمْ تو ساجھا کر ان سے، تو ان
کا شریک ہو جا، شَارِكْ مُشَارَكَةٌ سے
جس کے معنے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ
شریک ہونے کے ہیں، امر کا صیغہ واحد مذکر
حاضر هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، راغب

لکھتے ہیں،

"شِرکَۃ اور مُشَارَکَۃ کے معنے دو ملکوں کے مل جانے کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ کسی ایسی شئے کا پایا جانا جو دو یا دو سے زائد کے لیے ہو خواہ وہ شئے ذات ہو یا وصف جیسے کہ حیوان ہونے میں انسان اور گھوڑے کا باہم شریک ہونا یا ایک گھوڑے کا دوسرے گھوڑے کے ساتھ کمیت یا مشکی ہونے میں شریک ہونا"

پ ۱۵ ع

شَاطِئِ کنارہ، شَوَاطِئُ جمع پ ۲

شَاعِرٌ شاعر، شعر کہنے والا، شَعَادَۃٌ سے جس کے معنے شاعر ہونے کے ہیں اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، شُعَرَاءُ جمع، (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو شِعْرٌ) پ ۱۷ پ ۲۳ پ ۲۷ پ ۲۹

شَافِعِیْنَ سفارش کرنے والے، شَفَاعَۃٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، شَافِعٌ کی جمع بحالت نصب وجر، (ملاحظہ ہو شَفَاعَۃٌ) پ ۱۹

پ ۲۹

شَاقُّوا وہ مخالف ہوئے، مُشَاقَّۃٌ اور شِقَاقٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب (ملاحظہ ہو تُشَاقُّوْنَ اور شِقَاقٌ) پ ۹ پ ۲۶

پ ۲۸

شَاكِرٌ قدردان، حق ماننے والا، شُكْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، امام راغب لکھتے ہیں کہ اللہ تعالے کی ذات کو جب شکر سے متصف کیا جائے تو اس سے اللہ تعالی کا اپنے بندوں پر انعام فرمانا اور جو کچھ عبادت کہ انہوں نے ادا کی ہے اس کی جزا دینا مراد ہوتا ہے (ملاحظہ ہو شُكْرٌ اور شُكْرًا) پ ۲

شَاكِرًا پ ۱۴ پ ۲۹ پ ۱۹

شَاكِرُوْنَ حق ماننے والے، شکرگذار، شُكْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر، شَاكِرٌ کی جمع بحالت رفع، پ ۱۷

شَاكِرِيْنَ شکرگذار، شکر کرنے والے، احسان ماننے والے، شُكْرٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر شَاكِرٌ کی جمع بحالت نصب وجر، پ ۴ پ ۶ پ ۷ پ ۸ پ ۹ پ ۱۱ پ ۱۲ پ ۱۴ پ ۲۴

پ ۱۵

شَاكِلَتِهٖ اس کا ڈھنگ شَاكِلَۃ شَكْلٌ سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث، مضاف ہے ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، علامہ ابوحیان اندلسی لکھتے ہیں

شاکلۃ کے معنے اس طریقہ اور روش کے ہیں
کہ جو اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے۔ اقرار
کا بیان یہی ہے، اور یہ شکل سے ماخوذ ہے کہا
جاتا ہے لست علیٰ شکلی ولا شاکلتی (تو
میرے طریقے اور روش پر نہیں ہے) اشکل کے
معنے مثل اور نظیر کے ہیں اور شِکل بالکسر کے
معنے ہیئت کے ہیں بولتے ہیں جاریۃ حسنۃ
الشِکل (اچھی شکل کی لڑکی)" ؎

راغب اصفہانی رقم طراز ہیں

"ارشاد الٰہی کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ (ہر ایک
کام کرتا ہے اپنے ڈھنگ پر) نغ ہر کسے آں
کند کز وشاید یعنی اس سجیّہ (طبیعت) پر کہ جس
کا تم نے اسے پابند کیا ہے، کیونکہ سجیہ کا غلبہ
انسان پر چھائے رہتا ہے جیسا کہ میں نے الذریعۃ
الی مکارم الشریعۃ میں بیان کیا ہے یہ آیت اسی
طرح کی ہے جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام
کا ارشاد کل میسر لما خلق لہ (ہر ایک
کے لیے وہی چیز آسان ہے جس کے لیے وہ پیدا
کیا گیا ہے۔)" پ ۱۵/۹

شٰمِخٰتٍ اونچے، بلند، شُمُوْخٌ سے جس کے
معنے بلند ہونے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ
جمع مؤنث، شامخۃ کی جمع پ ۲۹/۲۱

شَاْنٍ وضدا، ذکر، حال، کسی اہم معاملہ یا
حال کو خواہ برا ہو یا بھلا شأن کہتے ہیں،
شُؤُوْنٌ جمع، پ ۱۱/۱۲ پ ۲۷/۱۲ پ ۳۰/۵

شَاْنِهِمْ ان کا کام، ان کا معاملہ، شَاْنِ
مضاف، هِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف
الیہ، پ ۱۸/۱۵

شَانِئَكَ تیرا دشمن، شَانِئٌ شَنْأٌ
سے جس کے معنے دشمن رکھنے کے ہیں، اسم
فاعل کا صیغہ واحد مذکر مضاف ہے، كَ
ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ، پ ۳۰/۳۳

شَاوِرْهُمْ تو ان سے مشورہ کر،
شَاوِرْ مُشَاوَرَۃٌ سے جس کے معنے باہم
مشورہ کرنے کے ہیں امر کا صیغہ واحد مذکر
حاضر، هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب، پ ۴/۸

شَاهِدًا گواہ، حاضر ہونے والا، بتانے
والا، شَهَادَۃٌ اور شُهُوْدٌ سے اسم فاعل کا
صیغہ واحد مذکر، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
اسماء گرامی میں سے ہے کیونکہ آپ قیامت

؎ البحر المحیط ج ۶ ص ۶۸

میں امت کے گواہ اور دنیا میں تعلیم ربانی کے بتانے والے ہیں (ملاحظہ ہو شَهَادَةٌ) پ ۱۲/۱۳،۱۲ پ ۲۶/۱۰ پ ۳۰ شَاهِدًا پ ۲۲/۳ پ ۲۶/۹ پ ۲۹/۱۳

شَاهِدُوْنَ گواہ، حاضر ہونے والے، شَهَادَةٌ اور شُهُوْدٌ سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر شَاهِدٌ کی جمع بحالت رفع، پ ۲۳/۹

شَاهِدِيْنَ گواہ، ماننے والے، شہادت دینے والے، شَهَادَةٌ اور شُهُوْدٌ سے اسم مذکر شَاهِدٌ کی جمع بحالت نصب وجر، پ ۳/۱۳ پ ۷/۱۷،۱ پ ۱۰/۵ پ ۱۷/۹ پ ۲۰/۶،۵ پ ۸

فصل الباء الموحدہ

شُبِّهَ وہی صورت بنادی گئی، مانند کردیا گیا، تَشْبِيْهٌ سے جس کے معنے کسی چیز کو کسی چیز کے مانند کر دینے کے ہیں، ماضی مجہول کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ ۶/۲

فصل التاء المثناۃ

شِتَاءٌ جاڑا، موسم سرما، اَشْتِيَةٌ جمع، بعض علماء نے شِتَاءٌ کو شَتْوَةٌ کی جمع بتلایا ہے (ملاحظہ ہو سَنَةٌ) پ ۳۰/۳۱

شَتّٰی طرح طرح، جدا جدا، مختلف، متفرق، پراگندہ، بعض کے نزدیک یہ لفظ مفرد ہے اور بعض نے اس کو شَتِيْتٌ کی جمع بیان کیا ہے، پ ۱۶/۱۱ پ ۲۸/۵ پ ۳۰/۱۷

فصل الجیم المعجمہ

شَجَرٌ درخت، اَشْجَارٌ جمع، پ ۸/۹ پ ۱۴ پ ۲۳/۴ پ ۱۷/۱۵،۱۱

شَجَرَ اختلاف ہوا، جھگڑا ہوا، (نَصَرَ) شُجُوْرٌ سے جس کے معنے آپس میں جھگڑنے اور اختلاف کرنے کے ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، پ ۵/۶

شَجَرَةٌ درخت، واحد مؤنث ہے، اس کی جمع شَجَرَاتٌ آتی ہے، پ ۱/۴ پ ۸/۹ پ ۱۳/۱۶ پ ۱۵/۶ پ ۱۶/۱۶ پ ۱۸/۱۱،۱ پ ۲۰/۷ پ ۲۱/۱۲ پ ۲۳/۹،۶ پ ۲۵/۱۶ پ ۲۶/۱۱

شَجَرَهَا اس کا درخت، شَجَرَةٌ مضاف، هَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، پ ۲۷/۱۵

شَجَرِهَا اس کا درخت، شَجَر مضاف، هَا ضمیر واحد مؤنث غائب مضاف الیہ، پ ۲۰/۱

فصل الحاء المهملة

شُحٌّ خودغرضی، کنجوسی، بخل، حرص، راغب لکھتے ہیں کہ شحّ "وہ بخل ہے جس میں حرص ہو اور عادت بن گیا ہو"۔ اردو میں اس کے لیے خودغرضی کا لفظ موزوں ہے، یہ مصدر ہے، اس کا فعل باب عَلِمَ، ضَرَبَ اور نَصَرَ تینوں سے آتا ہے، پ ۵/۱۶ پ ۲۸/۱۹،۱۴

شُحُوْمَهُمَا ان دونوں کی چربی، شُحُوْم شَحْم کی جمع جس کے معنے چربی کے ہیں، مضاف ہے، هُمَا ضمیر تثنیہ مؤنث غائب مضاف الیہ، پ ۸/۵

فصل الدال المهملة

شِدَادٌ سخت، زبردست، مضبوط، شَدِيْدٌ کی جمع، (ملاحظہ ہو اَشِدَّاءُ اور شَدِيْد) پ ۱۲/۱۶ پ ۲۸/۱۹ **شِدَادًا** پ ۳۰/۱

شَدَدْنَا ہم نے قوت دی، ہم نے مضبوط کیا، (نَصَرَ وضَرَبَ) شَدٌّ سے جس کے معنے مضبوط باندھنے کے ہیں ماضی کا صیغہ جمع متکلم، راغب نے لکھا ہے کہ شَدٌّ کا استعمال باندھنے کیلئے بھی ہوتا ہے اور بدن کے بارے میں بھی اور نفس کی قوتوں کے متعلق بھی اور عذاب کے واسطے بھی، پ ۲۳/۱۱ پ ۲۹/۲۰

شُدُّوْا تم مضبوط باندھو، شَدٌّ سے امر کا صیغہ جمع مذکر حاضر، پ ۲۶/۵

شَدِيْدٌ سخت، مستحکم، پکا، شَدٌّ سے بروزن فَعِيْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ، واضح رہے کہ شَدِيْدٌ کے معنے بخیل کے بھی ..... آتے ہیں جیسے وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (اور آدمی مال کی محبت میں بخیل ہے) اس صورت میں فَعِيْلٌ بمعنے مَفْعُوْلٌ بھی ہو سکتا ہے گویا مَشْدُوْدٌ یعنی بندھا ہوا ہے اور بمعنی فاعل بھی کہ اس نے اپنی تھیلی باندھ رکھی ہے، پ ۲/۱۰،۸،۵،۴

پ ۳/۱۰،۹ پ ۶/۵ پ ۷/۳ پ ۸/۲ پ ۹/۱۷،۱۶،۱۶ پ ۱۰/۱۲،۳

پ ۱۱/۱۲ پ ۱۲/۱۹،۷ پ ۱۳/۱۴،۱۳،۱۳،۸،۷ پ ۱۵/۱

پ ۱۷/۸ پ ۱۸/۴ پ ۱۹/۱۸ پ ۲۲/۱۴،۱۳،۱۲ پ ۲۳/۱۱

پ ۲۴/۸،۴ پ ۲۵/۳،۴ پ ۲۶/۱۶،۱۰ پ ۲۷/۱۹،۵

پ ۲۸/۵،۴ پ ۳۰/۱۵،۱۰ **شَدِيْدًا** پ ۳/۱۴

پ ۹/۱۱ پ ۱۵/۱۲،۶ پ ۱۹/۱۷ پ ۲۱/۱۸ پ ۲۴/۱۸ پ ۲۸/۱۳،۱۰

فصل الرّاء المهملة

شَرٌّ برائی، شر، جس سے سب کو نفرت ہو وہ شر ہے، اس کی تحقیق سابق میں لفظ خیر کے ضمن میں گذر چکی ہے اور وہیں اس کے انواع کا بھی مذکور ہو چکا ہے شُرُورٌ جمع، ب ۲/۱۰، ب ۴/۹، ب ۶/۱۳، ب ۹/۱۷، ب ۱۰/۳، ب ۱۱/۷، ب ۱۳/۳، ب ۱۵/۲و۹، ب ۱۶/۸، ب ۱۷/۳و۶و۱، ب ۱۹/۱، ب ۲۳/۱۳، ب ۲۵/۱، ب ۲۹/۷و۱۹، ب ۳۰/۲۳و۸و۲۳و۹و۲

شَرًّا ب ۱۸/۸، ب ۳۰/۲۴

شَرَابٌ پینے کی چیز، ہر وہ چیز کہ جس کو چبانا نہ پڑے بلکہ پیا جائے، عربی میں اس کے لیے شراب کا لفظ استعمال ہوتا ہے، اَشْرِبَةٌ جمع، ب ۷/۱۴، ب ۱۱/۶، ب ۱۴/۸و۹و۱۵، ب ۱۵/۱۶، ب ۲۳/۱۳.

شَرَابًا ب ۲۹/۱۹، ب ۳۰/۱

شَرَابِكَ تیرے پینے کی چیز، شَرَابُ مضاف، كَ ضمیر واحد مذکر حاضر مضاف الیہ، ب ۳/۳

شَرَابُهٗ اس کے پینے کی چیز، شَرَابُ مضاف، ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ب ۲۲/۱۴

شَرِبَ اس نے پیا، شُرْبٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (ملاحظہ ہو اِشْرَبُوْا) ب ۲/۱۷

شُرْبٌ پینا، شَرِبَ یَشْرَبُ کا مصدر ہے، ب ۲۷/۱۵

شِرْبٌ پانی پینے کی ایک باری، پانی کا ایک حصہ، شُرْبٌ سے اسم ہے، اَشْرَابٌ جمع، ب ۱۹/۱۲، ب ۲۷/۹

شَرِبُوْا انہوں نے پیا، شُرْبٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، ب ۲/۱۷

شَرَحَ اس نے دل کھولا، شَرْحٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، اصل میں شَرْحٌ کے معنے گوشت وغیرہ کے پھیلنے کے ہیں، "شرح صدر" کا مطلب سینہ کا نور الہی سے کشادہ ہونا اور اللہ تعالےٰ کی طرف سے تسکین و تقویت کا پانا ہے (ملاحظہ ہو اِشْرَحْ) ب ۱۴/۲۰، ب ۲۳/۱۷

شَرِّدْ تو ایسی سزا دے کہ دوسرے دیکھ کر بھاگ جائیں، تَشْرِیْدٌ سے جس کے معنے ایسی سزا دینے کے ہیں کہ

دوسرے دیکھ کر بھاگ جائیں، امر کا صیغہ جمع
مذکر حاضر، پ ۱۰

شَرْذِمَةٌ تھوڑے سے آدمی، قلیل
جماعت، شَرَاذِمُ اور شَرَاذِیمُ جمع
پ ۱۹

شَرَر شرارے، چنگاریاں، شَرَرَةٌ
واحد، پ ۲۹

شَرَعَ اس نے راہ ڈالی، (فتح)
شَرْعٌ سے جس کے معنے صاف راستہ
پر چلنے اور راہ ڈالنے کے آتے ہیں
ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، راغب لکھتے
ہیں،

"ارشاد الٰہی شَرَعَ لَكُمْ مِنَ
الدِّیْنِ (راہ ڈال دی تمہارے لیے
دین میں) میں ان اصول کی طرف اشارہ
ہے کہ جن میں ساری ملتیں برابر ہیں اور
جن کا نسخ صحیح نہیں جیسے حق تعالےٰ
شانہ کی معرفت اور اسی طرح کے
وہ امور کہ جن کو آیہ کریمہ وَمَنْ یَّكْفُرْ
بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ
وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ

"اور جو کوئی یقین نہ رکھے اللہ پر اور اس
کے فرشتوں پر اور کتابوں پر اور
رسولوں پر اور قیامت کے دن پر، بتلاتی
ہے"

حضرت الاستاذ علامہ محمود حسن خاں
ٹونکی مدظلہم نے اسی آیہ سے یہ نکالا
ہے کہ شریعت سماویہ کی ابتداء
حضرت نوح علیہ السلام کے عہد سے
ہوئی ہے، اپنے ایک مکتوب میں فرماتے
ہیں۔

"نوح علیہ السلام کے عہد سے شریعت
سماویہ یعنی اسلام کی ابتداء ہوئی ہے قال
سبحانہ تعالےٰ شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّیْنِ
مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا الآیہ، یہ آیہ جو
پچیسویں پارے میں ہے صاف تاریخ ہے
ابتداء شریعت اسلام کی،

نوح علیہ السلام سے پہلے دین
و مذہب محض فطرتی تھا یعنی خالق عالم ذات
واحد ہے اور بس، اسی کو اللہ سبحانہ تعالےٰ
نے بیان فرمایا ہے وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّا
اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا یہ اختلاف

بعثت انبیاء علیہم السلام کے بعد خلق اللہ نے
پیدا کیا ہے" ۲۵/۲

شُرَّعًا پانی کے اوپر ظاہر ہونے والے شارع
کی جمع، جو شرع سے اسم فاعل کا صیغہ واحد
مذکر ہے، شرع کے معنی ظاہر ہونے اور پانی
کے اندر آنے کے بھی آتے ہیں ۹/۱۱

شَرَعُوا انہوں نے راہ ڈالی شرع سے ماضی
کا صیغہ جمع مذکر غائب ۲۵/۴۲

شِرْعَةً دستور، شرع سے اسم ہے۔ امام
راغب لکھتے ہیں :-

" شرع کے معنی ہیں صاف راستہ پر چلنے کی
کہا جاتا ہے شرعت طریقا اور شرع
مصدر ہے بعد میں اسے طریق واضح (صاف
راستہ) کا اسم قرار دیا گیا، چنانچہ شرع
شرع اور شریعۃ استعمال ہونے لگا نیز
طریقہ الٰہیہ کے لیے اس کا استعارہ کر لیا گیا
ارشاد ہے شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا یہ دو باتوں
کی طرف اشارہ ہے ایک تو وہ راہ کہ جس پر
اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو مسخر فرما رکھا ہے کہ وہ
اسی طریق کا طالب ہے جو بندوں کی مصلحتوں
اور شہروں کی آبادی کی طرف عائد ہو، ارشاد
الٰہی وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ
لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (اور ہم نے بلند
کر دیے درجے بعض کے بعض پر کہ ٹھہراتا ہو
ایک دوسرے کو خدمتگار) میں اسی کی طرف
اشارہ ہے۔ دوسرے وہ دین کہ جس کا اللہ
تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا اور حکم دیا ہے کہ انسان
اپنے اختیار سے اس کا قصد کرے جس میں
شرائع کا اختلاف اور نسخ واقع ہوتا ہے آیہ شریفہ
ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ
فَاتَّبِعْهَا (پھر تجھ کو رکھا ہم نے ایک رستہ پر
دین کے کام کے) تو اسی پر چل) نے اسی کو بیان
کیا ہے"

اور علامہ سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں
رقم طراز ہیں۔

" مفسرین کے اقوال شرعۃ اور منہاج
کی تفسیر میں مختلف ہیں بعض نے کہا ہے کہ
شرعۃ دین اور منہاج طریق ہے۔ اور بعض کا
قول ہے کہ دونوں کے معنی طریق ہی کے ہیں
اور طریق سے مراد یہاں دین ہی ہے لیکن جب
لفظ مختلف ہوں تو متعدد الفاظ کو اس لیے لایا
جاتا ہے تاکہ اس قصہ اور معاملہ کی تاکید ہو جائے

عنترہ کہتا ہے۔ ع

اقوی واقفر بعد ام الھیثم

کہ اقوی اور اقفر دونوں کے معنے ایک ہی ہیں خلوت کے، لیکن دو لفظوں کا ہونا خلوت کے معنی کی زیادہ تاکید کرتا ہے۔ حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) نے کہا ہے کہ "شرعۃ" اور "منہاج" کے معنی سبیل اور سنت، راہ اور طریقے کے ہیں، اور مفردات میں آپ سے یہ منقول ہے کہ شرعۃ وہ ہے جس کو قرآن لے کر آیا اور منہاج وہ ہے جو سنت میں وارد ہوا، قتادہ نے شرعۃ ومنہاجاً کی تفسیر میں کہا ہے کہ دین ایک اور شریعت مختلف ہے[1]

۱۱ ۱۶

شَرْقِيًّا شرقی، مشرق کی سمت والا، شرق کے معنے جانب مشرق کے ہیں جس طرف سے سورج نکلتا ہے، اور ی اس میں نسبت کے لیے ہے۔ ۱۶ ۵

شَرْقِيَّةً شرقی، مشرق کی سمت والی، اس میں تا تانیث کی ہے۔ ۱۸ ۱۱

شِرْك شرک، ساجھا، ساجھی بنانا، بشریک ٹھیرانا، شِرْکَۃ اور اِشْرَاك سے اسم ہے۔

مولانا شاہ عبد القادر صاحب دہلوی موضح القرآن میں سورہ بقرہ میں زیر آیہ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ رقم طراز ہیں۔

"شرک" یہ کہ اللہ کی صفت کسی اور میں جانے مثلاً کسی کو سمجھے کہ اس کو ہر بات معلوم ہے یا وہ جو چاہے کر سکتا ہے یا ہمارا بھلا یا برا کرنا اس کے اختیار میں ہے، اور یہ کہ اللہ کی تعظیم کسی اور پر خرچ کرے، مثلاً کسی چیز کو سجدہ کرے اور اس سے حاجت مانگے اس کو مختار جان کر"

اور سورۂ نساء میں زیر آیہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"اوپر سے ذکر تھا منافقوں کا جو پیغمبر کے حکم پر راضی نہ ہو اور جدی راہ چلے یہ آیت فرمائی کہ اللہ شرک نہیں بخشتا تو "شرک" فرمایا حکم میں شریک کرنے کو یعنی سوائے دین اسلام کے اور دین پسند رکھے اور اس پر چلے پس جو دین ہے سوائے اسلام کے سب شرک ہے اگرچہ پوجنے میں شرک نہ کرتے ہوں"

---

[1] فصل الشین من باب العین۔

اور سورہ انعام میں زیر آیہ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ فرماتے ہیں،

" شرک فقط یہی نہیں کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجیے بلکہ شرک کے حکم میں یہ ہے کہ اور کا مطیع ہو جا"

اور اسی سورہ میں زیر آیہ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا لکھتے ہیں۔

" اب جاننا چاہیے کہ اللہ کی نیاز دینی یہ کہ اس کی راہ میں جن کو دلوا دے ان کو دنیا اس کا فائدہ اس کو نہیں پہنچتا اس کی حکم برداری ہے اور چیز سے فقیر کو فائدہ اور ثواب سے فائدہ دینے والے کو، پھر جو کسی بزرگ کے واسطے کچھ دے اگر اسی وضع پر دے تو "شرک" ہے، جس پر اللہ نے الزام دیا، مگر اس بزرگ کو اپنی جگہ ٹھیرا دے کہ اس کی طرف سے اللہ کی راہ میں جن کو کہا ہے ان کو دے تو حکم برداری اللہ کی اور چیز فقیر کو اور ثواب اس شخص کے بدلے اس بزرگ کو"

اور سورہ یونس میں زیر آیہ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ارقام فرماتے ہیں،

" کہ اللہ ہی کی طرف سب آخر کو کھینچے جائیں گے تو بس اللہ ایک ہے اس کے سوا کی طرف رجوع کرنا حماقت ہے "شرک" کرنا ہے"

اور سورۂ نحل میں زیر آیہ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ فرماتے ہیں کہ:-

" مشرک کہتے ہیں کہ مالک اللہ ہی ہے یہ لوگ اس کی سرکار میں مختار ہیں"

اور سورۂ حج میں زیر آیہ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا مرقوم ہے،

" یعنی مواشی ذبح کرنے نیاز اللہ کی ہر دین میں عبادت رکھا ہے اس کے سوا اور کی نیاز ذبح کرنا اس کی عبادت ہو گئی تو "شرک" ہوا"

شاہ صاحب موصوف نے "شرک" کے متعلق متفرق مقامات پر مختصر الفاظ میں جو کچھ فرمایا ہے ان کے بھتیجے مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے "تقویۃ الایمان" میں اسی کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے فرماتے ہیں:-

" سمجھنا چاہیے کہ "شرک" اسی پر موقوف نہیں کہ کسی کو اللہ کے برابر سمجھے اور اس کے مقابل جانے بلکہ "شرک" کے معنے یہ ہیں کہ جو چیزیں اللہ نے اپنے واسطے خاص کی ہیں اپنے بندوں کے

ذمہ نشان بندگی کے ٹھیرائے ہیں، وہ چیزیں
کسی اور کے واسطے کرنی . . . .
. . . . اب یہ بات تحقیق کی چاہئے
کہ اللہ صاحب نے کون کون سی چیزیں اپنے
واسطے خاص کر رکھی ہیں کہ اس میں کسی کو شریک
نہ کیا چاہیے، سو وہ باتیں بہت ساری ہیں مگر
کئی باتوں کا ذکر کر دینا . . . .
ضرور ہے تا اور باقی باتیں ان سے لوگ
سمجھ لیں۔

سو اول بات یہ کہ ہر جگہ حاضر و ناظر
رہنا، اور ہر چیز کی خبر ہر وقت برابر رکھنی، دور ہو
یا نزدیک، چھپی ہو یا کھلی، اندھیرے میں ہو یا اجالے
میں، آسمانوں میں ہو یا زمینوں میں، پہاڑوں کی
چوٹی پر ہو یا سمندر کی تہ میں، یہ اللہ ہی کی شان
ہے اور کسی کی یہ شان نہیں، سو جو کوئی کسی کا نام
اٹھتے بیٹھتے لیا کرے اور دور و نزدیک سے
پکارا کرے اور بلا کے مقابلہ میں اس کی دہائی دیوے
اور دشمن پر اس کا نام لے کر حملہ کرے اور
اور اس کے نام کا ختم پڑھے یا شغل کرے، یا
اس کی صورت کا خیال باندھے اور یوں سمجھے
کہ جب میں اس کا نام لیتا ہوں زبان سے یا
دل سے یا اس کی صورت کا یا اس کی قبر کا خیال
باندھتا ہوں تو میں اس کو خبر ہو جاتی ہے اور اس
سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی اور جو مجھ پر
احوال گذرتے ہیں، جیسے بیماری، تن درستی، کشائش
و تنگی، مرنا جینا، غم و خوشی، سب کی ہر وقت اسے
خبر ہے اور جو بات میرے منہ سے نکلتی ہے
وہ سب سن لیتا ہے اور جو خیال و وہم میرے
دل میں گذرتا ہے وہ سب سے واقف ہے سو
ان باتوں سے مشرک ہو جاتا ہے اور اس قسم
کی باتیں شرک ہیں اس کو "اشراک فی العلم" کہتے
ہیں یعنی اللہ کا سا علم اور کو ثابت کرنا، سو
اس عقیدہ سے آدمی البتہ مشرک ہو جاتا ہے
خواہ یہ عقیدہ انبیاء، اولیاء سے رکھے خواہ پیر شہید
سے رکھے خواہ امام و امام زادہ سے خواہ بھوت
و پری سے، پھر خواہ یوں سمجھے کہ یہ بات ان کو
اپنی ذات سے خواہ اللہ کے دینے سے، غرض
اس عقیدہ کو ہر طرح شرک ثابت ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ عالم میں ارادہ
سے تصرف کرنا اور اپنا حکم جاری کرنا اور اپنی
خواہش سے مارنا اور جلانا۔ اور روزی
کی کشائش اور تنگی کرنی اور تن درست اور بیمار

کر دینا، فتح و شکست دینی، اقبال و ادبار دینا،
مرادیں پوری کرنی، حاجتیں برلانی، بلائیں ٹالنی،
مشکل میں دست گیری کرنی، برے وقت میں
پہونچنا، یہ سب اللہ ہی کی شان ہے اور کسی
نبی ولی کی، پیر و شہید کی، بھوت و پری کی یہ شان
نہیں جو کوئی کسی کو ایسا تصرف ثابت کرے اور
اس سے مراد مانگے اور اس توقع پر نذر و نیاز کرے
اور اس کی منتیں مانے اور اس کو مصیبت کے
وقت پکارے وہ مشرک ہو جاتا ہے اور
اس کو "اشراک فی التصرف" کہتے ہیں،
یعنی اللہ کا سا تصرف ثابت کرنا، سو
یہ محض شرک ہے۔ پھر خواہ یوں سمجھے کہ
ان کاموں کی طاقت ان کو خود بخود ہے خواہ یوں
سمجھے کہ اللہ نے ان کو ایسی قدرت بخشی ہے ہر طرح
شرک ثابت ہوتا ہے۔

تیسری بات یہ کہ بعضے تعظیم کے کام
اللہ نے اپنے لیے خاص کیے ہیں کہ ان کو
عبادت کہتے ہیں جیسے سجدہ اور رکوع اور
ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا اور اس کے نام پر مال
خرچ کرنا اور اس کے نام کا روزہ رکھنا اور اس
کے گھر کی طرف دور دور سے قصد کر کے سفر
کرنا اور ایسی صورت بنا کر چلنا کہ ہر کوئی جان لیوے
کہ یہ لوگ اس گھر کی زیارت کو جاتے ہیں اور
راستے میں اس مالک کا نام پکارنا اور نامعقول
باتیں کرنے سے اور شکار سے بچنا
اور اسی قید سے جا کر طواف کرنا اور اس
کی طرف سجدہ کرنا اور اس کی طرف جانور لیجانے
اور وہاں منتیں ماننی اس پر غلاف ڈالنا اور
اس کی چوکھٹ کے آگے کھڑے ہو کر دعا مانگنی
اور التجا کرنی اور دین و دنیا کی مرادیں مانگنی اور
ایک پتھر کو بوسہ دینا اور اس کی دیوار سے اپنا
منہ اور چھاتی ملنی، اور اس کا غلاف پکڑ کر دعا
کرنی اور اس کے گرد روشنی کرنی اور اس کا
مجاور بن کر اس کی خدمت میں مشغول رہنا
جیسے جھاڑو دینی اور روشنی کرنی، فرش
بچھانا، پانی پلانا، وضو غسل کا لوگوں کے لیے
سامان درست کرنا اور اس کے کنوئیں کے
پانی کو تبرک سمجھ کر پینا، بدن پر ڈالنا، آپس
میں بانٹنا، غائبوں کے واسطے لیجانا، رخصت
ہوتے وقت الٹے پاؤں چلنا اور اس کے گرد
وپیش کے جنگل کا ادب کرنا یعنی وہاں شکار
نہ کرنا، درخت نہ کاٹنا، گھاس نہ اکھاڑنا،

مویشی نہ ہنکانا، یہ سب کام اللہ نے اپنی عبادت کے لیے اپنے بندوں کو بتائے ہیں، پھر جو کوئی کسی پیر و پیغمبر کو یا بھوت و پری کو یا کسی سچی قبر کو یا جھوٹی قبر کو یا کسی کے تھان کو یا کسی چلے کو یا کسی کے مکان کو یا کسی کے تبرک کو یا نشان کو یا تابوت کو سجدہ کرے یا رکوع کرے یا اس کے نام کا روزہ رکھے یا ہاتھ باندھ کر کھڑا ہووے یا جانور چڑھاوے یا ایسے مکانوں میں دور دور سے قصد کرکے جاوے یا وہاں روشنی کرے غلاف ڈالے چادر چڑھاوے، ان کے نام کی چھڑی کھڑی کرے رخصت ہوتے وقت الٹے پاؤں چلے، ان کی قبر کو بوسہ دیوے، مورچھل جھلے اس پر شامیانہ کھڑا کرے، چوکھٹ کو بوسہ دیوے ہاتھ باندھ کر التجا کرے، مراد مانگے، مجاور بن کے بیٹھ رہے، وہاں کے گرد و پیش کے جنگل کا ادب کرے اور ایسی قسم کی باتیں کرے تو اس پر "شرک" ثابت ہوتا ہے، اس کو "اشراک فی العبادت" کہتے ہیں، یعنی اللہ کی سی تعظیم کسی کی کرنی، پھر خواہ یوں سمجھے کہ یہ آپ ہی اس تعظیم کے لائق ہیں یا یوں سمجھے کہ ان کی اس طرح کی تعظیم کرنے سے اللہ خوش ہوتا ہے اور اس کی تعظیم کی برکت سے اللہ مشکلیں کھول دیتا ہے، ہر طرح "شرک" ثابت ہوتا ہے۔

چوتھی بات یہ کہ اللہ صاحب نے اپنے بندوں کو سکھلایا ہے کہ اپنے دنیا کے کاموں میں اللہ کو یاد رکھیں اور اس کی تعظیم کرتے رہیں تاکہ ایمان بھی درست رہے اور ان کاموں میں بھی برکت ہووے، جیسے اڑے کام پر اللہ کی نذر ماننی اور مشکل کے وقت اس کو پکارنا اور ہر کام کا شروع اس کے نام سے کرنا اور جب اولاد ہو تو اس کے شکر میں اس کے نام کا جانور ذبح کرنا اور اس کا نام عبد اللہ، عبد الرحمن، خدا بخش، اللہ دیا، امۃ اللہ، اللہ دی رکھنا اور کھیت اور باغ میں تھوڑا بہت اس کے نام کا کر رکھنا اور دھن اور ریوڑ میں سے کچھ اس کی نیاز کر رکھنا اور جو جانور اس کے نام کے اس کے گھر کی طرف لیجائے ان کا ادب کرنا یعنی نہ ان پر سوار ہونا نہ لادنا اور کھانے پینے پہننے میں اس کے حکم پر چلنا یعنی جس چیز کے برتنے کو اس نے فرمایا برتنا اور جو منع کیا

اس سے دور رہنا، اور برائی بھلائی جو دنیا میں
پیش آتی ہے جیسے قحط اور ارزانی صحت بیماری
فتح وشکست، اقبال وادبار، غمی وخوشی یہ سب
اس کے اختیار میں سمجھنا اور اپنا ارادہ جس کام
کا بیان کرنا تو پہلے اس کے ارادہ کا ذکر کر دینا جیسا
یوں کہنا کہ اگر اللہ چاہے تو ہم فلانا کام کریں گے
اور اس کے نام کو ایسی تعظیم سے لینا کہ جس میں اس
کی مالکیت نکلے اور اپنی بندگی جیسے یوں کہنا
کہ ہمارا رب، ہمارا مالک، ہمارا خالق، اور کلام
میں جب قسم کھانے کی حاجت ہو تو اسی کے
نام کی قسم کھانی، سو اس قسم کی چیزیں اللہ نے اپنی
تعظیم کے واسطے بتائی ہیں، پھر جو کوئی کسی انبیا
اولیاء کی، اماموں اور شہیدوں کی، بھوت وپری
کی اس قسم کی تعظیم کرے جیسے اڑے کام پر ان
کی نذر ماننے مشکل کے وقت ان کو پکارے، بسم اللہ
کی جگہ ان کا نام لیوے، جب اولاد ہو ان کی نذر
ونیاز کرے، اپنی اولاد کا نام عبدالنبی، امام بخش،
پیر بخش رکھے، کھیت وباغ میں ان کا حصہ لگاوے
جو کھیتی باڑی سے آوے پہلے ان کی نیاز کر دے
جب اپنے کام میں لاوے اور دھن اور ریوڑ
میں سے ان کے نام کے جانور ٹھیراوے اور

پھر ان جانوروں کا ادب کرے، پانی دانہ پر سے
نہ ہانکے، لکڑی پتھر سے نہ مارے اور کھانے پینے
میں رسموں کی سند پکڑے کہ فلانے لوگوں
کو چاہیے کہ فلانا کھانا نہ کھاویں، فلانا کپڑا نہ پہنیں
حضرت بی بی کی صحنک مرد نہ کھاویں، لونڈی نہ
کھاوے جس عورت نے دوسرا خصم کیا ہو وہ نہ
کھاوے، شاہ عبدالحق کا توشہ حقہ پینے والا نہ
کھاوے، اور برائی بھلائی جو دنیا میں پیش آتی ہے
اس کو ان کی طرف نسبت کرے کہ فلانا ان کی
پھٹکار میں آکر سڑی دیوانہ ہو گیا اور فلانے کو
انہوں نے ایسا راندا کہ محتاج ہو گیا اور فلانے کو
نواز دیا تو فتح واقبال مل گیا اور قحط فلانے ستارے
کے سبب سے پڑا فلانا کام جو فلانے دن شروع
کیا تھا یا فلانی ساعت میں سو پورا نہ ہوا یا یوں کہے
کہ اللہ ورسول چاہے گا تو میں آؤں گا یا پیر چاہے گا
تو یہ بات ہو جائے گی، یا اس کے تئیں بولنے میں
یا معبود، داتا، بے پروا، خداوند خدایگاں، مالک
الملک، شہنشاہ بولے، یا جب حاجت قسم کھانے
کی پڑے تو پیغمبر کی یا علی کی یا امام کی یا پیر کی یا ان
کی قبروں کی قسم کھاوے سو ان سب باتوں سے
شرک ثابت ہوتا ہے اور اس کو "اشراک فی العادت"

کہتے ہیں۔ یعنی اپنی عادت کے کاموں میں جو اللہ
کی تعظیم کرنی چاہیے سو غیر کی کرے سو ان
چاروں طرح کے شرک کا صریح قرآن و حدیث
میں ذکر ہے۔"

"شرک" کی تفصیل و توضیح کے لیے مولانا اسمٰعیل شہید
کی "تقویۃ الایمان" اور مولانا خرم علی بلہوری کی نصیحۃ
المسلمین سے بہتر اور مفید کتابیں اردو میں
موجود نہیں" شرک کی حقیقت کے سمجھنے اور
اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے عام لوگوں کے
واسطے ان کا مطالعہ ازبس ضروری ہے (ملاحظہ
ہو اَشْرَكَ اور (شَارِكْهُمْ) پ ۲۱/۱۱ پ ۲۲/۹و۱۷

پ ۲۶/۱
شُرَكَآءُ شریک، ساجھی، شَرِيكٌ کی جمع، تمام
قرآن مجید میں یہ لفظ دو مقام پر اس طرح
مرسوم ہے شُرَكٰٓؤُا کاف کے بعد واو سے
اور واو کے بعد ہمزہ اور الف، ایک تو سورۂ
انعام میں اور دوسرے سورہ شوریٰ میں،
لیکن واو تلفظ میں نہیں آتا ہے، پ ۴/۱۴ پ ۸/۱۴و۱۸
پ ۳ پ ۹/۱۴ پ ۱۱/۱۲و۱۳ پ ۱۳/۸و۱۱ پ ۲۰/۱۰ پ ۲۲/۹و۱۷ پ ۲۳/۱۷ پ ۲۵/۴

پ ۲۹/۴
شُرَكَآؤُكُمْ تمہارے شریک، شُرَكَآءُ

مضاف كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ پ ۹ پ ۱۱
شُرَكَآئِكُمْ پ ۹ پ ۲۱
شُرَكَآؤُنَا ہمارے شریک، شُرَكَآءُ مضاف
نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ پ ۱۴/۱۸
شُرَكَآئِنَا پ
شُرَكَآؤُهُمْ ان کے شریک، شُرَكَآءُ مضاف
هُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ
پ ۳ پ ۱۱/۸ شُرَكَآئِهِمْ پ ۳ پ ۲۱/۵
پ ۲۹/۴
شُرَكَآءِيَ میرے شریک، شُرَكَآءِ
مضاف ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ
پ ۱۴/۱۰ پ ۱۵/۱۹ پ ۲۰/۱۰ پ ۲۵/۱
شِرْكِكُمْ تمہارا شرک، شِرْكِ مضاف
كُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ پ ۲۲/۱۴
شَرَوْا انہوں نے بیچا، (ضَرَبَ) شِرَاءٌ
سے جس کے معنے خرید و فروخت کرنے کے
ہیں۔ ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، واضح رہے
کہ گو شراء کے معنی خریدنے اور بیچنے دونوں کے
ہیں۔ لیکن بیشتر اس کا استعمال بیچنے ہی کے
لیے ہوتا ہے۔ پ ۱/۱۲
شَرَوْهُ انہوں نے اس کو بیچ ڈالا،

اس میں ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب ہے۔ پ ۱۲/۱۲

شَرُّہٗ اس کی شر، اس کی برائی شَرٌّ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ پ ۲۹/۱۹

شَرِيْعَةٍ رستہ، شریعت، الٰہی طریقہ، شَرْعٌ سے اسم ہے۔ راغب لکھتے ہیں کہ:۔

بعض علماء کا بیان ہے کہ شریعت کا شریعت نام پڑا شریعۃ الماء (پانی کا گھاٹ) سے تشبیہ کی بنا پر اس حیثیت سے کہ جو اس کی سچی حقیقت پر مطلع ہوا سیراب ہوگیا اور پاک ہوا، اور میری مراد سیرابی سے وہ ہے جس کو کسی حکیم نے بیان کیا ہے کہ کنت اشرب فلا اروی فلما عرفت اللہ تعالی رویت بلا شرب (میں پیتا رہا اور سیراب نہ ہوا پھر جب اللہ تعالی کی معرفت ہوئی تو بلا پیے سیراب ہوگیا) اور پاک ہونے سے مراد وہ ہے جسے اللہ تعالی نے بیان فرمایا ہے اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا (اللہ ہی چاہتا ہے کہ دور کرے تم سے گندی باتیں اے نبی کے گھر والو اور ستھرا کردے تم کو ایک ستھرائی سے) پ ۲۵/۱۸

شَرِيْكٌ شریک، ساجھی، شِرْكَةٌ سے بروزن فَعِيْلٌ بمعنے فَاعِلٌ ہے شُرَكَاءُ جمع ہے پ ۱۵/۱۲ پ ۱۵/۱۲

فصل الطاء المهملة

شَطْـَٔـهٗ اس کی سوئی، اس کا پٹھا، اس کا پتہ، شَطْءٌ مضاف ہٗ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ۔ شَطْءٌ کے معنی پودے کی سوئی کے ہیں جو اس کی دونوں جانب پھوٹ نکلتی ہے۔ اس کی جمع شُطُوْءٌ اور اَشْطَاءٌ ہے۔ پ ۲۶/۱۲

شَطْرَ طرف، سمت، جہت، اسم ہے جب یہ اس معنی میں آتا ہے تو اس سے فعل کا استعمال نہیں ہوتا۔ امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں کہ "اہل لغت کا بیان ہے کہ شطر اسم مشترک ہے جو دو معانی کے لیے آتا ہے۔ ایک بمعنی نصف کے۔ اور دوسرے بمعنی طرف، سامنے اور سمت کے"۔[1] پ ۲/۱۰

شَطْرَهٗ اس کی سمت، اس کی جانب،

۱؎ مفاتیح الغیب معروف بہ تفسیر کبیر ج ۲ ص ۱۵ طبع مصر

اس کی طرف، شَطْرَ مضاف، ہٗ ضمیر واحد مذکر
غائب مضاف الیہ ۔ سپ
شَطَطًا جو بات حق سے دور ہو، شَطَّ یَشُطُّ
اور شَطَّ یَشِطُّ کا مصدر ہے۔ جس کے معنی اصل میں
افراط بُعد یعنی حد سے زیادہ دور ہونے کے ہیں
اور چونکہ حد سے بڑھنا جور و ستم ہے اس لیے ان
معنوں میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے اور اسی
لیے اس بات کو جو حق سے دور ہو شَطَط کہتے
ہیں۔ پ۱۵/۱۴ پ۱۹/۱۱

فصل العین المہملۃ

شَعَائِرَ اللّٰہِ اللہ کی نشانیاں، اللہ کے نام
کی چیزیں، یعنی وہ چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے
بندوں کے ذمہ نشان بندگی کے ٹھیرائے ہیں، امام
فخر الدین رازی لکھتے ہیں۔
" معلوم رہے کہ شعائر جمع ہے اکثر علما
اس پر ہیں کہ شعیرۃ کی جمع ہے اور ابن فارس نے
اس کا واحد شِعَارَۃٌ بتایا ہے شَعِیْرَۃٌ بروزن
فَعِیْلَۃٌ بمعنے مَفْعَلَۃٌ (یعنی مَشْعَرَۃٌ)
ہے اور مَشْعَرَۃٌ کے معنی نشانی کے اور

اِشْعَارٌ کے معنے علم میں لانے کے ہیں جس
شئے کے متعلق اشعر آئے گا اَعْلَمَ (وہ علم میں
لایا، اس نے اطلاع دی) کے معنے ہوں گے
اور ہر وہ شئے کہ جو کسی چیز کا نشان مقرر ہو یا
جو کسی علامت کو بتائے اسے شعیرۃ سے
موسوم کیا جا سکتا ہے۔" لہ
اور امام ابو بکر احمد بن علی جصاص رازی حنفی،
رقم طراز ہیں۔
" اہل لغت کا بیان ہے کہ شعائر شَعِیْرَۃٌ کی
جمع ہے۔ شَعِیْرَۃٌ وہ نشانی ہے جو اس چیز کو
بتاتی ہے جس کے لیے وہ مقرر کی گئی ہے۔
اشعار بدن کے یہ معنی ہیں کہ تم اس پر ایسی
نشانی مقرر کر دو جس سے یہ پتہ چلے کہ وہ ھدی
(قربانی کا جانور) ہے اور اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ
شعائر مناسک حج کی تمام علامات کا نام ہے
جن میں رمی جمار اور سعی بین الصفا والمروۃ
داخل ہیں، اور حبیب معلم، عطا سے راوی ہیں
کہ ان سے شعائر اللہ کے متعلق سوال ہوا تو
کہنے لگے " حرمات اللہ" (اللہ کا ادب) اس
کی طاعت کا اتباع اور معصیت سے اجتناب

لہ تفسیر کبیر ج ۳ ص ۲۵۲ طبع مصر حسینہ

یہ "شعائر اللہ" ہیں، اور شریک نے بروایت جابر، عطا سے آیت وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللهِ کی تفسیر میں قربانی کا فربہ اور بڑے ڈیل ڈول کا کرنا بیان کیا ہے اور ابن ابی نجیح نے بھی بروایت مجاہد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آیۂ مذکورہ کی تفسیر میں یہی نقل کیا ہے کہ تعظیم کا مطلب قربانی عمدہ، فربہ اور بلند بالا کرنا ہے، عکرمہ سے بھی یہی مروی ہے اور یہی مجاہد کا قول ہے اور حسن (بصری) نے کہا ہے کہ شعائر اللہ سے مراد اللہ کا دین ہے ابوبکر کہتے ہیں کہ آیہ مذکورہ میں یہ سب وجوہ مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ آیت میں سب کا احتمال موجود ہے۔" [1]

اور سورۂ مائدہ میں آیہ لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللهِ (اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو) کی تفسیر میں فرماتے ہیں:-

"کہ "شعائر اللہ" اللہ کے دین کے تمام نشانات پر حاوی ہے یعنی دین کے وہ فرائض اور نشانات کہ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتلادیا ہے کہ ان کے حدود سے تجاوز نہ کریں اور ان کے حقوق میں کوتاہی نہ ہو اور انہیں ضائع نہ ہونے دیں، یہ معنے ان تمام معانی کو جامع ہیں کہ جو سلف سے اس کی تشریح میں مروی ہیں" [2]

شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی ارقام فرماتے ہیں

"شعائر در اصل جمع شعیرہ است یا جمع شعارہ است بمعنے علامت وشعائر اللہ در عرف دین مکانات وازمنہ وعلامات واوقات عبادت را گویند، اما مکانات عبادت پس مثل کعبہ وعرفہ ومزدلفہ وجمار ثلثہ وصفا ومروہ ومنا وجمیع مساجد اند. واما ازمنہ پس مثل رمضان واشہر حرم وعید الفطر وعید النحر وجمعہ وایام تشریق اند، اما علامات پس مثل اذان واقامت وختنہ ونماز جماعت ونماز جمعہ ونماز عیدین اند، ودرہمہ ایں چیزہا معنی علامت بودن متحقق ست زیرا کہ مکان وزمان عبادت نیز از عبادت بلکہ از معبود یاد میدہد" [3]

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے اپنی بے نظیر کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں ایک مستقل باب باندھا ہے باب

[1] احکام القرآن ج ۳ ص ۲۹۸ طبع مصر ۱۳۴۷ھ [2] ایضاً ج ۲ ص ۳۶۶ [3] تفسیر فتح العزیز ص ۵۶۹ طبع مجتبائی دہلی

تعظیم شعائراللہ "شعائراللہ" کی مزید تشریح و تفصیل کے سمجھنے کے لیے اہل علم کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے پ ۲ ع ۶ پ ۵ ع ۱۱ پ ۱۷ ع ۱۲ و ۱۳

شُعَبٍ پھانکیں، شاخیں، حصے شُعْبَۃٌ کی جمع۔ جس کے معنے شاخ اور حصہ کے ہیں پ ۲۹ ع ۲۱

شِعْرٌ شعر، شعر کہنا شَعَرَ یَشْعُرُ کا مصدر ہے جس کے معنے شعر کہنے کے ہیں۔ نیز ادب کی اصطلاح میں "شعر" نام ہے" اس کلام کا جو موزوں ہو اور متکلم نے بہ ارادہ موزوں کیا ہو" راغب اصفہانی لکھتے ہیں:۔

شَعَرٌ کے معنی معروف ہیں (بال کو کہتے ہیں) جمع ہے، ارشاد ہے وَمِنْ اَصْوَافِھَا وَاَوْبَارِھَا وَاَشْعَارِھَا (اور بھیڑوں کی اون سے اور اونٹوں کی ببریوں سے اور بکریوں کے بالوں سے) اور شَعَرْتُ کے معنی ہیں میں نے بالوں کو حاصل کر لیا (یعنی گھنے بال کر لیے) اور اسی سے استعارہ کیا گیا ہے شَعَرْتُ کَذَا یعنی میں نے علم حاصل کیا جو باریکی میں ایسا ہے جیسے بال کا پتہ چلانا، اور شَاعِرٌ کو "شاعر" اس کی فطانت اور دقت معرفت ہی کی بنا پر کہا گیا ہے۔ پس شعر اصل میں علم دقیق کا نام ہے۔ عرب کا محاورہ ہے لیت شعری (کاش مجھے اس کا گہرا پتہ ہوتا) اور عرف میں جو کلام موزوں اور مقفیٰ ہو اس کا نام شعر ہے اور جو صنعت شعر گوئی سے مخصوص ہو اس کا نام شاعر ہو گیا ہے۔

قرآن مجید میں کفار کی زبانی مذکور ہے بَلِ افْتَرٰىہُ بَلْ ھُوَ شَاعِرٌ (نہیں جھوٹ باندھ لیا ہے، نہیں شعر کہتا ہے) اور لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ (ایک شاعر دیوانہ کے لیے) اور شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِہٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ (یہ شاعر ہے ہم منتظر ہیں اس پر گردش زمانہ کے) بہت سے مفسرین نے تو اس کو اسی پر محمول کیا ہے کہ کفار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام لگایا تھا کہ آپ (نعوذ باللہ) منظوم و مقفیٰ شعر پیش کرتے ہیں حتیٰ کہ انہوں نے قرآن میں جہاں کہیں بھی ایسے الفاظ آئے ہیں جن میں وزن کا شبہ ہوتا ہے جیسے کہ وَجِفَانٍ کَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ اور تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ میں، ان سب کی تاویل کی ہے۔

اور بعض حقیقت شناسوں نے کہا
ہے کہ اس الزام سے کافروں کا یہ مقصد تھا ہی
نہیں کیونکہ کلام اللہ سے ظاہر ہے کہ وہ
اسالیب شعر پر نہیں ہے۔ اور یہ بات ایسی
ہے کہ عجم کے غیر فصیح لوگوں پر بھی مخفی نہیں، فضلاء
عرب کا تو ذکر ہی کیا، بلکہ انہوں نے، (نعوذ باللہ)
آپؐ کو کذب سے منسوب کیا تھا، کیونکہ شعر
کی تعبیر کذب سے کی جاتی ہے اور شاعر بمعنی
کاذب ہے حتیٰ کہ ایک قوم نے تو ادلہ کاذبہ کا
نام ہی "ادلہ شعریہ" رکھا ہے، اور اسی لیے
حق تعالیٰ شانہ نے عام شعراء کا یہ وصف
بیان فرمایا ہے: وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُنَ ط
أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ ه وَ
أَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ (اور
شاعروں کی بات پر چلیں وہی جو بے راہ ہیں،
تو نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر میدان میں سر مارتے
پھرتے ہیں، اور یہ کہ وہ کہتے ہیں جو نہیں کرتے
اور اسی باعث کہ شعر جھوٹ کا ٹھکانہ ہے کہا گیا
ہے احسن الشعر اکذبہ (ع احسن
او دست اکذب او) اور بعض حکماء کا بیان ہے

کہ کوئی متدین صادق اللہجہ شاعری میں نادرہ کار
نہیں دیکھا گیا

بہر حال یہ ایک امر واقعہ ہے کہ آں حضرت
صلی اللہ علیہ وسلم ترجمان حقیقت تھے، شاعر نہ
تھے۔ نہ شاعری آپؐ کے لیے زیبا تھی، پیغمبرانہ
صداقت اور شاعرانہ تخیلات میں زمین آسمان کا
فرق ہے، البتہ کسی موقع پر کسی شاعر کا شعر
پڑھ دینا یا رجز کے وقت بے ساختہ مقفیٰ عبارت
زبان مبارک سے نکل جانا یہ ایک الگ بات
ہے اسے شاعری نہیں کہتے، حافظ ابن حجرؒ
عسقلانی نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ:۔

" اس امر میں اختلاف کیا گیا ہے کہ آں حضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کسی شعر کا بطور تمثیل
بیان کرنا یا کسی دوسرے کا شعر بطور حکایت
نقل کرنا روا تھا تو صحیح یہ ہے کہ ایسا کرنا آپؐ
کے لیے جائز تھا" [1]

علامہ احمد قسطلانی، مواہب اللدنیہ میں لکھتے
ہیں کہ:۔

"آیا شعر کی ممانعت صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم کے لیے خاص تھی یا نوع انبیاء کے لیے تھی

[1] فتح الباری ج ۱۰ ص ۴۴۵ طبع مصر ۱۳۴۸ھ

بعض علماء کا بیان ہے کہ یہ ممانعت عام تھی کیونکہ ارشاد ہے وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ (اور ہم نے نہیں سکھایا اس کو شعر کہنا اور یہ اس کے لائق نہیں) اور اس میں خصوصیت کی کوئی وجہ ظاہر نہیں ہے" ؎

۲۳/۴

شُعَرَاءُ شاعر لوگ، شاعِرٌ کی جمع ہے خلاف قیاس علامہ احمد فیومی، ابن خالویہ سے ناقل ہیں کہ "شاعر کی جمع شعراء اس لیے آئی کہ بعض عرب شَعُرَ بالضم بولتے ہیں اس لیے قیاس یہ ہو کہ اس سے صفت کا صیغہ فعیل کے وزن پر آئے جیسے شرفا کہ شریف کی جمع ہے پر اس طرح کہا جاتا تو شعیر سے التباس ہوتا جس کے معنے جو کے ہیں لہٰذا انہوں نے شاعر کہا اور اس کے اصلی وزن کو محفوظ رکھا، ہاں علما اور حلماء وغیرہ جو ہیں سو علیم اور حلیم کی جمع ہیں" ؎

۱۹/۱۵

شِعْرَىٰ شعریٰ، ایک مشہور ستارہ کا نام ہے خاص طور پر اس کا ذکر اس لیے کیا کہ عرب کی ایک قوم کا یہ معبود تھا، شیخ سلیمان جمل لکھتے ہیں

"عربی زبان میں شعریٰ نام کے دو ستارے ہیں ان میں سے ایک الشعریٰ العبور کہلاتا ہے اور وہی آیہ کریمہ میں مراد ہے کیونکہ قبیلہ خزاعہ اس کی پرستش کیا کرتا تھا، قبیلہ کے سرداروں میں ایک شخص ابوکبشہ نامی تھا اس نے اس کی پوجا کا طریق قائم کیا، کہنے لگا کہ سارے ستارے تو آسمان کو عرض میں قطع کرتے ہیں اور شعریٰ طول میں قطع کرتا ہے اس لیے یہ ان سے جدا ہے چنانچہ اس نے اس کی پوجا شروع کر دی اور خزاعہ و حمیر بھی اسے پوجنے لگے، ابوکبشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ناناؤں میں سے کوئی ہوا ہے، اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مشرکین قریش کو اللہ کی طرف دعوت دی اور ان کے مذاہب کی مخالفت کی تو وہ آپ کو اس شخص سے مشابہت دے کر کہ اس نے ان کے دین کے سوا نیا دین نکالا تھا ابن ابی کبشہ کہتے تھے۔

؎ مواہب اللدنیہ مع شرح زرقانی ج ۵ ص ۲۵۵ طبع مصر

؎ تاج العروس

یہ ستارہ جوزار کے بعد سخت گرما کے زمانہ میں طلوع ہوتا ہے اور "شعری یمانیہ" سے موسوم ہے۔ اور دوسرا ستارا الشعریٰ الغمیصا (بغین معجمہ مضموم و میم مفتوحہ وصاد مہملہ) غمص سے ہے بفتحتین جس کے معنے آنسوؤں کے جاری ہونے کے ہیں" [1]

رسالہ زینت آسمان میں مرقوم ہے۔

"شعرائے یمانی" تمام آسمان میں اس کے برابر کوئی روشن ستارہ نہیں، نیلگوں سفید رنگ ہے اور جب ٹمٹماتا ہے رنگ بدلتا نظر آتا ہے، اس کی روشنی "الدبران" سے بارہ گنی ہے، اس کی ضیا حقیقی ہمارے آفتاب سے بیس گنی ہے، یہ ہمارے آفتاب سے بہت زیادہ گرم ہے اس کا فاصلہ ½ ۸ سال نور ہے، یعنی ان ستاروں میں سے ہے جو ہم سے قریب ہیں۔ یہ ہماری طرف ۳۰۰ میل فی منٹ بڑھ رہا ہے، چونکہ کلب اکبر کا مشہور ستارہ شعری ہی ہے اس لیے اسے "کلب الجبار" بھی کہتے ہیں، ۲۵ جولائی سے ۵ ستمبر تک آفتاب اور کلب الجبار کا طلوع تقریباً ایک ہی وقت پر ہوتا ہے، ان دنوں کو ایام الکلب کہتے ہیں" [2]

۲۷ شُعُوبًا ذاتیں، شاخیں شَعْبٌ کی جمع، جس کے معنے قبائل کے اس جد اعلیٰ کے ہیں، جہاں سب قبیلے جا کر مل جاتے ہوں، یا شعب وہ ایک برادری ہے جو شاخ در شاخ پھیل گئی ہو، عرب میں قبیلہ کی تدریجی تقسیم کثرت سے قلت کی طرف حسب ترتیب ذیل ہے،

پہلے شعب[۱] پھر قبیلہ[۲] پھر عمارہ[۳] پھر بطن[۴] پھر فخذ[۵] پھر فصیلہ[۶]، ابو اسامہ نے تصریح کی ہے کہ یہ طبقے انسانی خلقت کی ترتیب پر ہیں شعب سب سے عظیم تر ہے۔ شعب الراس (جہاں دماغ کے چاروں حصے جڑتے ہیں) سے مشتق ہے۔ پھر قبیلہ اپنے اجتماع کی بنا پر قبیلۃ الراس (کھوپری کا وہ حصہ جو شاخ در شاخ ہوتا ہے) سے ہے، پھر عمارۃ ہے جس کے معنے سینہ کے ہیں۔ پھر بطن

---

[1] حاشیہ الجمل علی الجلالین ج ۴ ص ۲۳۸ طبع مصر ۱۳۵۲ھ

[2] زینت آسمان، از برکت علی و منہاج الدین پروفیسران اسلامیہ کالج پشاور ص ۲۹ طبع روز بازار امرتسر

(پیٹ) ہے پھر فخذ (ران) ہے پھر فصیلۃ ہے جس کے معنے پنڈلی کے ہیں[۱]۔

پ ۲۶ / ۱۴

شُعَیب علیہ الصلوٰۃ والسّلام، مشہور پیغمبر ہیں، ابن عساکر بطریق اسحٰق بن بشر، شرقی بن القطامی سے جو علم انساب کے بڑے ماہر تھے ناقل ہیں کہ آپ عبرانی کے ثیروب ہیں اور عربی کے شعیب[۲]، صغانی نے کہا ہے کہ یہ عربی نام ہے، ممکن ہے کہ شعب کی تصغیر ہو یا اشعب (بہت چوڑے سینہ والا) کی جس طرح کہ اہل عرب اسود کی تصغیر میں سوید کہتے ہیں یہ تصغیر ترخیم[۳] ہے، راغب لکھتے ہیں کہ "شعیب" یا تو شَعْبٌ مصدر کی تصغیر ہے (جس کے معنے فراہم کرنے اور پراگندہ کرنے کے ہیں) اور یا شَعْبٌ اسم کی (جس کے معنے بڑے قبیلہ کے آتے ہیں) اور یا شِعْبٌ کی (جس کے معنی پہاڑ کی گھاٹی کے ہیں) بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ اسے مصغر بتانا غلط ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے ناموں کی تصغیر جائز نہیں ہے، لیکن یہ امر قابل بحث ہے کیونکہ یہ حکم نام کے وضع ہو جانے کے بعد ہے نہ کہ نام رکھتے وقت علاوہ ازیں مختار یہ ہے کہ یہ اسم مرتجل[۷] ہے اور اسی طرح اس کی وضع عمل میں آئی[۴] ہے،

صحیح ابن حبان میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث میں مرفوعاً وارد ہے کہ "چار پیغمبر عرب سے ہیں، ہود، صالح، شعیب اور تمہارے نبی اے ابوذر،[۵] حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی رو سے حضرت شعیب علیہ السلام عرب عاربہ میں سے ہیں[۶] بعض کا خیال ہے کہ آپ عرب کے قبیلہ بنو عنزہ بن اسد سے ہیں کیونکہ طبرانی اور ابن قانع نے حضرت سلمہ بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب وہ اپنے قبیلہ بنو عنزہ کا وفد لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں

۱، ۲، ۳ تاج العروس فصل الشین من باب الباء ۴ ملاحظہ ہو روح المعانی ج ۸ ص ۱۵۳ ۵ الدر المنثور ج ۳ ص ۱۰۲
۵ پوری حدیث لفظ انبیاء کے ضمن میں گذر چکی ہے۔ ۶ فتح الباری ج ۶ ص ۳۴۹
۷ مرتجل وہ اسم ہے جس کو وضع کرتے وقت پہلے معنی کی مناسبت ملحوظ نہ ہو۔

حاضر ہوئے اور قبیلہ عنزہ کی طرف اپنا انتساب ظاہر کیا تو آپ کی زبانِ مبارک سے ارشاد ہوا مرحبا بقوم شعیب و اختان موسیٰ[1] (شعیب کی قوم اور موسیٰ کے سسرال والوں کو مرحبا) لیکن حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں کہا ہے کہ اس کی اسناد میں مجہول راوی ہیں[2]، اور حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس کا پتہ دیتی ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام (کے اقربا میں) سے ہیں، اور عرب عاربہ کے اس قبیلہ سے ہیں جس کو عنزہ کہا جاتا ہے یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ عنزہ بن اسد بن ربیعہ بن نزار بن معد بن عدنان سے ہیں کیونکہ یہ لوگ حضرت شعیب علیہ السلام کے زمانہ دراز کے بعد ہوئے ہیں[3]،

آپ نے جس حسنِ اسلوب کے ساتھ قوم کے سامنے دعوت حق رکھی تھی اور پھر اس سلسلہ میں جو کچھ باہمی سوال وجواب ہوئے اس کے لفظ لفظ سے آپ کی فصاحت و بلاغت اور حسنِ خطابت کے جوہر ٹپکتے ہیں اسی لیے علماء سلف آپ کو "خطیب الانبیاء" کہتے تھے،

ایک مرسل حدیث میں جس کو طبری، حاکم، اور ابن ابی حاتم نے یعقوب بن ابی سلمہ سے بروایت ابن اسحق نقل کیا ہے وارد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر کرتے تو فرماتے ذاك خطیب الانبیاء (وہ خطیب انبیاء ہیں[4]، اسحق بن بشر نے اس روایت کو بایں سند عن جویبر و مقاتل عن الضحاك عن ابن عباس مرفوعاً بھی روایت کیا ہے[5] لیکن یہ سلسلہ سند سخت ضعیف ہے،

---

[1] یہ حدیث مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۵۱ طبع مصر ۱۳۵۳ھ میں منقول ہے اور ابن قانع کا حوالہ کنز العمال ج ۷ ص ۲۰۹ طبع دائرۃ المعارف میں ہے۔

[2] فتح الباری ج ۶ ص ۳۴۹

[3][5] البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۸۵ طبع مصر ۱۳۴۸ھ طبع حسینیہ مصر اور الدر المنثور ج ۳ ص ۱۰۳ طبع مصر

[4] ملاحظہ ہو تاریخ الامم والملوک ج ۱ ص ۱۶۸

مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آیۂ کریمہ وَ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِينَا ضَعِيفًا کی تفسیر میں مروی ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نابینا تھے حاکم نے اس کو مسلم کی شرط پر صحیح بتایا ہے، اور ذہبی نے تلخیص میں حاکم کی تصحیح کو برقرار رکھا ہے[1]، ابوالشیخ اور ابن عساکر نے سعید بن جبیرؓ جو مشہور جلیل القدر تابعی ہیں روایت کیا ہے کہ اللہ کی محبت میں روتے روتے آپ کا یہ حال ہوگیا تھا، یہ مضمون ایک مرفوع روایت میں بھی آیا ہے[2] چنانچہ خطیب اور ابن عساکر نے حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام محبت الٰہی میں اتنے روئے کہ نابینا ہوگئے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دوبارہ بینائی عطا فرمائی اور وحی کی کہ اے شعیب یہ گریہ کیسا ہے جنت کے شوق میں ہے یا دوزخ کے ڈر سے، عرض کیا اے میرے معبود، میرے مولیٰ، تو جانتا ہے کہ نہ تیری جنت کے شوق میں روتا ہوں نہ دوزخ کے ڈر سے لیکن تیری محبت کو اپنے دل میں جما رکھا ہے جب تیری طرف نظر پڑتی ہے تو پھر مجھے پروا نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہو، اللہ تعالیٰ نے ان کی جانب وحی فرمائی کہ شعیب اگر یہ حق ہے تو تمہیں میری لقا مبارک ہو، اور اسی لیے تو میں نے اپنے کلیم موسیٰ بن عمران کو تمہاری خدمت کے لیے کھڑا کر دیا ہے، خطیب نے تاریخ بغداد میں اس حدیث کو منکر کہا ہے[3]، اور ذہبی نے میزان میں تصریح کی ہے کہ یہ حدیث باطل ہے بے اصل[4] اور ابن کثیر سخت غریب[5] بتلاتے ہیں، آپ کی پیغمبرانہ سیرت اور دعوت حق کا تذکرہ قرآن مجید میں جا بجا مذکور ہے (ملاحظہ ہو

اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ اور مَدْيَنَ (پ ۹/۱، پ ۱۲/۸، پ ۱۹/۱۴) ؛ شُعَيْبًا ۸/۱۸، پ ۹/۱، پ ۱۲/۸، پ ۲۰/۱۶

فصل الغین المعجمة

---

[1] مستدرک حاکم مع تلخیص ذہبی ج ۲ ص ۵۶۸ طبع دائرة المعارف حیدرآباد دکن [2] الدر المنثور ج ۳ ص ۳۴۸

[3] تاریخ بغداد ج ۶ ص ۱۵ ، طبع مصر ۱۳۴۹ھ [4] کنز العمال ج ۶ ص ۱۲۵ [5] البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۸۸

شَغَفَهَا اس نے اس کو فریفتہ کرلیا، وہ اس
اس کے دل میں اتر گیا، اس نے اس کے دل
میں جگہ پکڑلی، (فتحہ) شَغَفَ شَغْفٌ سے جس کے معنے
محبت کے دل کے پردوں میں اتر جانے کے
ہیں، ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ھَا ضمیر
واحد مؤنث غائب شَغَافٌ کے معنے پردہ
دل کے ہیں، اس لیے پردہ دل میں اتر جانے
کے لیے شَغَفَ آتا ہے، پ ۱۲/۱۴

شُغُلٌ دھندا، شغل، شُغل، اَشْغَالٌ اور
شُغُولٌ جمع، پ ۲۳/۳

شَغَلَتْنَا ہمیں مشغول کرلیا، ہمیں دھندے
میں لگالیا، (فتحہ) شَغَلَتْ شَغْلٌ سے
جس کے معنے مشغول کرنے کے ہیں ماضی کا
صیغہ واحد مؤنث غائب، نَا ضمیر جمع متکلم،
پ ۲۶/۱۰

فصل الفاء

شَفَا کنارہ، یہ لفظ ہلاکت سے قریب ہونے
کے لیے ضرب المثل ہے اَشْفَاءٌ جمع ہے،
پ ۴/۲ پ ۱۱

شِفَاءٌ بیماری سے اچھا ہونا۔
اصل میں شَفِيَ يَشْفِيْ کا مصدر ہے اور مرض
سے صحت پا جانے کے لیے بطور اسم مستعمل
ہے اَشْفِيَةٌ جمع ہے جیسے کہ سِقَاءٌ کی جمع
اَسْقِيَةٌ ہے پ ۱۱/۱۱ پ ۱۴/۱۵ پ ۱۵/۹ پ ۲۴/۱۹

شَفَاعَةٌ سفارش کرنا، شفاعت کرنا
شَفَعَ يَشْفَعُ کا مصدر ہے، مولانا شاہ اسمٰعیل
شہید نے تقویۃ الایمان میں "شفاعت
پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے جو ہدیہ ناظرین
ہے، فرماتے ہیں،
"کان رکھ کر سن لینا چاہیے کہ اکثر لوگ انبیاء
و اولیاء کی شفاعت پر بہت بھول رہے ہیں
اور اس کے معنے غلط سمجھ کر اللہ کو بھول گئے
ہیں، سو شفاعت کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے،
سو سننا چاہیے کہ شفاعت کہتے ہیں سفارش
کو، اور دنیا میں سفارش کئی طرح کی ہوتی ہے
جیسے ظاہر کے بادشاہ کے ہاں کسی کی چوری
ثابت ہو جائے اور کوئی امیر و زیر اس کو اپنی
سفارش سے بچا لیوے، تو ایک صورت تو
یہ ہے کہ بادشاہ کا جی تو اس چور کے پکڑنے ہی
کو چاہتا ہے اور اس کے آئین کے موافق اس کو
سزا پہونچتی ہے، مگر اس امید سے

دب کر اس کی سفارش مان لیتا ہے اور
اس چور کی تقصیر معاف کر دیتا ہے، کیونکہ وہ
امیر اس کی سلطنت کا بڑا رکن ہے
اور اس کی بادشاہت کو بڑی رونق دے
رہا ہے سو بادشاہ یہ سمجھ رہا ہے کہ ایک جگہ
اپنے غصہ کو تھام لینا اور ایک چور سے
درگذر کر جانا بہتر ہے اس سے کہ اتنے
بڑے امیر کو ناخوش کر دیجیے کہ بڑے بڑے
کام خراب ہو جاویں، اور سلطنت کی رونق
گھٹ جائے، اس کو "شفاعت وجاہت"
کہتے ہیں یعنی اس امیر کی وجاہت کے
سبب سے اس کی سفارش قبول کی، سو
اس قسم کی سفارش اللہ کی جناب میں ہرگز ہرگز
نہیں ہو سکتی اور جو کوئی نبی و ولی کو یا امام اور
شہید کو یا کسی فرشتہ کو یا کسی پیر کو اللہ کی جناب
میں اس قسم کا شفیع سمجھے سو وہ اصلی مشرک
ہے اور بڑا جاہل کہ اس نے خدا کے کچھ
معنے ہی نہیں سمجھے اور اس مالک الملک
کی قدر کچھ بھی نہ پہچانی، اس شہنشاہ کی تو یہ
شان ہے کہ ایک آن میں ایک حکم کن
سے چاہے تو کروڑوں نبی اور ولی اور جن
اور فرشتہ جبرئیل اور محمد صلے اللہ علیہ
وسلم کے برابر پیدا کر ڈالے اور ایک دم
میں سارا عالم عرش سے فرش تک الٹ
پلٹ کر ڈالے اور ایک اور ہی عالم اس
جگہ قائم کرے کہ اس کے تو محض ارادے
ہی سے ہر چیز ہو جاتی ہے کسی کام کے
واسطے کچھ اسباب اور سامان جمع کرنے
کی کچھ حاجت نہیں اور جو سب لوگ پہلے
اور پچھلے اور آدمی اور جن بھی سب مل کر
جبرئیل اور پیغمبر ہی سے ہو جاویں تو اس
مالک الملک کی سلطنت میں ان کے
سبب کچھ رونق نہ بڑھ جاوے گی اور جو
سب شیطان اور دجال ہی سے ہو جاویں
تو اس کی کچھ رونق گھٹنے کی نہیں، وہ ہر صورت
سے بڑوں کا بڑا ہے اور بادشاہوں کا
بادشاہ اس کا نہ کوئی کچھ بگاڑ سکے اور نہ کچھ
سنوار سکے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی
بادشاہ زادوں میں سے یا بیگماتوں میں سے
یا کوئی بادشاہ کا معشوق اس چور کا سفارشی
ہو کر کھڑا ہو جاوے اور چوری کی سزا نہ دینے

ویسے اور بادشاہ اس کی محبت سے لاچار
ہو کر اس چور کی تقصیر معاف کر دے تو اس
کو "شفاعت محبت" کہتے ہیں یعنی بادشاہ
نے محبت کے سبب سے سفارش قبول
کر لی اور یہ بات سمجھی کہ ایک بار غصہ پی جانا
اور ایک چور کو معاف کر دینا بہتر ہے اس
رنج سے کہ جو اس محبوب کے روٹھ جانے
سے مجھ کو ہوگا اس قسم کی شفاعت بھی اس
دربار میں کسی طرح ممکن نہیں اور جو کوئی کسی
کو اس جناب میں اس قسم کا شفیع سمجھے وہ بھی
ویسا ہی مشرک ہے اور جاہل جیسا کہ اول
مذکور ہو چکا، وہ مالک الملک اپنے بندوں
کو بہتیرا ہی نوازے اور کسی کو حبیب کا اور کسی
کو خلیل کا اور کسی کو کلیم کا اور کسی کو روح اللہ
وجیہ کا خطاب بخشے، اور کسی کو رسول کریم اور
امین اور روح القدس اور روح الامین فرمائے
مگر پھر مالک مالک ہے، اور غلام غلام، کوئی
بندگی کے رتبہ سے قدم باہر نہیں رکھ سکتا
اور غلامی کی حد سے زیادہ نہیں بڑھ سکتا جیسا
اس کی رحمت سے ہر دم خوشی سے جھکتا ہے
ویسا ہی اس کی ہیبت سے رات دن زہرہ
پھٹتا ہے،

۳ تیسری صورت یہ ہے کہ چور پر
چوری ثابت ہو گئی مگر وہ ہمیشہ کا چور نہیں
اور چوری کو کچھ اس نے اپنا پیشہ نہیں ٹھہرایا
مگر نفس کی شامت سے قصور ہو گیا سو اس
پر شرمندہ ہے اور رات دن ڈرتا ہے، اور
بادشاہ کے آئین کو سر آنکھوں پر رکھ کر اپنے
تئیں قصوروار سمجھتا ہے اور لائق سزا کے
جانتا ہے اور بادشاہ سے بھاگ کر کسی امیر
وزیر کی پناہ نہیں ڈھونڈھتا اور اس کے
مقابلہ میں کسی کی حمایت نہیں جتاتا اور رات
دن اسی کا منہ دیکھ رہا ہے کہ دیکھیے میرے
حق میں کیا حکم فرما دے سو اس کا یہ حال
دیکھ کر بادشاہ کے دل میں اس پر ترس آتا
ہے مگر آئین بادشاہت کا خیال کر کے
بے سبب درگذر نہیں کرتا کہ کہیں لوگوں
کے دلوں میں اس آئین کی قدر گھٹ نہ جاوے
سو کوئی امیر و وزیر اس کی مرضی پا کر اس تقصیروار
کی سفارش کرتا ہے اور بادشاہ اس امیر
کی عزت بڑھانے کو ظاہر میں اس کی سفارش
کا نام کر کے اس چور کی تقصیر معاف کر دیتا ہے

سو اس امیر نے اس چور کی سفارش
اس لیے نہیں کی کہ اس کا قرابتی ہے
یا آشنا یا اس کی حمایت اس نے اٹھائی
بلکہ محض بادشاہ کی مرضی سمجھ کر، کیونکہ وہ تو
بادشاہ کا امیر ہے نہ چوروں کا تھانگی جو
چور کا حمایتی بن کر اس کی سفارش کرتا ہو
تو آپ بھی چور ہو جاتا ہے اس کو "شفاعت
بالاذن" کہتے ہیں یعنی یہ سفارش خود
مالک کی پروانگی سے ہوتی ہے، سو
اللہ کی جناب میں ایسی قسم کی شفاعت
ہو سکتی ہے اور جس نبی و ولی کی شفاعت
کا قرآن و حدیث میں مذکور ہے سو اس کے
معنے یہی ہیں"[1] پ ۱ ع ۱۵ و ۱۶، پ ۳/۲
پ ۵/۶، پ ۱۶/۹ و ۱۵، پ ۲۲/۹، پ ۱۴/۲، پ ۲۵/۱۳، پ ۲۹/۱۶

شُفَعَاؤُهُمْ ان کی شفاعت ان کی
سفارش، شفاعۃُ مضاف، ھُمْ ضمیر جمع
مذکر غائب، مضاف الیہ پ ۲۳/۲۷

شَفَتَيْنِ دو ہونٹ، شَفَةٌ کا تثنیہ بحالت
نصب و جر، شَفَةٌ کے معنے ہونٹ کے
ہیں، بعض کے نزدیک اس کا لام کلمہ ہا
ہے اور اصل شَفَهَةٌ ہے پھر ہار اصلیہ
حذف کر دی گئی اور دوسری ہا جو تانیث
کی علامت تھی باقی رکھی گئی۔ اور بعض کے
نزدیک اس کی اصل شَفَوَةٌ ہے واو کو
حذف کرکے اس کا فتحہ ماقبل کو دیدیا گیا ہے
شِفَاهٌ اور شَفَوَاتٌ جمع ہے، پ ۳۰/۱۵

شَفْعٌ جفت (جو طاق کی ضد ہے) جوڑا
ایک چیز کا اپنی ہی جیسی چیز کے ساتھ ضم ہونا،
واضح رہے کہ لغت میں تو "شفع" کے یہی معنے
ہیں،[2] لیکن یہاں اس سے کیا کوئی متعین سے
مراد ہے، تو اس بارے میں مفسرین کے متعدد
اقوال ہیں، صغانی نے کہا ہے کہ شَفْعٌ و وتر
کے بارے میں بیس قول ہیں، تفسیر کبیر کے کلمہ
میں یہ سب اقوال درج ہیں،[3] حافظ ابوحیان
اندلسی، البحر المحیط میں لکھتے ہیں کہ شفع و وتر کے
بارے میں کتاب التحریر والتحبیر میں (۳۶) قول

---

[1] ملاحظہ ہو تقویۃ الایمان فصل ثالث،

[2] تاج العروس فصل الشین من باب العین

[3] ملاحظہ ہو تفسیر کبیر ج ۸ ص ۳۹۲ و ۳۹۴ طبع مصر ۱۳۲۴ھ

ذکر کیے ہیں جنہیں کے پڑھنے ہی سے ہم تنگ آگئے
اپنی اس کتاب میں ان کا درج کرنا تو بڑی بات
ہے[1]، امام محمد بن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں
خوب فیصلہ کیا ہے کہ

"اس بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ یوں کہا
جائے کہ اللہ تعالیٰ نے شفع و وتر کی قسم کھائی
ہے اور روایت سے یا عقل سے "شفع" و "وتر"
کی کسی نوع کی تخصیص نہیں ہوئی کہ یہی نوع ہے
اور نوع نہیں اور ہر شفع و وتر کی اللہ نے قسم
کھائی ہے تو جس شئے کے متعلق بھی اہل تفسیر کا
بیان ہے کہ وہ اللہ کے اس عموم کی قسم میں
داخل ہے تو اللہ نے اس کی قسم کھائی ہے[2]

(ملاحظہ ہو وتر) پ ۳۰ ع ۱۴

شُفَعَآءُ سفارشی، سفارش کرنے والے،
شفاعت کنندہ، شَفِیْعٌ کی جمع، واضح رہے
کہ تمام قرآن مجید میں اس کی املا اسی طرح عین
الف کے ساتھ ہے مگر سورہ روم میں یہ عین
واو کے ساتھ اس طرح مرقوم ہے شُفَعٰٓؤُا،
پہلے عین سے پھر واو پھر ہمزہ اور پھر الف، اور واو
اور الف کا تلفظ نہیں ہوتا ہے ۵/۱۳ ۲۱/۵ ۳/۲

شُفَعَآءَکُمْ تمہارے سفارشی، شُفَعَآءَ
مضاف، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ
پ ۲۴ ع ۷

شُفَعَآؤُنَا ہمارے سفارشی شُفَعَآؤُ
مضاف، نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ
پ ۱۱ ع ۷

شَفَق شفق، واضح رہے کہ "شفق" کے
معنے میں اختلاف ہے، بعض شام کے
وقت افق کی سرخی کو "شفق" کہتے ہیں اور
اور بعض اس کی سپیدی کو راغب نے جو
"شفق" کے معنے بیان کیے ہیں وہ ان کی
امامت فن کے شایان شان ہے، فرماتے
ہیں "سورج کے ڈوب جانے پر دن کی روشنی
اور رات کی سیاہی کی باہمی آمیزش "شفق"
ہے۔ یہ معنے کنارہ آسمان کی سرخی اور
سپیدی دونوں پر مشتمل ہیں، علامہ ابوسعادات
ابن الاثیر جزری لکھتے ہیں۔

"شفق اضداد میں سے ہے۔ اس سرخی کے لئے
بھی استعمال ہوتی ہے کہ جو مغرب میں آفتاب غروب
ہونے پر نظر آتی ہے۔ اور امام شافعی نے

[1] البحر المحیط ج ۶ ص ۴۶۸ طبع مصر ۱۳۲۸ھ [2] تفسیر جامع البیان معروف بہ تفسیر ابن جریر جلد ۳۰ ص ۱۴۲ طبع مصر

اسی کو لیا ہے، اور اس سپیدی کے لیے بھی آتی
ہے کہ جو سرخی کے بعد مغربی افق پر باقی رہتی
ہے اور امام ابوحنیفہ نے اسی کو اختیار کیا ہے[1]

شوکانی نے تفسیر فتح القدیر میں ابوحنیفہ کے
قول کو نقل کر کے لکھا ہے کہ

ولا وجه لهذا — اس قول کی کوئی وجہ نہیں
القول لا متمسك — اور نہ اس کے لیے زبان
له لا من لغة العرب — عرب سے کوئی سند ہے
ولا من الشرع — اور نہ شرع سے۔

(ج ۵ ص ۳۹۹)

لیکن یہ شوکانی کی خیرہ چشمی ہے، امام ابوبکر
جصاص فرماتے ہیں

"شفق کے بارے میں ائمہ مختلف ہیں، ابوحنیفہ
سپیدی کو شفق بتاتے ہیں اور ابو یوسف، محمد،
ابن ابی لیلیٰ، مالک، ثوری، حسن بن صالح اور
شافعی کہتے ہیں کہ شفق سرخی ہے،
اور سلف نے بھی شفق کے متعلق اختلاف
کیا ہے کہ کیا ہے، بعض نے سپیدی کو بتایا ہے
اور بعض نے سرخی کو جو لوگ سرخی بتاتے ہیں
ان میں حضرت ابن عباس، ابن عمر، عبادہ بن
الصامت، اور شداد بن اوس (رضی اللہ عنہم)
ہیں، .... اور جن سے یہ مروی
ہے کہ "شفق" سپیدی ہے ان میں حضرت
عمر بن الخطاب، معاذ بن جبل اور عمر بن عبد العزیز
ہیں[2] (رضی اللہ عنہم)

آگے چل کر لکھتے ہیں،

جب لوگوں نے شفق میں اختلاف کیا اور بعض
کہنے والوں نے سرخی کہا اور دوسروں نے سپیدی
تو ہمیں معلوم ہوا کہ یہ نام دونوں معنی کو شامل ہے
اور لغت میں دونوں کے لیے آتا ہے اگر ایسا
نہ ہوتا تو یہ لوگ شفق کی تفسیر ان دونوں
معنی سے نہ کرتے کیونکہ وہ لوگ اسماء لغویہ
اور شرعیہ کے معانی کے عالم تھے، دیکھتے نہیں
جب علماء نے قرء کے معنے میں اختلاف کیا
اور بعض نے حیض کے معنے بتائے اور بعض نے
طہر کے تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ لفظ دونوں
معنی کے لیے آتا ہے ہاں اس کے بعد یہ
ضرورت پڑتی ہے کہ آیت میں ان میں سے
جو مراد ہے اس کی دلیل معلوم کریں، اور ہم سے
ابو عمر و غلام ثعلب نے بیان کیا کہ ثعلب سے

[1] النہایہ فی غریب الحدیث والاثر باب الشین مع الفاء، [2] احکام القرآن ج ۲ ص ۴۴۳ طبع مصر ۱۳۴۷ھ

شفق کے بارے میں سوال کیا گیا کہ کیا ہے
انہوں نے کہا سپیدی، سائل نے کہا کہ
شواہد سرخی کے زیادہ ہیں، ثعلب نے
جواب دیا کہ جو غیر ظاہر ہو اس کے لیے شواہد
کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بیاض (سپیدی)
تو لغت میں اس سے زیادہ مشہور ہے
کہ اس کے لیے کسی شاہد کی ضرورت ہو،
ابوبکر کہتے ہیں اور یہ کہا جاتا ہے
کہ شفق کی اصل رقت ہے اور اسی سے
ثوب شفق (رقیق کپڑا) بولا جاتا ہے۔
نیز اسی سے شفقت ہے جس کے معنے
رقتِ قلب کے ہیں اور جب اس کی اصل
یہ ٹھیری تو سپیدی کو شفق سے زیادہ
خصوصیت ہونی چاہیے کیونکہ "شفق" سے
مراد آفتاب کی روشنی کے باقی ماندہ اجزاء
رقیقہ ہیں، اور یہ اجزاء سرخی کی بہ نسبت سپیدی
میں زیادہ رقیق ہوتے ہیں" [1]
اخیر بحث میں ایک اور دلیل پیش کی ہے فرماتے
ہیں ا
"ایک اور چیز جس سے اس پر استدلال
ہوتا ہے کہ شفق سے مراد بیاض ہے یہ
ہے کہ ہم آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے
سرخی اور اس سے قبل سپیدی کو پاتے ہیں
اور سب ایک ہی نماز کا وقت ہے کیونکہ
دونوں کی دونوں بغیر قرص آفتاب کے ظاہر
ہوئے اسی کی روشنی سے ہوتی ہیں اسی طرح
یہ بھی ضروری ہے کہ غروب آفتاب کے بعد
بھی سرخی و سپیدی ایک ہی نماز کا وقت
ہوں، اسی علت کی بنا پر جسے ہم نے بیان کیا
ہے" [2] ۳۰/۹

شَفِیْعٌ شفاعت کنندہ، سفارشی، سفارش
کرنے والا، شَفَاعَۃٌ سے بر وزن فَعِیْلٌ
بمعنے فَاعِلٌ ہے، ۱۱/۶ ۷/۱۴ و ۱۴/۱۲
۲۱/۱۴ ۲۴/۷

فصل القاف

شِقٌّ مشقت، جانکاہی، راغب لکھتے
ہیں کہ شِقٌّ وہ مشقت اور تکان ہے جو
انسان کے نفس اور بدن کو لاحق ہوتی ہے
بعض نے اس کو شَقَّ یَشُقُّ کا مصدر بتلایا ہے

بمعنے دشواری میں پڑنے اور دشواری میں ڈالنے
کے اور بعض نے اسم قرار دیا ہے پ ۲۲

شَقًّا چیرنا، پھاڑنا، شَقَّ یَشُقُّ کا مصدر ہے،

پ ۳۰/۵

شِقَاق ضد، مخالفت، مقابلہ، اپنے دوست
کی شق کو چھوڑ کر دوسری شق میں ہونا، باب
مفاعلت کا مصدر ہے، علامہ ابوحیان اندلسی
البحر المحیط میں لکھتے ہیں،

"شِقَاقٌ مصدر ہے شَاقَّ کا، جس طرح کہ
ضارب ضِرابًا اور خالف خلافًا بولتے
ہیں اور اس کے معنے عداوت رکھنے اور
مخالفت کرنے کے ہیں، اس کی اصل شَقٌّ سے
ہے، یعنی یہ ایک شق میں ہوا اور وہ ایک
شق میں شق طرف کو کہتے ہیں چنانچہ شاعر
کہتا ہے

اذا ما بکی من خلفها انحرفت له
بشق وشق عندنا لم یحول

(جب بچہ اس کی پشت پر سے روتا ہے تو
وہ ایک جانب سے اس کی طرف مڑ جاتی
ہے اور اس ایک طرف ہماری جانب
رہتی ہے جو نہیں بدلتی)

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مَشَقَّۃٌ سے ماخوذ
ہے کیونکہ دونوں میں سے ہر ایک اس چیز کا
خواہش مند ہوتا ہے کہ جو دوسرے کو شاق
ہو"۔ [1] پ ۱/۱۴ پ ۵/۷ پ ۵/۱۳ پ ۱۱/۱۴ پ ۲۳/۱۰

پ ۲۵/۱

شِقَاقِیْ میری مخالفت، میری عداوت،
شقاق مضاف، ی ضمیر واحد متکلم مضاف الیہ،

پ ۱۲/۸

شَقَقْنَا ہم نے چیرا، ہم نے پھاڑا،
شَقَّ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، پ ۳۰/۵

شَقُوْا وہ بدبخت ہوئے شَقَاوَۃٌ سے
ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب۔ (ملاحظہ ہو تَشْقٰی)

پ ۱۲/۹

شِقْوَتُنَا ہماری کم بختی، شِقْوَۃٌ مضاف،
نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، شِقْوَۃٌ شَقِیَ
یَشْقٰی کا مصدر ہے جس کے معنے بدبخت
ہونے کے ہیں، پ ۱۸

شُقَّۃٌ مسافت، راغب نے "شقۃ" کے
معنے اس سمت کے لکھے ہیں جہاں پہنچنے تک

[1] البحر المحیط ج ۱ ص ۳۹۸

مشقت لاحق ہوجائے، یہاں غزوہ تبوک
کی مسافت مراد ہے، پ ۱۰ ع ۱۲
شَقِيٌّ بدبخت، محروم، شَقَاوَۃٌ سے بروزن
فَعِيْلٌ صفت مشبہ کا صیغہ ہے اَشْقِيَاءُ
جمع، پ ۱۲ ع ۹ شَقِيًّا پ ۱۶ ع ۵، ۶، ۷

فصل الکاف

شَكٌّ شک، شَكَّ يَشُكُّ کا مصدر ہے
جس کے معنے شک کرنے کے ہیں، نیز بطور
اسم بھی مستعمل ہوتا ہے، اور شُكُوْكٌ جمع آتی
ہے، راغب اصفہانی لکھتے ہیں،
"انسان کے نزدیک دو نقیضوں[۵] کے برابر
اور مساوی ہونے کا نام شک ہے یہ
یا تو اس بنا پر ہوتا ہے کہ دونوں نقیضوں کی
علامتیں مساوی طور پر پائی جاتی ہیں اور یا اس
بنا پر کہ دونوں میں علامت نہیں ہوتی،
شک کبھی تو اس شے ہی میں ہوتا ہے
کہ موجود بھی ہے یا نہیں، اور کبھی اس کی جنس
میں کہ کس جنس سے ہے، اور کبھی اس کی کسی
صفت میں اور کبھی اس کی غرض کے بارے
میں کہ جس کے لیے وہ شے وجود میں لائی گئی،
شک جہل ہی کی ایک قسم ہے لیکن
جہل سے اخص ہے، کیونکہ جہل میں کبھی سرے
سے نقیضین کا علم ہوتا ہی نہیں، پس ہر شک
جہل ہے لیکن ہر جہل شک نہیں، ارشاد ہے
فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ (ایسے تردد میں جو چین نہ لینے
دے)، بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ (کوئی نہیں
وہ دھوکے میں ہیں کھیلتے) فَاِنْ كُنْتَ
فِيْ شَكٍّ (سو اگر تو ہے شک میں)
شَكٌّ کا اشتقاق یا تو شَكَكْتُ
الشَّيْءَ سے ہے جس کے معنی ہیں میں نے اس کو چاک
کر ڈالا شاعر کہتا ہے،

وشككت بالرمح الاصم ثيابه
ليس الكريم على القنا بمحرم

(اور میں نے ٹھوس نیزے سے اس کے کپڑے
(زرہ وغیرہ جنگ کا لباس مراد ہے) چاک کر ڈالے
نیزے پر باعزت آدمی حرام نہیں ہے)
گویا" شک کسی شے کا پاک چاک ہونا
اور اس طرح ہو جانا ہے کہ رائے اس میں جمنے کے
لیے اپنا کوئی ٹھکانا نہ پا سکے اور یہ بھی صحیح ہوسکتا ہے

---

[۵] ملاحظہ ہو سراۓ

کہ اس شَلَكَ سے مستعار ہو جس کے معنے بازو کے پہلو سے چپکنے کے ہیں یہ اس طرح کہ (شک میں) دونوں نقیضیں باہم اس طرح مل جاتی ہیں کہ سمجھ اور رائے کو ان کے درمیان گھسنے کا موقع نہیں ملتا۔ اہل عرب جو التبس الامر (معاملہ مشتبہ ہوگیا) اختلط الامر (معاملہ گڑبڑ ہوگیا) اشکل الامر (معاملہ مشکل ہوگیا) وغیرہ استعارۃً استعمال کرتے ہیں وہ بھی اسی معنی کے شاہد ہیں"

۶/۲ ۔ ۱۱/۱۵و۱۶ ۔ ۱۲/۹و۱۰ ۔ ۱۳/۱۴ ۔ ۲۰/۱

۲۲/۱۳و۱۹ ۔ ۲۳/۱۰ ۔ ۲۴/۹و۲۰ ۔ ۲۵/۱۳و۱۴

شَکَرَ اس نے شکر کیا، اس نے قدر جانی اس نے حق مانا۔ شَکَرَ ہے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب۔ ۱۹/۱۸ ۲۷/۹

شُکْرًا | شکر کرنا، احسان ماننا، قدر پہچاننا، شَکَرَ یَشْکُرُ کا مصدر ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں

"شکر نعمت کے تصور اور اس کے اظہار کو کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ کَشْرٌ سے مقلوب ہے جس کے معنے کھولنے کے ہیں، اور کُفْرٌ اس کی ضد ہے جس کے معنے نعمت کے بھلانے اور اس کے چھپانے کے ہیں دابۃ شکوٌر وہ جانور ہے جو اپنی فربہی سے اپنی مالک کی رکھوالی کا پتہ دے رہا ہو، اور بعض نے کہا ہے کہ اس کی اصل عین شکری ہے یعنی وہ چشمہ جو کہ پُر ہو اس اعتبار سے اپنے منعم کے ذکر سے (اوقات کے) پر ہو جانے کا نام شکر ہے"

علامہ لغوی مجد الدین فیروز آبادی، بصائر ذوی التمییز فی لطائف کتاب اللہ العزیز میں رقمطراز ہیں کہ

"شکر پانچ قاعدوں پر مبنی ہے اول شاکر کی مشکور کے لیے فروتنی دوسرے اس سے محبت کرنا تیسرے اس کی نعمت کا معترف ہونا چوتھے اس نعمت کی بنا پر اس کی ثنا کرنا پانچویں اس نعمت کو ایسی جگہ استعمال میں نہ لانا جہاں وہ ناپسند کرے، یہ پانچ باتیں شکر کی اساس ہیں اور ان ہی پر اس کی بنیاد ہے اگر ان میں سے ایک بھی معدوم ہوئی تو شکر کے قواعد میں سے ایک قاعدہ مختل ہوگیا شکر کے بارے میں جس نے بھی کلام کیا ہے اس کا کلام ان ہی امور کی طرف راجع اور ان ہی میں دائر ہے"[1]

[1] تاج العروس فصل الشین من باب الراء۔

آیہ کریمہ اِعْمَلُوْا آلَ دَاوٗدَ شُکْرًا (کام کرو اے داؤد کے گھر والو احسان مان کر) کے متعلق امام راغب نے لکھا ہے کہ "بعض نے کہا ہے کہ شُکْرًا بربنائے تمیز منصوب ہے یعنی جو کچھ بھی تم عمل کرتے ہو اس کو اللہ تعالیٰ کے شکر کے لیے کرو، اور بعض نے کہا ہے کہ شُکْرًا، اِعْمَلُوْا کا مفعول ہے اور اِعْمَلُوْا فرمایا گیا اُشْکُرُوْا نہیں فرمایا گیا یہ اس لیے کہ شکر کے انواع سہ گانہ (شکر قلبی، شکر لسانی، اور شکر جمیع اعضاء وجوارح) کے التزام پر متنبہ کر دیا جائے" (ملاحظہ ہو اُشْکُرْ اور حَمْد) پ ۲۲/۸

شَکَرْتُمْ تم نے شکر کیا، تم نے حق مانا، تم نے احسان مانا، شَکَرَ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، پ ۵/۱۸ ۱۳/۱۴

شَکْلِہٖ اس کی شکل، شَکْلِ مضاف ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، شَکْلٌ کے معنے مثل اور مانند کے ہیں اَشْکَالٌ جمع، واضح رہے کہ "شکل" کا استعمال ہیئت وصورت کے بارے میں ہوتا ہے اور نِدٌّ کا جنسیت میں اور شِبْہٌ کا کیفیت میں، پ ۲۳/۱۳

شَکُوْرٌ بڑا شکر گذار، بڑا احسان ماننے والا، بڑا قدر دان، شُکْرٌ سے بروزن فَعُوْلٌ صفت کا صیغہ ہے مبالغہ کے اوزان میں سے ہے، مذکر ومؤنث دونوں کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے، شُکُرٌ جمع ہے "شکور" وہ بندہ ہے کہ جو اطاعت الٰہی اور اس عبادت کی بجا آوری کے ذریعہ کہ جو اس پر مقرر کی گئی ہے حق تعالیٰ کی شکر گذاری میں خوب کوشاں ہو، یہ بھی واضح رہے کہ شَکُوْرًا اسمائے حسنیٰ میں سے ہے جب اللہ سبحانہ کی صفات میں اس کا استعمال ہوگا تو اس کے معنے بڑے قدر دان یعنی تھوڑے کام پر گھنا ثواب دینے والے کے ہوں گے، پ ۱۳/۱۳ ۳۱/۱۳ ۲۲/۸، ۱۹ ۲۵/۵، ۴ ۲۸/۱۶

شَکُوْرًا پ ۱۵/۱

شُکُوْرًا شکر گذاری، شکر کرنا، شَکَرَ یَشْکُرُ کا مصدر ہے، پ ۱۹/۴ ۲۹/۱۹

فصل المیم

شِمَالٌ جانب شمال، بائیں طرف، یَمِیْنٌ کا مقابل، اسم ہے اَشْمُلٌ اور شُمُلٌ

جمع، ۱۵/۱۴،۱۵ — ۲۲/۸ — ۲۶/۱۶ — ۲۷/۱۵ — ۲۹/۸

شِمَالِہٖ اس کی بائیں طرف، شِمَالِ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ، ۲۹/۵

شَمَآئِلِ بائیں طرف، بائیں جانب، شِمَالٌ کی جمع خلاف قیاس، ۱۴/۱۲

شَمَآئِلِھِمْ ان کے بائیں سے، شَمَآئِلِ مضاف، ھِمْ ضمیر مذکر غائب مضاف الیہ، ب/۹

شَمْس سورج کو بھی کہتے ہیں اور دھوپ کو بھی، شُمُوْسٌ جمع، ۷/۱۵،۱۸ — ۳/۳ — ۱۱/۶ — ۱۲/۱۱ — ۱۳/۷،۱۷ — ۱۴/۸ — ۱۵/۹،۱۴ — ۱۶/۱۷،۲۲ — ۱۷/۹،۳ — ۱۹/۱۷،۳ — ۲۱/۱۳،۲۲ — ۲۲/۱۴ — ۲۳/۱۵،۲۲ — ۲۴/۱۹ — ۲۶/۱۷ — ۲۷/۱۱ — ۲۹/۱۷،۹ — ۳۰/۱۹،۲۶

شَمْسًا ۲۶/۱۹

فصل النون

شَنَاٰنُ دشمنی کرنا، بغض رکھنا، یہ مصدر سماعی ہے خلاف قیاس، اس کا فعل باب فَتَحَ اور سَمِعَ دونوں سے آتا ہے، ۶/۵،۸

فصل الواو

شُوَاظٌ شعلے، آگ جس میں دھواں نہ ہو، اسم ہے، ۲۷/۱۲

شَوْبًا ملونی، ملاوٹ، آمیزش، شَابَ یَشُوْبُ کا مصدر ہے، ۲۳/۶

شُوْرٰی مشورہ کرنا، قاضی شوکانی لکھتے ہیں کہ

"شوری شاورت (باب مفاعلت) کا مصدر ہے، جیسے کہ بُشْرٰی اور ذِکْرٰی ہے"[1] ۲۵/۵

شَوْکَۃِ کانٹا، شوکت، "شوکت" کے معنے اصل میں تو کانٹے کے ہیں، اور مجازاً ہتھیار اور سختی کے معنے میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے، ۹/۱۵

شَوٰی کلیجہ، منہ کی کھال، سر کی کھوپڑی، لغت میں اس کا استعمال تینوں معانی میں ہوتا ہے، راغب لکھتے ہیں کہ شَوٰی کے معنے اطراف بدن کے ہیں جیسے کہ ہاتھ اور پیر یہ شَوَاۃٌ کی جمع ہے جیسے کہ نَوٰی

[1] فتح القدیر ج ۴ ص ۵۲۶ طبع مصر ۱۳۵۸ھ

نوٰاۃ کی ہے، علامہ ابو حیان اندلسی نے اس کے حسب ذیل معانی نقل کیے، سر کی کھال، انسان کی کھال، حیوان کے ہاتھ پاؤں، ہر عضو کہ جس سے قتل نہ کیا جاتا ہو[1] اور سر کی کھوپڑی وغیرہ کے معنے کتب لغت میں مذکور ہیں،

پ ۲۹

فصل الھاء

شِہَابٌ انگارا، فضا میں جو تارا ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے، ابن السکیت اور ابو الہیثم سے انگارے ہی کے معنے منقول ہیں اور راغب نے "شہاب" کے معنی اس چمکدار شعلہ کے بتائے ہیں کہ جو بھڑکتی ہوئی آگ میں یا فضا میں ابر کے اندر ہوتا ہے شُہُبٌ، شُہْبَانٌ شِہْبَانٌ اَشْہُبٌ جمع، پ ۱۴/۲ پ ۱۹/۱۹ پ ۲۳/۵ شِہَابًا

پ ۲۹/۱۱

شَہٰدٰتٌ گواہیاں، شَہَادَۃٌ کی جمع ہے، (ملاحظہ ہو شہادۃ) پ ۱۵/۶

شَہٰدٰتِہِمْ ان کی گواہیاں، شَہَادَاتِ مضاف، ہِمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ،

پ ۲۹

شَہَادَتُنَا ہماری گواہی، شَہَادَۃٌ مضاف، نَا ضمیر جمع متکلم مضاف الیہ، پ ۷

شَہَادَتُہُمْ ان کی گواہی، شَہَادَۃٌ مضاف، ھُمْ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ،

پ ۲۵/۸

شَہَادَتِہِمَا ان دونوں کی گواہی، شَہَادَۃٌ مضاف، ہِمَا ضمیر تثنیہ مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۷

شَہَادَۃٌ گواہی، قطعی خبر، ظاہر، کھلا، اصل میں تو یہ شَہِدَ یَشْہَدُ کا مصدر ہے لیکن اسم ہو کر بھی استعمال ہوتا ہے، شَہَادَاتٌ جمع، امام راغب لکھتے ہیں،

" شُہُوْدٌ اور شَہَادَۃٌ کے معنے اس حضور (موجود رہنا، سامنے ہونا) کے ہیں جو مشاہدہ کے ساتھ ہو خواہ مشاہدہ بصر کے ساتھ ہو یا بصیرت کے ذریعہ اور کبھی صرف حضور کو بھی کہتے ہیں جیسے عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّہَادَۃِ (دانائے غیب (حضور رہے) لیکن شہود (کا استعمال) حضور مجرد کے ساتھ

[1] دیکھو البحر المحیط ج ۸ ص ۳۳۰

ادے ہے اور شہادۃ کا اس حضور کے لیے
کہ جو مشاہدہ کے ساتھ ہو،

نیز شہادۃ وہ بیان ہے جو اس علم
کی بنا پر سرزد ہو کر جو مشاہدہ بصیرت یا مشاہدۂ
بصر کے ذریعہ حاصل ہوا ہو" لہ ١/١٦ ، ٣/٧

٧/٤ ٣ ٨ ٣ ١٥ ، ١١/١ ، ٢ ، ١٣/٨ ، ١٨/٥ ٥ ٧ ، ٢١/١٤ ، ٢٤/٢

٢٨/١١١ ٦ ١٦ ١٧

شُہُبًا انگارے، شِہَابٌ کی جمع جس طرح
کہ کُتُبٌ کِتَابٌ کی جمع ہے، ٢٩/١١

شَہِدَ اس نے پایا، اس نے گواہی دی،
پہلے معنے کے اعتبار سے شُہُوْدٌ سے اور
دوسرے معنے کے اعتبار سے شَہَادَۃٌ سے
ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب، راغب لکھتے
ہیں،

" شہد کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے ایک
تو "علم" کی جگہ آتا ہے اور اسی لفظ سے شہادت
قائم ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے اشھد بکذا
(میں گواہی دیتا ہوں) اور گواہ کا اَعْلَمُ
کہنا قبول نہیں بلکہ اشھد کہنے کی ضرورت
ہے، اور دوسرے قسم کے مقام پر چنانچہ
اشھد باللہ ان زیدا منطلق
(میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ زید چل رہا ہے)
کہے گا تو قسم ہو جائے گی، اور بعض نے
کہا ہے کہ اگر اشھد ہی کہا اور باللہ
نہ کہا تب بھی قسم ہو جائے گی"

٢/٧ ، ٣/١٠ ، ١٢/١٣ ، ٢٤/١٦ ، ٢٥/١٣

٢٦/١

شُہَدَآءَ موجودین، حاضرین، شاہد،
نگراں، گواہ بتانے والے، شہادت
پانے والے، شہید، علامہ ابو حیان
اندلسی لکھتے ہیں

" شُہَدَاءُ شَہِیْدٌ کی جمع ہے جو مبالغہ
کے لیے ہے جیسے کہ علیم اور علماء
یہ بھی بعید نہیں کہ شاہد کی جمع ہو جیسے
کہ شاعر اور شعراء پر فُعَلَاءُ فَاعِلٌ
کا باب نہیں لہ ہے"

اور آگے چل کر لکھا ہے کہ

" اس کا شہید کی جمع ہونا شاہد
کی جمع ہونے سے زیادہ بہتر ہے کہ
فعیل کی جمع کے قاعدہ پر جاری ہے" ٢ لہ ١/١٦

٢/١ ، ٣/٧ ، ٤/١ ٥ ، ٥/٦ ٧ ١٧ ، ٦/٦ ١١٩ ، ٨/٤

١٧/١٧ ، ١٨/٧ ٨ ٩ ، ٢٤/٤ ، ٢٧/١٨

لہ البحر المحیط ج ١ ص ١٠٢ ، ٢ لہ ایضاً ص ١٠٦

شُهَدَاءَكُمْ تمہارے مددگار، تمہارے گواہ، شہداء مضاف، کُمْ ضمیر جمع مذکر حاضر مضاف الیہ، آیۂ کریمہ وَادْعُوْا شُهَدَاءَكُمْ کی تفسیر ہر اس شے سے کی گئی ہے کہ شہادت کے معنی جس کے مقتضی ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مددگار کے معنی لئے ہیں مجاہد نے کہا ہے کہ جو لوگ تمہاری گواہی دیں بعض کا قول ہے کہ جن کے موجود ہونے کا اعتبار ہو پ ۱/۳ پ ۵

شَهِدْتُمْ تم نے بتلایا، تم نے گواہی دی، شَهَادَةٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر پ ۱۷/۱۲

شَهِدْنَا ہم نے اقرار کرلیا، ہم نے بیان کیا ہم موجود تھے، ہم نے دیکھا، شُهُوْدٌ اور شَهَادَةٌ سے ماضی کا صیغہ جمع متکلم، راغب نے لکھا ہے کبھی شہادت سے اقرار کرنا بھی مراد ہوتا ہے پ ۳ پ ۹/۱۲ پ ۱۲/۱۳ پ ۱۹/۱۹

شَهِدُوْا انھوں نے گواہی دی، انھوں نے اقرار کیا، وہ موجود تھے، انھوں نے دیکھا، شُهُوْدٌ اور شَهَادَةٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب، پ ۳/۱۲ پ ۱۲/۱۲ پ ۸/۱۱ پ ۲۵/۸

شَهْرٌ مہینہ، اَشْهُرٌ اور شُهُوْرٌ جمع مہینہ کی دو قسمیں ہیں قمری جس کا شمار چاند کے دیکھنے سے ہوتا ہے اور شمسی جس کا شمار آفتاب کے ایک برج سے دوسرے برج میں داخل ہونے سے ہوتا ہے احکام شرعی میں قمری ماہ کا اعتبار ہے مہینہ کا نام "شہر" اس لئے ہوا کہ لوگوں میں اس کے شروع ہونے اور گزر جانے کی شہرت ہوتی ہے پ ۲/۱۱ پ ۶/۵ پ ۷/۸ پ ۳۰/۲۲ پ ۲۲/۲

شَهْرًا پ ۱۰/۱۱ پ ۲۶/۲

شَهْرَيْنِ دو مہینے، شَهْرٌ کا تثنیہ بحالت نصب وجر، پ ۵ پ ۲۸

شَهَوَاتِ مرغوب چیزیں، مزے، شَهْوَةٌ کی جمع پ ۳ پ ۵ پ ۱۱

شُهُوْدٌ اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے حاضرین، موجودین، شاہد، شَاهِدٌ کی جمع ہے جیسے کہ سُجُوْدٌ ساجِدٌ کی، پ ۳

شُهُوْدًا پ ۱۱/۱۲ پ ۲۹/۱۵

شُهُوْرِ مہینے، شَهْرٌ کی جمع ہے، پ ۱۰/۱۱

شَهْوَةٌ شہوت، للچانا، خواہش کرنا، آرزو کرنا، مصدر ہے، اس کا فعل

باب نَصَرَ اور سَمِعَ دونوں سے آتا ہے، مصباح میں ہے کہ شھوۃ کسی شے کی طرف نفس کے اشتیاق کا نام ہے اس کی جمع شَھَوَاتٌ آتی ہے، امام راغب لکھتے ہیں۔

"شہوۃ۔ اصل میں جس چیز کی تمہیں خواہش ہو اس کی طرف جی کے للچانے کو کہتے ہیں دنیا میں اصل کی دو قسمیں ہیں، ایک سچی دوسرے جھوٹی، شہوت صادقہ تو وہ ہے جس کے بغیر بدن مختل ہو جائے جیسے بھوک کے وقت کھانے کی اشتہا ہوتی ہے اور شہوت کاذبہ وہ ہے جس کے بغیر بدن میں اختلال نہ ہو اور کبھی مشتہی (جس چیز کی چاہت ہو) اس کو بھی شہوت سے موسوم کرتے ہیں نیز اس قوت کو بھی جو کسی شے کی اشتہا کرتی ہے شہوت کہا جاتا ہے، آیۂ شریفہ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ (بجاوٹ رکھدی گئی ہے لوگوں کے لئے مزوں کی چاہت میں) دونوں شہوتوں کی محتمل ہے اور ارشاد اتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ (پیچھے ہو لئے مزوں کے) یہ جھوٹی شہوتیں اور ایسی مشتہیات ہیں کہ جن سے استغنا ہونا چاہئے"

شَهِيدٌ: گواہ، شاہد، نگراں، احوال کہنے والا، اقرار کرنے والا، امام راغب نے لکھا ہے کہ "شہید" شاہد کو بھی کہا جاتا ہے اور کسی چیز کے مشاہدہ کرنے والے کو بھی علامہ ابوالسعادات مبارک ابن الاثیر جزری النہایہ فی غریب الحدیث والاثر میں رقمطراز ہیں۔

"حق تعالیٰ کے اسماء میں شہید وہ ذات ہے جس کے علم سے کوئی چیز غائب نہ ہو[1] اور شاہد کے معنی حاضر کے ہیں فعیل فاعل کے معنی میں مبالغہ کے اوزان میں سے ہے، جب مطلق علم کا اعتبار ہو تو اللہ علیم ہے اور امور باطنہ کا خیال کیا جائے تو خبیر ہے اور امور ظاہرہ کی طرف نسبت ہو تو شہید ہے اور کبھی اس معنی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ ہوتا ہے کہ وہ قیامت میں خلق پر گواہ ہوگا۔[2]"

---

[1] ابن سیدہ کہتے ہیں یعنی وہ جاننے والا کہ جو جانے بیان کر دے (تاج العروس) [2] النہایہ باب الشین مع الراء

اور شرع میں "شہید" وہ شخص ہے کہ جو اللہ کی راہ میں قتل کیا گیا ہو، شاہ عبدالقادر[1] صاحب دہلوی موضح القرآن سورۃ نساء میں زیر آیہ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ الآیۃ فرماتے ہیں۔

"نبی وہ لوگ جن کو اللہ کی طرف سے وحی آوے یعنی فرشتہ ظاہر میں پیغام کہہ جاوے اور "صدیق" وہ کہ جو دل میں آوے ان کا جی آپ ہی اس پر گواہی دے اور "شہید" وہ جن کو پیغمبر کے حکم پر ایسا صدق آیا کہ اس پر جان دیے ہیں اور نیکبخت (صالح) وہ جن کی طبیعت نیکی ہی پر بنی ہوئی ہے"

اس معنی میں شہید کا اشتقاق آیا شَهَادَةٌ سے ہے یا مُشَاهَدَةٌ سے یا شُهُوْدٌ سے نیز فَعِيْلٌ بمعنی فَاعِلٌ ہے یا مَفْعُوْلٌ ہے،

اس پر علامہ ابو القاسم عبدالرحمٰن سہیلی نے الروض الانف میں نفیس بحث لکھی ہے جس کا اقتباس ہدیۂ ناظرین ہے، فرماتے ہیں "یہ اسم شَهَادَةٌ سے ماخوذ ہے یا مُشَاهَدَةٌ سے، اگر شَهَادَةٌ سے ہے تو شَهِيْدٌ بمعنی مَشْهُوْدٌ ہے یعنی اس کے حق میں جنت کی شہادت دی گئی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شَهَادَةٌ ہی سے ماخوذ ہو اور فَعِيْلٌ بمعنے فَاعِلٌ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ یعنی تم لوگوں پر گواہی دو گے اور یہ چیز کو ساری امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کے بارے میں عام ہے پر شہداء کے لیے یہ نام اولیٰ ہے کیونکہ وہ صدیقین سے بنا بر کے پیچھے ہی ہیں، اللہ سبحانہ فرماتا ہے فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ سو "شہید" کے معنی میں یہ دو وجہیں توجب ہیں کہ اس کو شَهَادَةٌ سے مشتق قرار دو"

اور اگر مُشَاهَدَةٌ سے ماخوذ ہو تب بھی فَعِيْلٌ بمعنے فَاعِلٌ ہے کہ "شہید" ملکوت الٰہی کا مشاہدہ کرتا اور اللہ کے ان فرشتوں کا معائنہ کرتا ہے جنہیں اور کوئی نہیں دیکھتا اور مُشَاهَدَةٌ سے بمعنی مَفْعُوْلٌ بھی ہو سکتا ہے یعنی بایں معنی کہ فرشتے اس کے قبض اور اس کی روح کے عروج کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

[1] تاج العروس فصل الشین من باب الدال

ان سب وجہوں میں صحت کے اعتبار سے اولیٰ یہی ہے کہ فَعِیْلٌ بمعنے مَفْعُوْلٌ ہو اور معنی یہ ہوں گے کہ اس کے لئے جنت کی شہادت دی گئی ہے یا نبی علیہ السلام کی اس کے لئے شہادت ہوگی چنانچہ آپ کا ارشاد ہے کہ ھولاء الذین اشھد علیھم (یہ وہ لوگ ہیں جن پر میں گواہی دوں گا) پس یہ وجہ حیثیت حدیث کے بھی قوی ہے اور بلحاظ عربیت ایک اور وجہ سے بھی وہ یہ کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے جب شہداء کا ذکر کیا تو فرمایا والمرأۃ تموت بجمع شہید (اور عورت کہ زچگی سے مرے شہید ہے) اور شَہِیْدَۃٌ نہیں فرمایا اور دوسری روایت میں ہے کہ والنفساء شہید یجرھا جنینھا بسررہ الی الجنۃ (نفاس والی عورت شہید ہے اسے اس کا بچہ اپنے نال سے جنت کی طرف کھینچے گا) پر شَہِیْدَۃٌ نہیں فرمایا اور فَعِیْلٌ جب مؤنث کی صفت ہو تو ہا اسی وقت میں نہ ہوگی جبکہ وہ بمعنے مَفْعُوْلٌ ہو، جیسے امرأۃ قتیل اور جریح ہیں اور اگر بمعنی فَاعِلٌ ہو تو مؤنث ہا کے ساتھ آئے گی جیسے امرأۃ علیمۃ اور رحیمۃ وغیرہ ہیں اس سے پتہ چلا کہ شہید بمعنے مشہود (جس کے لئے گواہی دی گئی ہو) اور مشہود علیہ (جس پر گواہی دی گئی ہو) ہے اور یہ لغت سے تو استقراء صحیح اور حدیث سے استنباط بدیع ہے، سو علم میں ہے[1]"

شُہَدَآءُ، جمع، پ ۳/۷، پ ۴/۱، پ ۵/۳، پ ۷/۶ و ۸، پ ۱۱/۱۰، پ ۱۷/۹، پ ۲۲/۱۲، پ ۲۵/۱، پ ۲۶/۱۶ و ۱۷، پ ۲۸/۱، پ ۳۰/۱۰، ۲۵

شَہِیْدًا، پ ۲/۱، پ ۵/۲ و ۳ و ۷ و ۸، پ ۶/۲ و ۳، پ ۷/۶، پ ۱۱/۸، پ ۱۳/۱۲، پ ۱۴/۸، پ ۱۵/۱۱، پ ۱۷/۱۷، پ ۲۰/۱۰، پ ۲۱/۲، پ ۲۲/۴، پ ۲۶/۱ و ۱۲

شَہِیْدَیْنِ دو گواہ، دو شاہد، شَہِیْدٌ کا تثنیہ بحالت نصب و جر، پ ۳/۷

شَہِیْقٌ، دہاڑنا، چلانا، سانس کھینچنا، گدھے کا آواز کرنا، مصدر ہے، اس کا فعل باب ضَرَبَ سَمِعَ اور فَتَحَ تینوں سے استعمال ہوتا ہے۔

شَہِیْقًا پ ۲۹/۱

---

[1] الروض الانف ج ۲ ص ۱۵۱ طبع جمالیہ مصر ۱۳۳۲ھ

فصل الیاء المثناۃ

شَیْءٌ چیز، کچھ، علامہ ابو السعود بن محمد العمادی اپنی مشہور تفسیر، ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم میں رقمطراز ہیں۔

"لفظ شیءٌ اپنے مفہوم لغوی کے اعتبار سے ہر اس چیز کے لئے آتا ہے کہ جس کو معلوم کیا جا سکے اور اس کے متعلق خبر دی جا سکے خواہ کچھ ہی ہو، یہ اصل میں شآء کا مصدر ہے جو ایک مفہوم کے لئے بولا جاتا ہے اور اس مفہوم میں صرف اس پر اکتفا کی گئی ہے کہ اس سے مشیئۃ کے تعلق کا اعتبار ہو، خواہ علم کی حیثیت سے خواہ خبر دینے کی حیثیت سے۔"

علامہ حسن بن محمد نظام نیشاپوری، تفسیر غرائب القرآن ورغائب الفرقان میں لکھتے ہیں۔

"لفظ شیءٌ اعم العام ہے جس طرح کہ اللہ اخص الخاص ہے، یہ جوہر و عرض، قدیم و حادث، بلکہ محال و معدوم تک کے لئے آتا ہے"[1]

پ ۱: ۲ و ۳ و ۱۳ و ۱۴
پ ۲: ۲ و ۳ و ۴ و ۱۳ — پ ۳: ۲ و ۳ و ۴ و ۷ و ۸ و ۹ و ۱۱
پ ۴: ۱ و ۴ و ۷ و ۸ و ۱۰ و ۱۲ — پ ۵: ۲ و ۵ و ۸ و ۱۴ و ۱۵
پ ۶: ۶ و ۷ و ۱۰ و ۱۴ — پ ۷: ۳ و ۶ و ۸ و ۱۰ و ۱۱ و ۱۲ و ۱۴
۱۵ و ۱۸ و ۱۹ — پ ۸: ۱ و ۵ و ۶ و ۷ — پ ۹: ۱ و ۷ و ۹ و ۱۳
پ ۱۰: ۱ و ۴ و ۶ و ۱۲ — پ ۱۱: ۳ و ۱۷ — پ ۱۲: ۲ و ۵ و ۷ و ۹ و ۱۵
پ ۱۳: ۲ و ۶ و ۸ و ۱۵ و ۱۸ — پ ۱۴: ۲ و ۱۱ و ۱۲ و ۱۶ و
۱۷ و ۱۸ — پ ۱۵: ۲ و ۵ و ۱۶ و ۱۸ و ۲۰ و ۲۱
پ ۱۶: ۱ و ۲ و ۱۱ و ۱۴ — پ ۱۷: ۳ و ۶ و ۸ و ۹ — پ ۱۸: ۵ و ۱۱ و ۱۲ و
۱۵ و ۱۶ — پ ۱۹: ۶ و ۱۷ — پ ۲۰: ۳ و ۹ و ۱۲ و ۱۳ و ۱۴ و ۱۶
پ ۲۱: ۲ و ۷ و ۸ و ۱۴ و ۱۹ — ۲ و ۳ و ۴ و ۸ و ۱۱ و
پ ۲۲: ۱۲ و ۱۳ و ۱۵ و ۱۷ و ۱۸ و ۱۹ — پ ۲۳: ۴ و ۱۰
پ ۲۴: ۳ و ۶ و ۷ و ۱۲ و ۱۷ و ۱۹ — پ ۲۵: ۱ و ۲ و ۳ و ۵
پ ۲۶: ۳ و ۴ و ۱۱ و ۱۴ و ۱۵ — پ ۲۷: ۱ و ۲ و ۳ و ۴ و ۸ و
۱۰ و ۱۷ و ۲۰ — پ ۲۸: ۱ و ۲ و ۳ و ۴ و ۷ و ۸ و
۱۵ و ۱۶ و ۱۷ و ۱۸ و ۲۰ — پ ۲۹: ۱ و ۲ و ۱۲ — پ ۳۰: ۱ و ۵ و ۱۰

شَیْئًا پ ۱: ۶ و ۱۵ — پ ۲: ۵ و ۱۰ و ۱۳ — پ ۳: ۷ و ۱۰ و ۱۵
پ ۴: ۶ و ۹ و ۱۴ — پ ۵: ۲ — پ ۶: ۷ و ۱۰ — پ ۷: ۴ و ۱۱ — پ ۸: ۶
پ ۹: ۱۴ و ۱۶ — پ ۱۰: ۷ و ۱۰ و ۱۲ — پ ۱۱: ۹ و ۱۰ — پ ۱۲: ۵ — ۸ و ۱۵ و
پ ۱۴: ۱۰ و ۱۷ — پ ۱۵: ۸ و ۱۷ و ۲۲ — پ ۱۶: ۴ و ۵ و ۶ و ۷ و

[1] ص ۱۲۹ ج ۱ برحاشیہ تفسیر ابن جریر

پ: ۸ و ۹، پ ۱۷: ۴ و ۸ و ۱۱ و ۱۷، پ ۱۸: ۱۱ و ۱۳ و ۱۶، پ ۲۱: ۱۳

پ ۲۲: ۴، پ ۲۳: ۱ و ۳ و ۴، پ ۲۴: ۲ و ۱۳ و ۱۵، پ ۲۵: ۱۷ و ۱۸

پ ۲۶: ۱ و ۸ و ۱۰ و ۱۴، پ ۲۷: ۴ و ۶، پ ۲۸: ۲ و ۳ و ۸ و ۲۰

پ ۲۹: ۱۹، پ ۳۰: ۷

شَیَاطِین، شیطان، شَیطانٌ کی جمع مکسر ہے (ملاحظہ ہو شَیطَانٌ) پ ۱: ۱۲، پ ۲ ... پ ۸: ۱ و ۱۰، پ ۱۵: ۳، پ ۱۶: ۸ و ۹، پ ۱۷: ۶، پ ۱۸: ۶، پ ۱۹: ۱۵

پ ۲۳: ۲ و ۱۲ و ۱۱، پ ۲۹

شَیَاطِیۡنِهِمۡ ان کے شیطان، شَیَاطِین مضاف، هُمۡ ضمیر جمع مذکر غائب مضاف الیہ، پ ۱: ۲

شَیۡبًا، بڑھاپا، سر کے سپید ہونے کو "شیب" کہتے ہیں، شَابَ یَشِیۡبُ کا مصدر ہے، پ ۱۶: ۴

شِیۡبًا بوڑھے، اَشۡیَبُ کی جمع، جیسے بِیۡضٌ اَبۡیَضُ کی جمع ہے، پ ۲۹: ۱۳

شَیۡبَةً، بڑھاپا، بالوں کا سپید ہونا یہ بھی شَابَ یَشِیۡبُ کا مصدر ہے، پ ۲۱: ۹

شِئۡتَ، تو نے چاہا، مَشِیۡئَةٌ سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر حاضر (ملاحظہ ہو شَاءَ) پ ۹: ۹

پ ۱۶: ۱ و ۱۵، پ ۱۸

شِئۡتُمۡ تم نے چاہا، مَشِیۡئَةٌ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر حاضر، پ ۱: ۴، پ ۲: ۱۲، پ ۹: ۱۰، پ ۲۳: ۱۶

پ ۲۴: ۱۹

شِئۡتُمَا، تم دونوں نے چاہا، مَشِیۡئَةٌ سے ماضی کا صیغہ تثنیہ مذکر حاضر پ ۱: ۴، پ ۸: ۹

شَیۡخٌ بوڑھا، ابن سیدہ نے المحکم میں اور قزاز نے جامع میں لکھا ہے کہ پچاس سے لے کر اسی برس کے بوڑھے کو "شیخ" کہتے ہیں[1]، شیوخ اور اَشۡیَاخ جمع ہے، آیۂ شریفہ وَ اَبُوۡنَا شَیۡخٌ کَبِیۡرٌ (اور ہمارا باپ بوڑھا ہے بڑی عمر کا) میں "شیخ کبیر" سے کون مراد ہیں، اس کے متعلق حافظ عماد الدین بن کثیر لکھتے ہیں کہ

"اس بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے کہ یہ "شیخ" کون ہیں چنانچہ بیان کیا گیا ہے حضرت شعیب علیہ السلام ہیں اکثر کے نزدیک یہی مشہور ہے اور حضرت حسن بصری اور امام مالک بن انس نے اسی کی تصریح کی ہے اور ایک حدیث میں بھی یہ

---

[1] تاج العروس فصل الشین من باب الخاء [2] البدایۃ والنہایہ جلد ۱ ص ۲۴۴ طبع مصر ۱۳۴۸ھ

مصرح آیا ہے لیکن اس کی اسناد میں نظر ہے[1]

اس سلسلہ میں حضرت سعد بن سلمہ عنزی رضی اللہ عنہ کی روایت کا ذکر حضرت شعیب علیہ السلام کے تذکرہ میں گزر چکا ہے اور ابن ماجہ، بزار، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت عتبہ بن الندر سلمی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ایک طویل روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آٹھ یا دس برس تک تو اپنے کو اجرت پر رکھا پھر جب مدت پوری کرچکے اور حضرت شعیب سے جدا ہونے کا ارادہ کیا تو اپنی اہلیہ کو حکم دیا کہ اپنے والد بزرگوار سے کچھ بکریاں مانگ لیں کہ جن سے گزران کریں[2]، اس روایت میں بھی حضرت شعیب علیہ السلام کے نام کی تصریح کی ہے، لیکن حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس حدیث کا دار و مدار عبداللہ بن لہیعہ مصری پر ہے اور اس کے حافظہ میں خرابی ہے مجھے یہ ڈر ہے کہ اس کا مرفوع ہونا غلط ہے[3] پ۲۰ شیخًا پ۱۲ پ۱۳

شیاطین

شیطان، سرکش، شریر،

امام محمد بن جریر طبری فرماتے ہیں

"عربی زبان میں ہر سرکش شیطان ہے جن میں سے ہو انسانوں میں سے ہو جانوروں میں سے ہو غرض ہر شے سے ہو اور اسی طرح ارشاد ہے پروردگار جل شانہ کا وَکَذٰلِكَ جَعَلۡنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيۡنَ الۡاِنۡسِ وَالۡجِنِّ (اور اسی طرح کر دیا ہم نے ہر نبی کے لئے دشمن شریر آدمیوں کو اور جنوں کو) کہ انسانوں میں سے بھی اسی طرح شیاطین قرار دیئے ہیں جس طرح کہ جنوں میں سے قرار دیئے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب آپ ایک ترکی گھوڑے پر سوار ہوئے وہ لگا اٹکھیلیاں کرنے آپ نے اسے مارنا شروع کیا پر اس

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۲۴۴ طبع مصر ۱۳۴۸ھ ۔ [2] الدر المنثور ج ۵ ص ۱۲۶ طبع مصر
[3] تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۳۸۶ طبع مصر

کی اٹکھیلیاں اور بڑھتی ہی گئیں تب آپ
اس پر سے اتر آئے اور فرمانے لگے کہ تم
نے تو مجھے شیطان ہی پر سوار کر دیا، میں
اس پر سے اس وقت تک نہیں اترا جب
تک میں نے اپنے آپ میں تبدیلی محسوس
نہ کی"[1]

سیبویہ نے جو لغت و عربیت کے
امام ہیں، الکتاب میں کبھی اس کے نون
کو زائد لکھا ہے اور کبھی اصلی[2]، اور اس کی
وجہ یہ ہے کہ اس کے اشتقاق میں اختلاف
ہے۔ بصریوں کے نزدیک اس کا وزن
فَیْعَالٌ ہے لہذا اس کا نون اصلی ہے اور
شَطَنَ سے مشتق ہے جس کے معنی دور
ہونے کے ہیں اور اسم فاعل شَاطِنٌ
ہے اور کوفیوں کے نزدیک اس کا وزن
فَعْلَانٌ ہے اور نون زائد ہے اور شَاطَ
یَشِیْطُ سے مشتق ہے جس کے معنی ہلاک
ہونے کے آتے ہیں اس کی مونث شَیْطَانَۃٌ
ہے اور شَیْطَانٌ کی جمع شَیَاطِیْنُ ہے جس
طرح کہ غُرثانٌ کی جمع غَرَاثِیْنُ فراء نے یہی مثال
بیان کی ہے، علامہ ابو حیان نے کہا ہے
کہ غُرثانٌ کی طرح سے یہ اسی صورت میں
ہوگا جب کہ اس کا نون زائد ہو[3] امام
ابو جعفر طبری فرماتے ہیں کہ

"ہر شے کو جو سرکش ہو شیطان سے اس
لئے موسوم کیا گیا کہ اس کے اخلاق اور
افعال اپنے تمام ہمجنسوں کے اخلاق اور
افعال سے جدا ہوتے ہیں اور وہ خیر سے
بعید ہوتا ہے، اس معنی کے اعتبار سے
شَیْطَانٌ، شَطَنَ سے بر وزن فَیْعَالٌ ہے"[4]

اور جن لوگوں کے نزدیک کہ شیطان
بر وزن فعلان ہے اور اس کا اشتقاق
شَاطَ سے ہے ان میں اختلاف ہے کہ اس
کی وجہ تسمیہ کیا ہے چونکہ شَیْطٌ کا استعمال
جلنے، ہلاک ہونے، جانے، باطل ہونے
غرض کئی معنی میں ہوتا ہے اور سرکش و متمرد
میں یہ ساری صفتیں یکجائی موجود ہیں"
دنیا میں غصہ اور حسد سے بیٹا مرتا ہے،

---

[1] تفسیر ابن جریر ج۱ ص ۳۶ و ۳۷ طبع مصر [2] تاج العروس فصل الشین من باب الطاء [3] پوری بحث کے لئے ملاحظہ ہو البحر المحیط ج۱ ص ۶۲ طبع مصر [4] تفسیر ابن جریر ج۱ ص ۳۷

اور آخرت میں دوزخ میں جلے گا اور ہلاک ہوگا خود غلط راہ پر جاتا اور اوروں کو لیجاتا ہے، باطل پر ہے یعنی غلط کار ہوتا ہے، اس لئے کسی نے کسی معنی کے اعتبار سے اس کی وجہ تسمیہ بیان کی ہے، اور کسی نے کسی معنی کے لحاظ سے، بہر حال اتنا یاد رہے کہ جلنے کے معنی تو حقیقی ہیں اور اور معنی مجازی ہیں[1]

عرف میں "شیطان" سے مراد ابلیس علیہ اللعنۃ ہے اور جب الشیطان الف لام کے ساتھ کہا جائے گا یہی مراد ہوگا جس طرح کہ ابلیس اس کا نام اس لئے ہوا کہ اِبْلَاسٌ کے معنی نا امید ہونے کے ہیں اور وہ رحمت حق سے نا امید ہے، اسی طرح شَطَنٌ کے معنی دور ہونے کے ہیں اور شَیْطَان نیکی سے دور ہے[2]، اور شَاطَ یَشِیطُ کا استعمال غصہ میں جلنے بھننے کے لئے ہوتا ہے اور شیطان آگ سے پیدا ہوا ہے چنانچہ آیۂ شریفہ خَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَارِجٍ مِنْ نَارٍ (اور بنایا جن کو آگ کی لپیٹ سے) اس پر دلالت کرتی ہے اور اسی بناء پر وہ فرطِ قوت غضبیہ اور حمیت مذمومہ سے مخصوص ہوا اور حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے باز رہا[3] (ملاحظہ ہو اِبْلِیس) پ۱/۴ پ۲/۵ و ۹ پ۳/۵ و ۶ و ۱۲ پ۴/۷ و ۹ پ۵/۳ و ۶ و ۷ و ۸ و ۱۵ پ۷/۱۲ و ۱۱ و ۱۴ پ۸/۴ و ۹ و ۱۰ پ۹/۱۲ و ۱۴ و ۱۶ پ۱۰/۲ پ۱۲/۱۱ و ۱۵ پ۱۳/۱۵ و ۱۶ پ۱۴/۲ و ۱۴ و ۱۹ پ۱۵/۳ و ۶ و ۷ و ۱۲ پ۱۶/۹ پ۱۷/۸ و ۱۴ پ۱۸/۹ پ۱۹/۱ و ۱۷ پ۲۰/۱۵ و ۱۶ پ۲۱/۱۲ پ۲۲/۱۳ پ۲۳/۳ و ۵ و ۱۲ پ۲۴/۱۹ پ۲۵/۱۲ پ۲۶/۷ پ۲۸/۲ و ۳ و ۵ پ۳۰/۶

شَیْطَانًا پ۵/۱۵ پ۲۵/۱۰

شِیَعٌ فرقے، گروہ، شِیْعَۃٌ کی جمع پ۱۴/۱

شِیَعًا پ۸/۱۴ پ۲۰/۴ پ۲۱/۷

شِیْعَتِہٖ اس کے رفیق، اس کا گروہ، شِیْعَۃِ مضاف، ہٖ ضمیر واحد مذکر غائب مضاف الیہ پ۲۰/۵ پ۲۳/۷

شِیْعَۃٍ، فرقہ، گروہ، اصل میں شِیَاعٌ کے معنی انتشار اور تقویت کے ہیں، جن سے انسان کو تقویت ہو اور جو اس سے نکلے

---

[1] ملاحظہ ہو تاج العروس فصل الشین من باب الطاء [2] ابن خالویہ نحوی نے یہی وجہ لکھی ہے ملاحظہ ہو اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن العظیم ص ۲۷ [3] راغب کا یہی بیان ہے

اور پھیلے ہوں وہ اس انسان کے "شیعہ"
یعنی اس کا فرقہ اور پارٹی ہیں، شیعہ کا
اطلاق واحد تثنیہ جمع، مذکر مؤنث سب پر ہوتا
ہے شِیَعٌ اور اَشْیَاعٌ جمع، پ ۱۶/۸

شِئْنَا ہم نے چاہا، مَشِیْئَةٌ سے ماضی
کا جمع متکلم (ملاحظہ ہو شَاءَ) پ ۹/۱۲ پ ۱۵/۱۰
پ ۱۹/۳ پ ۲۱/۱۵ پ ۲۹/۲۲

شُیُوخًا بوڑھے، شَیْخٌ کی جمع (ملاحظہ
ہو شَیْخٌ) پ ۲۴/۱۲

شِیَةَ، داغ، جانور جس رنگ کا ہو اس
کے علاوہ دوسرے رنگ کا دھبہ، شِیَةٌ
اصل میں وَشِیَةٌ تھا وشی یَشِیُ کا مصدر
ہے، عِدَةٌ اور زِنَةٌ کی طرح اس کی ہا
واو محذوف کے عوض میں ہے، شِیَاتٌ
جمع ہے، پ ۱/۸

تمام شد مجلد ثالث

از

لغات القرآن

۱۰ ربیع الثانی سنہ ۱۳۶۶ھ